ISSN: 2277-9833

Urdu Sheeraza

Volume: 62
Number: 7 - 8 (July - August 2024)

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

Number: 7 - 8 (July - August 2024)
Volume: 62

جموں وکشمیر میں معاصر انشائیہ:
حصہ دوئم

تاریخ وتمدن

بیادِ رفتگاں

سفرنامہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق:......امتیاز احمد شرقی، محمد انور لولابی
پبلیکیشن آفیسر: ڈاکٹر شاذیہ بشیر ، معاونین: شبیر احمد میر، طاہر سلطان
سالِ اشاعت: جلد؛62، شمارہ:8-7 (جولائی / اگست 2024)
ISSN نمبر:2277-9833
قیمت: 100 روپئے

’’شیرازہ‘‘ میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے
اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔   (ادارہ)

●...... خط و کتابت کا پتہ:
مدیر ’’شیرازہ‘‘ اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

گفتگو بند نہ!

20 جولائی 2024 کو صبح سویرے یہ جانکاہ خبر سوشل میڈیا میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ کلچرل اکادمی کے سیکریٹری شری بھرت سنگھ منہاس انتقال کر گئے۔ان کی ناگہانی موت سے علمی و ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور سوشل میڈیا میں علمی و ادبی شخصیات کی طرف سے تعزیتی پیغامات موصول ہونے شروع ہو گئے۔آنجہانی بھرت جی قریباً اڑھائی سال اکادمی کے سکریٹری رہے۔جہاں بھرت جی اکادمی کی دیگر سرگرمیوں میں پیش پیش رہے وہیں انہوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے کئی اقدامات کئے۔انہیں اردو کے فروغ کے سلسلے میں جو بھی پروپوزل پیش کئے جاتے، وہ بڑی فراخ دلی سے اپیرول دیتے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کرتے کہ نئی نسل کے لکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے۔

2023 میں ''شعبہ اردو'' نے بھرت جی کی قیادت میں جموں وکشمیر کے دور دراز علاقہ جات میں کئی ادبی و علمی سیمینار منعقد کئے جن میں اردو افسانے کی شعریات، اردو شاعری کی شعریات: بنیادی مباحث، جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل، اردو افسانہ :نئی صدی ،نئے موضوعات ،اردو ادب اور تانیثیت، خطۂ پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال، اردو میں سیرت نگاری، اردو شاعری کی مبادیات، تخلیقی ادب کے بنیادی سروکار، اردو میں قرآنی تراجم و تفاسیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ساتھ ہی ''جنوبی ،شمالی اور وسطی کشمیر'' کے عنوان سے مشاعروں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا، جس میں کہنہ مشق شعرا کے ساتھ ساتھ نوعمر شعرا کو خوب نمائندگی

دی گئی ۔ 35 سال سے کم عمر شعرا کا ایک عظیم الشان مشاعرہ اکادمی کے سیمینار ہال میں منعقد کیا گیا جسے قومی سطح کی میڈیا چینلوں نے براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا۔ ایوان صدارت میں تشریف فرما شخصیات رفیق رازؔ اور رخسانہ جبینؔ نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ ہے، جس میں نئی نسل کے تازہ دم شعرا کو ایک ساتھ سننے کا موقع ملا اور یہ احساس جاگا کہ جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے''۔ اس طرح کی ادبی سرگرمیاں منعقد کرنا محال تھا اگر آنجہانی بھرت سنگھ منہاس اردو زبان وادب کے تئیں اپنی محبت کا اظہار نہ کرتے۔

جموں وکشمیر میں غیرافسانوں ادب کی ترویج کے سلسلے میں ''جموں وکشمیر میں معاصر انشائیہ: حصہ دوم'' ترتیب دیتے وقت ہمیں اطمینان ہو رہا ہے کہ پہلی بار ''شیرازہ اردو'' میں باقاعدہ معاصر انشائیہ نگاروں کا ایک گلدستہ دو حصوں میں پیش کیا جارہا ہے، جس سے یہ مفروضہ دم توڑ دے گا کہ ہمارے یہاں انشائیہ نگار پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ''تاریخ وتمدن'' کا دلچسپ کالم حسبِ روایت جموں وکشمیر کی قدیم تاریخ کی گرہ کشائی کے سلسلے میں ایک اہم قدم ہے۔

20 اگست 2024 کو یہ اطلاع ملی کہ اردو زبان وادب کی برگزیدہ شخصیت جناب عبد الغنی شیخ لداخی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے ۔ مرحوم شیخ صاحب کو ''انسائیکلوپیڈیا آف لداخ'' کہا جاتا تھا۔ مرحوم کی ہمہ جہت شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لیہہ لداخ میں پیدا ہونے والے شیخ صاحب نے افسانے اور ناول لکھے، تحقیق کی سنگلاخ راہ کا مسافر بن کر ان گنت جہاں آباد کئے، عالمی ادب کی تفہیم میں معرکتہ الآرا تراجم کئے ،مطالعہ ومشاہدہ میں وسعت دینے کے لئے کئی مما لک کے اسفار کئے ،قرآن اور سائنس کی حکمتوں کو سمجھنے کے لئے باضابطہ ایک کتاب منصۂ شہود پر لائی۔ ''قلم، قلم کار اور کتاب'' کے موضوع کو سمیٹتے ہوئے ہزاروں

کتابوں کی ورق گردانی کی۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ عبدالغنی شیخ ''فنافی الکتاب'' تھے۔
2018ء میں کلچرل اکادمی نے شیرازہ اردو کا ایک ضخیم خصوصی نمبر ''عبدالغنی شیخ نمبر''
شائع کیا جس میں شیخ صاحب کی علمی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے
ہوئے مقتدر مقالہ نگاروں نے ایک بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ ''شیخ صاحب لداخ
میں اردو زبان وادب کے پہلے اور آخری سفیر ہیں''۔

زیرِ نظر شمارہ ہم آنجہانی بھرت سنگھ منہاس اور مرحوم عبدالغنی شیخ لداخی کی نذر
کرتے ہیں۔

محمد سلیم سالک
مدیر ''شیرازہ اردو''

☆......پروفیسر فاروق فیاض
مترجم......راجہ یوسف

لوک ادب اور تاریخ: افتراق واشتراک

تہذیب، تاریخ اور ثقافت کو کھنگالنا انسان کی فطرت ہے۔ انسان اپنے اردگرد میں ہورہی ارتقائی تبدیلیوں کومحسوس کر کے ان کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کا خواہاں رہتا ہے اور وہ سب اپنے انداز میں بیان کرنے کا متمنی بھی ہوتا ہے۔ انسانی عقل وفہم کا یہ عمل پہلے پہل اشاروں اور کنائیوں میں ہوتا رہا یا فن نقش ونگاری اور مورت گری کی صورت میں اور کبھی سیدھے سادھے الفاظ میں بیان ہوکر عمل پذیر ہوتا رہا۔ بس انسان کے اس ارتقائی سفر میں جوعمل انسانی سوچ پر حاوی اور جاری رہا وہ انکشافات، دریافت اور مشاہدات کا رہا۔ سچ کی تلاش اور حقیقت کی کھوج کو سامنے لانے میں جو جہد مسلسل ایک انسان کو کرنا پڑی، جس کے لئے اس نے زندگی کے سارے اتار چڑاؤ سر کر لئے، یہی وہ زندگی کے نشیب وفراز تھے جو مسلسل انسانی ارتقا پر گزرتے رہے اور وہ حقیقی سچائی سامنے آئی جو چاہے تحریری ہو یا تحقیقی اسی کا نام تاریخ ہے۔ گزرے زمانوں کے تعلق سے جو انسان اور اس کے اردگرد ارتقائی ردوبدل سے جو حقیقی سچ ابھر کر سامنے آیا ہے اسی کو تاریخ کا بنیادی عرفان تصور کیا جاتا ہے۔ مشہور تاریخ دان ٹرولیان اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"All history is matter of opinion based on facts
of opinion guided and limited by facts that have
been scientifically discovered. "

حقیقت کے اظہار کے لئے اور سچ کے قریب جانے کی خاطر مؤرخ مختلف طریقے اور حربے بروئے کار لاتا ہے، جن کو ہم دلیل، شہادت یا ماخذ کہتے ہیں۔ یہ دستیاب ذرائع ہوتے ہیں جو ایک تاریخ دان کو منزل مقصود تک پہنچانے میں معاون بن سکتے ہیں۔ یہ ماخذات دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ بنیادی اور ثانوی (Primary and Secondary Source)۔

جہاں تک بنیادی وسائل اور ذرائع کا تعلق ہے یہ ان لوگوں کا تحریر کردہ ہونا چاہئے جو اس زمانے کے چشم دید گواہ ہوں یا وہ اس زمانے کے حالات و واقعات کے بہت زیادہ قریب رہے ہوں۔ ثانوی ماخذات ان تاریخی شواہد کو کہا جاتا ہے جو ان لوگوں نے مرتب یا تحریر کئے ہوں جنہوں نے یہ واقعات دوسرے لوگوں سے سنے ہوں یا موجودہ شواہد کو پڑھ کر یا جان کر از سر نو تحقیق کے بعد مرتب کئے ہوں۔ لیکن جہاں تک تاریخ کے مطالعے کا سوال ہے بنیادی ماخذ اور ذرائع کو ہی زیادہ معتبر مانا جاتا ہے۔ جبکہ ایک تاریخ دان کو اس وقت بہت زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے جب اس کے پاس موجود بنیادی ذرائع کے بدلے ثانوی آثار سے استفادہ کرنا پڑ رہا ہو۔

جدید تاریخ نویسی میں جہاں موضوعاتی بارڈر (Border) میں انقلابی نوعیت کی تبدیلی آئی ہے وہیں تاریخی مشاہدات کا دائرہ کافی وسیع ہوا ہے۔ اب یہ بات مسلمہ طور پر قبول کی جاتی ہے کہ تاریخ کے مطالعے کا مرکز فقط شاہنشاہی یا اقتدار میں رہ رہے لوگ اور ان کی افسر شاہی نظام تک ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ میں سماج اور اس سماج میں رہنے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ واقعات اور حالات سے زیادہ دلیل اور دلائل پر مبنی تشریحات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ سیاسی معاملات سے زیادہ سماجی نظام کے مطالعے دیکھے اور پرکھے جاتے ہیں۔ بیانیہ سے تجربات کا اثر زیادہ ہے۔ کسی بھی ملک یا قوم کی تاریخ جاننے اور سمجھنے کے لئے تاریخی مطالعے کے ساتھ ساتھ اس قوم یا

ملک کے لسانی اور ادبی سرمائے کی ورق گردانی بھی ضروری ہے۔ اس بات کی تائید میں ایک مشہور تاریخ دان لکھتے ہیں:

> History ceased to be the story of the elites and become the mass of men hitherto deemed by the professional historians to be without history... Inevbitably, the historian's focus was shifted from the individual to the collective; from political to social history, from description to analysis; from monocausal to multidimentional explorations. Bloch and Febvre opened the doors to all that had previously been perceived either to be without history or to be unhistorical, extending thereby the historian's legitimate sources well beyond the conventional document to the widest range of written and unwrittenevidence.

قریب ترین دور کی بات ہے جب روایتی تاریخ دان تاریخ کے مطالعے میں لوک ادب چاہے وہ زبانی ہم تک پہنچا ہو یا تحریری طور اسے معتبر اور مستند نہیں مانتے تھے بلکہ اس پر شک کرتے تھے، ان کا ماننا تھا کہ ہر کوئی تاریخی واقعہ یا عمل ایک مخصوص زمان و مکان کے تناظر میں جنم لیتا ہے اور کسی بھی حقیقی واقعے کا تاریخی زمانہ تب تک متعین نہیں کیا جا سکتا جب تک نہ اس مخصوص زمانے کی مختلف روایات، تحریک اور موجود روایتوں کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ لوک ادب عملِ مسلسل ہے

جس کی Periodicity کو معین کرنا مشکل کام ہے۔ چونکہ یہ عمل بہت حد تک زمان و مکان کے قید و بند سے آزاد ہے اس لئے لوک ادب تاریخ لکھنے میں بہت زیادہ معاون اور مددگار نہیں ہوسکتا۔ اب جب کہ ہم موجودہ تاریخ نویسی کے آئینے میں تاریخی ادب کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ نئے تاریخی تصور میں واقعات سے زیادہ انسانی اور سماجی تنظیموں کی قدر و منزلت اور اہمیت ہے اور اس کے مطالعے پر زور بھی دیا جاتا ہے۔ انسانی اقدار پلک جھپکنے میں زائل ہو جاتے ہیں جبکہ سماجی تنظیمیں اور فکری تحریکوں کو پھلنے پھولنے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ سماجی اور فکری تحریک کو عوامی سطح پر تشکیل اور نشو نما پانے میں زمانے لگ جاتے ہیں، اس لئے اس طرح کی انسانی تنظیم سازی کو جاننے کے لئے زمان و مکان کے سخت اصول بھی رکاوٹ نہیں بن پاتے ہیں۔

البتہ سچ تو یہ ہے کہ یہ Longue duree تجاریکی سوچ کو چلانے میں جو کردار فلسفیانہ انداز، مذہبی عقیدہ، موسمیاتی رد و بدل، جغرافیائی حد بندیاں، تہذیبی لین دین، سماج کی حقیقی عکاسی اور اقتصادی سرگرمیوں کا جو عمل دخل ہوتا ہے وہ اثرات ہم خالص تاریخی کتابوں کا مطالعہ کر کے اور آثار قدیمہ کا مشاہدہ کر کے نہیں سمجھ سکتے ہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو چیزیں ہمیں وراثت میں ملی ہیں ان خزانوں کو دیکھا جائے۔ یوں تو ملی ہوئی ساری وراثتوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ایک تاریخ نویس کے لئے سب سے زیادہ مددگار جو چیز ہوسکتی ہے وہ لوک ادب کہلاتا ہے۔ عوام کے پاس موجود یہ لوک ادب عقل و ادراک کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس خزانے میں کہنے سننے کے لئے بہت سارا مواد ہوتا ہے۔ لوک ادب کی تہہ میں فہم و فراصت اور ذہانت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہتا ہے اور یہی لوک ادب ہے جو غیر شعوری طور کسی ملک، کسی قوم کا اجتماعی تاریخی سرمایہ ہوتا ہے۔

''ابتدائی دور ہی سے انسان نے اپنے آپ پر گزرے ہر اچھے اور برے واقعے کو یاد رکھا ہے بلکہ کہیں زبانی تو کہیں تحریریں، اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر کے رکھ دیا ہے۔ زندگی کے متواتر سفر میں مسلسل سماجی اور تہذیبی عمل کو زندہ رکھا۔ اس نے زندگی میں پیش آنے والے سب چھوٹے بڑے حادثات، طویل سے طویل اور مختصر ترین حالات، قصے کہانیاں، تاریخی واقعات، مذہبی اعتقادات اور توہمات، جیت اور ہار کے قصے یعنی اس کی زندگی میں جو بھی ہلچل رہی ہے، اسے نظم یا نثر میں ڈھال کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔''

چونکہ تاریخی ادب کا بنیادی موضوع اور مرکز انسان ہے۔ یہ ایک انسان ہی ہے جو اپنے احساسات وجذبات اور تجربات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا عقیدہ، اپنی فکر اور توہمات کو بتانے یا سمجھانے کے لئے آسان پیرائے میں اپنا سارا درد کسی لگی لپٹی کے بغیر لوک کہانیوں اور لوک سنگیت میں بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ ایک انسان کے درد اور اس کی خوشی وغم کو دوسرا انسان ہی بہتر انداز میں بیان کر سکتا ہے اور وہ ہی اس کی کامیابیوں اور کوتاہیوں کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے۔ ایک انسان کے اندرونی اور خارجی سیاسی وسماجی تعلقات کے متعلق اس کا اپنا تحریر کردہ تخلیقی مواد صحیح رہبری کر سکتا ہے۔

1945 کے بعد جو تاریخ نویسی کا جو رجحان زور پکڑنے لگا ہے اس میں روایتی تاریخ نویسی کے بہت اصول رد کر دئے گئے ہیں، جن میں فرد، واقعات، سیاسی حادثات اور انقلابی مطالعہ پر زور دیا جاتا تھا۔ جبکہ جدید تاریخ نویسی نے افسر شاہی، سیاسی اثر ورسوخ رکھنے والے لوگ، سیاسی حالات و واقعات سے زیادہ قومی یا عوامی مسائل پر توجہ مبذول کرائی جن میں اجتماعی رہن سہن، انسانی ادارے جس میں زبان، ادب، مذہب، سماجیات، اقتصادیات، ذہنی رویے، قومی ذہانت اور شعور، تکنیکی صلاحیت،

ثقافتی نہج اورفکری رجحان کے ساتھ ساتھ سماجی بنیاد اورانسانی تنظیموں کا پھیلاؤ، یہ وہ اہم شعبے ہیں جن کو سمجھنے اور جن پر بات کرنے کی ضرورت کو سمجھا گیا ہے۔

حالیہ صدی میں جو تاریخی موضوعات میں پھیلاؤ اور مشاہدات میں وسعت پائی گئی ہے اس سے بھی تاریخ نویسی کے کینواس میں انقلابی تبدیلی آ گئی ہے۔

قدیم تاریخ نویس جن خاص شواہد کو مدنظر رکھ کر لکھتے تھے ان میں تحریری مسودے، فلسفیانہ تشریحات، تاریخی کھنڈرات، سرکاری سکے زیادہ اہم تھے اور انہی پر انحصار بھی کرتے تھے۔ لیکن اب جو تاریخی ادب لکھا جاتا ہے اس میں اوپر لکھے گئے شواہد کے ساتھ ساتھ زبان وادب، لوک کہانیاں، اساطیر، نفسیاتی اور سماجی تعلیمات کا مطالعہ اہم مانا جاتا ہے۔ ایک مشہور تاریخی نقاد Colin Lees اس کی وضاحت میں بیان کرتے ہیں:

> That the past must be conceived of in terms of structures and systems... structure in this context does not simply mean social structure, but more importantly the enduring physical, material and eventually mental structures within whose boundaries human individual and collective behaviour is confined. History must be understood as the composite result of a bundle of systems or structures, each of which has its own internal coherence that the historian must seek out and demonstrate.

ایک تاریخ داں پر یہ الزام لگتا ہے کہ اس کی تحریر کردہ کتاب میں اس کی پسند

اور ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ حالانکہ دیکھا گیا ہے کہ تاریخ دان کا عمل دخل رہتا ہے، جو کہیں پر عملاً ہوتا ہے اور کہیں پر غیر ارادتاً شامل رہتا ہے۔ کہیں نہ کہیں پر تاریخ داں کا نسلی، مذہبی اور لسانی آہنگ کا اظہار ضرور ملتا ہے جو تاریخ لکھنے میں سم قاتل کا کام کرتے ہیں، جس سے تاریخ بے داغ نہیں رہتی بلکہ داغدار ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس لوک ادب ان چیزوں سے مستثنیٰ ہے۔ چونکہ لوک ادب اجتماعی کوششوں کی پیداوار ہوتا ہے جس میں کسی خاص شخصیت کا لیبل نہیں لگا ہوتا بلکہ یہ عوام سے منسوب ہوتا ہے۔ اس لئے لوک ادب کو شواہد کے طور استعمال کر کے سیاسی، سماجی یا مذہبی لیبل لگنے کا کوئی امکان بھی نہیں رہتا۔

ایک مخصوص کلچرل قبیلے میں جو الگ الگ مزاج پائے جاتے ہیں، جیسے زبان، مذہب، ذات پات، یہ سب ایک کلچر میں ایک ساتھ پنپ سکتے ہیں، لیکن عموماً لوک ادب میں کہیں کہیں سوسائٹی میں افراتفری اور نفرت کے واقعات کی بھی عکاسی ملتی ہے۔

لوک ادب کی جو بڑی بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ زمانے اور وقت کے اندر اور باہر کے تمام مخفی باتوں کو عیاں کرتا ہے جس سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہم لوک ادب کی کوئی صنف کو ٹٹول کر دیکھتے ہیں، اس کی پشت پر قوموں کی تشکیل شدہ صدیاں ہوتی ہیں جس میں عوام اور خواص کے تجربات شامل ہوتے ہیں۔ ہم کوئی لوک گیت یا کہاوت، کوئی ناٹک یا کوئی قصہ دیکھ لیتے ہیں یا سن لیتے ہیں یہ کسی خاص فرد سے منسوب نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ کسی تجربہ کار فرد کا کوئی خاص کارنامہ ہوتے ہیں جبکہ یہ ایک مکمل اور بھرپور سماج کی عکاس ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی سچ اس طرح سے سامنے لایا جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں شاید کوئی ابہام پیدا کرنے کے لئے اس کا اظہار کیا جا رہا ہے جبکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعے سے ہمیں ایک بڑے قوم کی لسانی وسعت اور مذہبی شعور کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی عندیہ ملتا ہے کہ سابقہ

قوموں میں ذہنی اپج کا عروج کتنا اعلیٰ رہا ہے۔کبھی کسی پہیلی کے پس منظر میں زندگی کا کتنا بڑا فلسفہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ فرانس میں ایک تاریخی سکول ہے جس کا نام Annals School ہے، یہاں جو تاریخ کے حوالے سے کام ہو رہا ہے اس کی شروعات ان چیزوں سے کی گئیں جو تاریخ میں پہلے سے موجود تھیں ۔ جب ماہر ناقدین نے ان تاریخی مسودوں کو کھنگالا تو کھوکھلی بنیادیں ہل کر رہ گئیں اور ان دیواروں میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے ۔سکول کے اہم تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ تاریخ نویسی کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ انسانی سماج اور ماحول کے پس منظر میں یہ دیکھا جائے کہ ایک انسان اور انسانی اداروں کے کیا محرکات رہے ہوں گے۔ اس کا ادراک صرف تاریخی ماخذات کا طواف کرنے سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو زمانوں اور قوموں نے وراثتیں چھوڑی ہیں،اس کے خزانے تلاش کئے جائیں۔

لوک میراث قومی ورثہ ہوتا ہے یہ اب بڑے بڑے ملکوں کے سائنس دان اور تاریخ نویس بھی جان گئے ہیں ۔اب ان ملکوں میں بھی تاریخ کو از سر نو ترتیب دیا جاتا ہے۔امریکہ جیسے ملک میں بھی نئی تاریخ لکھنے والے اب تاریخی مسودوں سے زیادہ Oral History زبانی تاریخ کو اہمیت دیتے ہیں۔امریکہ میں مختلف قوموں اور نسلی قبیلوں کے مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کی گئی ہیں جس کا نام Oral Devices دیا گیا ہے۔اب جو نئے سرے سے تاریخ کو ترتیب دیا گیا ہے شاید ہی اب حال میں کوئی ملک بچا ہو جہاں کی یونیورسٹیوں میں زبانی تاریخ نہ پڑھائی جا رہی ہو۔امریکہ، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے مختلف علاقوں کی زبانی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے اور ایسے ایسے زبانی واقعات کو ترجیحی طور پر شامل کیا گیا ہے جو عام قصے کہانیاں ہیں۔اس سے وہ سارے واقعات تاریخی بن گئے ہیں جو آج تک کسی

تاریخ میں شامل ہی نہ تھے۔ پروفیسر مظہر الاسلام لوک ادب کے سماجی اور تاریخی پہلوؤں پر کچھ اس طرح سے اپنی رائے کا اظہار کررہے ہیں:

The elements of folk-lore are social products; they are created, retained and transmitted by the folk and as such, folk-lore is the mirror of the people...not dead like a piece of glass, but a living one.

تاریخ ادب کے ایک اور ماہر Hello Well اس کی تاریخی اہمیت پر اس طرح اپنی رائے کا اظہار کررہے ہیں۔

''مجھے یہ قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ابھی بہت سارا قیمتی سرمایہ اوجھل ہے جو ہمارے لئے کافی معاون اور مددگار بن سکتا ہے۔ وہ ان باریک بین تاریخ نویسوں کی راہ دیکھ رہا ہے جو اپنے خون جگر کو جلا کر وہ سارے چھپے راز سامنے لا کر ان کی تشہیر کریں تا کہ ہر زمانے میں پلے بڑھے سماجی مواد کا ایک ایک پہلو اجاگر ہو جائے۔''

جو نئے تاریخی اصول مدّون کئے گئے ہیں۔ اگر ان کو مدنظر رکھا جائے تو ایک تاریخ دان تب تک نئی تاریخ مرتب ہی نہیں کر پائے گا جب تک وہ ان اصولوں کو نہیں اپنائے گا۔ وہ صحیح اور حقیقت پر مبنی تاریخ نہیں لکھ سکتا اگر وہ خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اجتماعی سوچ، طور طریقے، عقیدے، توہمات اور ان کے لاشعور میں موجود امنگیں، بدلتے ارمان و آرزو، جذبات اور احساسات شامل نہیں کرتا ہے۔ جب تک ایک تاریخ دان یہ سب چیزیں نہ سمجھ لیں وہ کسی قوم، کسی سماج کی اجتماعی Mentality یا ان کا Behavioural pattern پوری طرح سے واقف نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایک تاریخ دان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ سماجی اساطیر، روایات، خواب دیکھنے اور ان کی تعبیر و تشریح، تمثیل، تخلیقی ادب، عوام کا طریقہ کار اور طرز کلام کی

نہج اور مماثلت کیا ہے۔ جبکہ یہ ساری چیزیں باضابطہ طور تاریخ نویسی کے حصے نہیں ہیں البتہ یہ لوک ادب یا لوک وراثت کے اہم عناصر مانے جاتے ہیں۔ روایات کسی بھی قوم کی ذہانت، اجتماعی اور ذہنی شعور کی ترجمان ہوتی ہیں۔ ان روایات کا برملا اظہار ہمیں لوک ادب میں ملتا ہے جبکہ تاریخی ادب سے اس کا دور دور تک کا واسطہ نہیں ہوتا۔ کسی قوم کی اجتماعی زندگی پر کس طرح سے کسی ملکی جغرافیائی، سیاسی حالات، اقتصادی نظام اور مذہبی عقیدے اپنا اثر ڈالتے ہیں جیسے کسی قوم کی Collective psyche میں مدد ملتی ہے مگر کسی طرح سے یہ قوم سماجی تضادات، انتشار اور کبھی آپسی رنجشوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں ان اساطیر، تلمیحات، ضرب المثل، کہاوتوں یہاں تک کہ قصوں کہانیوں اور داستانوں میں بھی کھل کر ملتی ہیں۔ سماجی تاریخ ان اساطیر سے بھری پڑی ہے جو کسی بھی قوم یا سماج کی ذہانت اور اس کی طاقت کا پتہ دیتے ہیں۔ یہی وہ سب چیزیں ہیں جو تاریخ کی جہد مسلسل میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہیں اور ان کے عمل کا عکس ناگزیر ہے اور یہ اثر گہرائیوں تک جاتا ہے۔ انسانی تہذیب اور تاریخ گواہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہی ایک انسان اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے مختلف جتن کرتا آرہا ہے۔ یہ اپنی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لئے کچھ دنوں کو اجتماعی خوشی کے طور مناتا رہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے کچھ مخصوص دن تہوار کے طور پر واقف کر رکھے ہیں جن میں یہ اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ دراصل ان خوشی کے دنوں کو منانے کے پیچھے اس کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو مشکلات اور مصیبتوں سے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی راحت دینا چاہتا ہے۔ یہ خوشی کے لمحات منانے سے اس کے دل کو سکون اور روح کو چین مل جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ان تہواروں کو ہم نے الگ الگ نام دے رکھے ہیں جیسے ہم ان کو بڑے دن، عید، دیوالی اور ہولی وغیرہ کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ فیسٹول تاریخ

نویسوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو شخصیات کے کارنامے لکھتے تھے۔ ان کے کام کو مدنظر رکھ کر اسے اپنی تاریخ کا حصہ بناتے تھے۔ اس طرف تو کسی کی بھی توجہ نہیں جاتی تھی، جن چیزوں کی اہمیت عوام میں تھی، جن میں عوام کی خوشیاں اور شادمانیاں شامل تھیں۔ اس لئے ان فیسٹولز کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ اب نئ تاریخ مرتب کرنے والے تاریخ نویس پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کسی قوم کسی سماج کے ساتھ سب سے زیادہ اور بڑی چیز کیا منسوب ہے۔ قوموں کی نفسیات، ان کے عقیدے اور توہمات تو اسی لوک ادب کا حصہ ہیں جو اَب تاریخ کے اہم حصے تصور کئے جاتے ہیں۔ اب یہ تسلیم کر کے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ یہ سب لوک ادب اور Ethnology کی خیر و برکت سے ملا ہے۔ آج کا مورخ اس بات پر غور خوض کرتا رہتا ہے کہ رسم اور تہذیب نے کس طرح سے انسانی وجود کو آ کار یا Structure بخشا ہے۔ اس سے زیادہ نفسیاتی تجزیہ کے مطالعے نے آج کے مورخ کو بے معنی چیزوں میں بھی تاریخی آثار ڈھونڈنے پر اکسایا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ کوئی بھی فیسٹول خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر فسٹیول کے ساتھ عوام کے جذبات اور احساسات وابستہ ہیں۔ بقول Mea Uzouf:

> ''تہواروں کا تاریخ سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ ان غیر معمولی وجوہات کو بیان کرنے میں بہت زیادہ مددگار ہوتے ہیں جن کے نشونما میں ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

اب جہاں تک ہم لوک ادب کی بات کرتے ہیں یہ عوامی عمل کے اس اجتماعی طریقے کو اپنے دل کی تختی پر قلم بند کر کے رکھ دیتا ہے بلکہ یہ لوک ادب ہی ہے جو ایک قوم کی بلند و بالا روایات کو جذب کرتا ہے۔ اس طرح سے لوک ادب سماجی اور تہذیبی سطح پر Historical Continuity کو محفوظ رکھنے والا کام کر لیتا ہے۔ یہ کل ہی

کی بات ہے عورت کو تاریخی ادب میں جگہ ملنی مشکل مانا جاتا تھا۔اس شعبے پر زیادہ غلبہ مردوں کا تھا۔شاید اس لئے بھی کہ سیاست میں عورتیں بہت کم تعداد میں آتی ہیں۔چونکہ سیاست کو ہی تاریخ کا موضوع مانا جاتا تھا اس لئے تاریخ دانوں کی نظر ان عورتوں پر نہیں گئی جنہوں نے سیاست کے بغیر بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔جیسے روحانی، علمی اور ثقافتی میدانوں میں عورتوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی عام عورت نے سماجی رشتہ داری، اخوت اور بھائی چارے کے لئے بہت کام کیا ہے۔خاص کر بچوں کی پرورش کر کے ایک صحت مند سماج کو تعمیر کرنے میں عورت کا اہم رول ہے۔ایسے بہت سارے واقعات ہیں جو عورتیں ہر دور میں کرتی آئی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔ان کا کوئی بھی ذکر تاریخ میں ہمیں نہیں ملتا ہے۔البتہ ہر قوم کے لوک ادب میں ہمیں خواتین کے کام اور کارنامے ضرور ملتے ہیں۔زیادہ تر قومی لوک ادب عورتوں کا تخلیق کردہ ہوتا ہے یعنی جو لوک ادب میں نظم یا نثر ہے اس کا زیادہ تر حصہ عوتوں کا کہا یا لکھا ہوتا ہے۔عام طور پر دیکھا گیا ہے جو لوک ادب میں شاعری کا مواد موجود ہے اس میں زیادہ تر وہی گیت مقبول ہوتے ہیں جو عورتوں نے دل سے کہے یا لکھے ہوں۔خاص طور پر جو عورتوں پر ظلم و زیادتی والے گیت ہوتے ہیں یا محبت کے نغمے ہوتے ہیں یا جدائی اور انتظار قسم کے ترانے ہوتے ہیں وہ زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی ہمیں کسی ملک یا قوم کی عورتوں کی تاریخ کے بارے میں جاننا ہو تو ہمیں چاہئے کہ وہاں کا لوک ادب پڑھا جائے یا سمجھا جائے۔ وہاں کے لوک ادب کو کھنگالے بغیر اس قوم کی عورت کو صحیح معنوں میں پہچان نہیں پائیں گے۔کشمیری لوک شاعری میں دو اصناف بہت اہم ہیں۔ایک ہے ''وَن وُن'' اور دوسرا ''روف''۔ دونوں اصناف عورتوں سے منسلک اور منسوب ہیں جو بالکل Running Commentary کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان اصناف میں کشمیری عورت اپنے

وجود پر گزری ساری کیفیات کا اظہار کرتی ہے جس میں محبت اور نفرت، غم اور خوشی، گلے شکوے اور جذبات واحساسات جیسے سارے مناظر بہتے جھرنے کی طرح رواں دواں ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک تاریخ دان کشمیر کی کسی عورت کی صحیح ترجمانی کرسکتا ہے جب تک وہ کشمیری شاعری کی ان اصناف کو نہ پڑھے یا کشمیری فوک لور کو پرکھ نہ لے۔ عورت کے نازک مگر حسین جذبات جب شعر بن کر ساز میں ڈھل جاتے ہیں تو شعر وسنگیت کا سنگم ہر سننے والے کے جذبات کو مزید مشتعل کرتا ہے۔ کشمیر ان جغرافیائی خطوں میں بڑا خوش نصیب ہے جہاں تاریخ نویسی کی قدیم روایات موجود ہیں۔ کشمیر کے مشہور مورخ کلہن پنڈت نے راج ترنگنی لکھتے وقت نہ صرف راجہ رانیوں کو ہی اپنی تاریخ کا حصہ بنایا ہے بلکہ اس دور تک جو موجود تاریخیں تھیں ان پر سیر حاصل بات بھی کی ہے۔ کلہن نے صرف ان تاریخی مسودوں سے استفادہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے لوک ادب کا بھی بھر پور فائدہ اٹھایا ہے اور ساتھ ہی لوک ادب کا بہت سارا حصہ اپنی تاریخی کتاب ''راج ترنگنی'' میں شامل کیا ہے۔ خصوصاً جو انہوں نے قدیم دور کی تاریخ لکھی ہے اس کے لئے زیادہ لوک ادب کا ہی سہارا لیا ہے۔ اس بات کا برملا اظہار سٹائن بھی کرتا ہے جنہوں نے ''راج ترنگنی'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔

> It cannot be doubted that Kalhana had taken many of the legends and anecdotes so frequently in the earlier portion of his narrative from the traditional lore current in his own time and not from earlier writers.

صرف کلہن ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے کشمیر سے تعلق رکھنے والے مورخ پیر حسن شاہ کھویہامی نے بھی لوک ادب سے بہت سارے کردار لئے ہیں اور

تاریخِ حسن کے صفحات میں ان کو زینت بخشی مگر جی۔ایم۔ڈی صوفی جو حسن شاہ کی اس کوشش کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں، میں ذاتی طور پر اس سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔وہ لکھتے ہیں:۔

> ''اگر ہم لوک کتھاوؤں کو سچ ماننے لگے جو آج تک کشمیریوں کے پاس محفوظ ہے، پھر تو مورخ پیر حسن شاہ صاحب نے جو بادشاہوں کے متعلق لکھا ہے وہ سب سچ ہے، جس طرح کلہن کی تاریخ اٹھارہویں صدی کی نصف تک سچ ہے۔ کیونکہ کشمیری آج بھی ''پانڈولر'' جانتے ہیں اور یہ زمین کو ''پانڈودوج'' کا نام دیتے ہیں۔''

جہاں تک سنجیدہ تاریخ نویسی Historiography کا تعلق ہے حسن شاہ کا لکھا بنا دیکھے تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی صوفی کی دلیل میں دم ہے کہ اگر کلہن روایات کو بنیاد بنا کر اسے تاریخ کا نام دیتا ہے تو پھر حسن شاہ کھو یہامی کہاں قصوروار گردانا جا سکتا ہے؟ کلہن اور حسن شاہ کے زمانے میں لگ بھگ سات سو سال کا فرق ہے۔ حسن شاہ کو جو ماخذات انیسویں صدی میں دستیاب تھے، کلہن کو وہ سب گیارہویں صدی میں کہاں دستیاب تھے۔ حالانکہ ہم حسن شاہ صاحب کے کام کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ گزرے زمانے کو تاریخ میں شامل کرنے کیلئے وہی واقعات اہم اور ضروری تصور کئے جاتے ہیں جو تاریخی اصولوں پر پورے اترتے ہوں۔اس کے لئے جو اصول تسلیم کئے گئے ہیں وہ لوک ادب کو شاہد بنا کر نہیں بنائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں اصل زمان و مکان کی صحیح شہادت نہیں ہوتی ہے۔ البتہ سیاسی تاریخ سے زیادہ سماجی اور ثقافتی تاریخ سمجھنے میں ''لوک ادب'' سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ سماجی اور ثقافتی تاریخ میں واقعات سے زیادہ ذہنی تحریک، فکری اظہار، سماج اور اداروں کے نظام کا ذکر ہوتا ہے جو سیاسی حالات و واقعات کی طرح ہر دن بدلتے رہتے ہیں۔ مختصر مدتی واقعات سے زیادہ طویل عرصے

کے واقعاتنظام اور اداروں کا ادراک کرنے میں ''لوک ادب'' سے زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ لوک ادب سے ہم سیاسی تاریخ اخذ ہی نہیں کر سکتے، البتہ سیاسی تاریخ کو قلم بند کرنے میں جو Historical Continuity کی جزیات ہوتی ہیں وہ سب فوک لور سے مقرر نہیں کیا جا سکتا (فوک لور لوک ادب کا اہم حصہ ہے) البتہ فوک لور سے سیاسی شخصیات کا Behaivour، ان کی سوچ، ان کا ضمیر اور Approach جاننے میں کافی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ہوش منداور زیرک تاریخ نویس اس زمانے کی مخصوص سیاسی سرگرمیوں اور عام حالات کا بھر پور اندازہ لگا سکتا ہے۔ جس ماحول میں ایسے کردار پلے بڑے ہوں جن سے ہر ایک کشمیری واقف ہیں۔ کچھ ایسی تلمیحات ہیں جو یہاں زبان زد عام ہیں اور یہ تلمیحات اکثر عام بول چال میں استعمال بھی ہوتی ہیں مثلاً ''عظیم خانن چھڑ''، ''عطا خانن گاڑ''، ''بیگاری''، ''گلاب سنگھن پٹھ'' ''شیر سنگھن دراگ''، ''بھگہ شہن دفتر''، ''لارن صابن بندوبست'' وغیرہ۔ یہ تلمیحات یاد کر کے ہم وہ دور یاد کرتے ہیں جس دور کی یہ عکاسی کرتی ہیں اور وہ سارا زمانہ اپنے کرداروں کی ساری اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا ہوتا ہے ،اگر چہ یہ تلمیحات قدیم دور کی ہیں لیکن ان میں تازگی ایسی ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اسی طرح کچھ لوک کہانیاں ہیں جن کے کردار اور واقعات ''الہ شہر''، ''مت آب'' ''تیس مار خان'' وغیرہ سے کشمیر کے ان مخصوص ادوار کو بڑی فن کاری کے ساتھ عکاسی کی ہے لیکن یہ بات ضروری ہے کہ کسی دعویٰ کو دلیل کے بغیر کسی تاریخی واقعے Periodicity کی حد مقرر نہیں کر سکتے ہیں۔ کبھی کوئی تخلیقی فن پارے کی اندرونی شہادت کسی واقعہ کا وقت اور اس کا سن بھی معین کرنے میں مدد گار ہو سکتا ہے لیکن یہ کسوٹی ہم کسی بھی طرح لوک ادب پر لاگو نہیں کر سکتے۔ مثال کے لئے ہم یہاں رحمٰن

راہی کی نظم ''معافی نامہ'' کی بات کرتے ہیں۔ اس نظم میں آہنگ اور الفاظ کا چناؤ اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ اس نظم میں ایک خاص دور کی طرف اشارہ ہے۔ نظم میں اس دور کے صاحب اقتدار لوگوں کا شاہی مزاج اور سیاسی حالات کی صحیح عکاسی ملتی ہے لیکن یہ نظم ہم ''مت آب'' یا ''الہ شہر'' کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے۔ یہ کسی تاریخی دور میں پیدا شدہ افراتفری اور اس کے مطلق Point of reference نہیں بن سکتے اور نہ ہی کسی خاص رونما ہوئے واقعے کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں۔

اس طرح کشمیری لوک ادب میں کہاوت اور ضرب المثل اور تمثیل کا رجحان عام ہے جو ہمیں طویل اور قدرتی تاریخی حقیقت، اجتماعی سوچ کا انداز، فکری رجحان، رہن سہن کے طور طریقے، رسم ورواج، مذہبی عقائد، تصور اور توہمات، دل رکھنے والی چیزیں، کھانا پینا، گھر بنانے کے طریقے، پیڑ پودے، جانور، کاروبار کے طور طریقے، زمین وزراعت میں ایک دوسرے کی مدد، گاؤں اور شہروں میں بسنے کے طور طریقے، مزاج اور روایت، سماج میں عورت کا مقام اور ایسے بہت سارے موضوعات آج کی تاریخ نویسی کے لئے بہت اہم تصور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے سارے موضوعات ہمیں لوک ادب میں بڑے ذخائر کے روپ میں دستیاب ہیں وہ تاریخی کتب میں نہیں ملتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک تاریخ لکھنے والے کو علمِ تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجیات، عمرانیات، اقتصادیات، لسانیات، تخلیقی ادب اور لوک ادب پر گہری نظر ہونی چاہئے۔ تبھی وہ تاریخ میں مثبت حوالہ جات اور معتبر رائے دے سکتا ہے۔ تاریخی جغرافیہ، تاریخی سماجیات یا تاریخی لسانیات اب ایسے اور نئے شعبے ہیں جن میں بہت کم کام ہوا ہے اور ان شعبہ جات پر کوئی بھی تاریخ دان تب تک قلم نہیں اٹھا سکتا جب تک اسے زبان وادب (تخلیقی اور لوک ادب) پر مکمل دسترس نہ ہو۔ وہ اس لئے کہ زبان ایک قوم کی تہذیبی اظہار کا ایک معتبر وسیلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ زبان

اورادب میں وہ سارے جغرافیائی آثار ملے ہوئے ہیں جن کو بنیاد بنا کر ایک مورخ کسی بھی ثقافتی یا جغرافیائی اکائی کا حال احوال سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً Place names خاص جگہوں کے گمشدہ نام تلاشنے میں نئی تاریخ کی اہمیت ہے۔ کسی جغرافیائی جگہ کا نام یعنی Place names صرف اس علاقے کا فزیکل حدود اربعہ نکالنے میں ہی مدد نہیں کرتا ہے اس کی بھی مدد کرتا ہے جس کی وجہ سے اس جگہ کو یہ نام دیا گیا ہو بلکہ یہ Place names اس مخصوص جغرافیائی خطے میں ان وسائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جن کی مدد سے اس وقت کے لوگوں نے اسے بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہو۔ ان جگہوں کے نام جاننے میں ایک مورخ کو لوک ادب کافی حد تک زیادہ مدد کر سکتا ہے جتنا اسے کتابوں سے استفادہ کرنے سے نہیں مل سکتی ہے۔ کیونکہ ان جگہوں کے ناموں کے ساتھ ''لوک ادب'' کے ساتھ جو وابستگی اور روایات کی داستان جڑی ہوتی ہے وہ اسی جغرافیائی خطے کے عوام کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں اور ان کی منظوری کا عمل دخل اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے لوک روایات Original history علاقائی تاریخ کے خدوخال وہاں ملتے ہیں وہ تاریخ دان کو بہت زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔ Aurel Stein بھی راج ترنگنی کے مقدمے میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ کلہن نے بہت سارے علاقوں کے نام یہاں کی لوک روایات سے لئے ہیں جیسے ''سوپور'' ''بیر پور'' ''نیلہ ناگ'' '' ویژار ناگ'' وغیرہ۔ غرض یہ کہ یہ روایات Geographical Topography جاننے اور تاریخ کے طالب علم کے علم میں اضافہ کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

بقول پروفیسر منظور فاضلی:

''دریائے جہلم کا منبع ہو یا ولر کے ابلتے سوتے ہوں، زلزلوں کی بات ہو یا سیلابوں کے قصے، دور دراز گاؤں کے نام ہوں یا ہاری

پربت کا ٹیلہ، سچ تو یہی ہے کہ ہمارے لوک ادب نے ہماری تاریخ کا
بڑا حصہ رقم کر کے رکھا ہے۔"

اس ساری تفصیل کے بعد کہ "لوک ادب" کس حد تک ایک مورخ کو تاریخ لکھنے، سمجھنے یا ترتیب دینے میں مدد کرسکتا ہے، سچ تو یہی ہے کہ لوک ادب تاریخ کا بدل نہیں ہوسکتا۔ سیاسی تاریخ کے سلسلہ وار ترتیب اور اس کے معین طریقہ کار کو تحریر میں لاتے وقت "لوک ادب" کوئی مدد نہیں کرسکتا ہے نہ کوئی صحیح تاریخ فراہم کرسکتا ہے، البتہ یہ عوام کی روایت، اداروں اور سماجی تنظیم سازی اور حالات کو اخذ کرنے کی طرف کسی حد تک رہ نمائی سکتا ہے۔ لوک ادب اور تاریخ کے درمیان جو خاص اور بنیادی فرق ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی واقعہ ہو یا کوئی ایسی سرگرمی رہی ہو جو زمان و مکان کے ساتھ ارتقا پذیر ہوا ہو وہ تاریخ کے بل بوتے پر کھڑا ہوتا ہے، ایسے واقعات کے لئے تاریخی تسلسل کا ہونا بہت ضروری ہے اور یہ تاریخی تسلسل لوک ادب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ادب میں جذباتی تخلیق کار رہوں تو یہ پورے ادبی سرمائے کا فخر ہے لیکن یہ تاریخی ادب کے لئے نقصان دہ ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی واقعہ یا Event حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کا اہم دروازہ تصور کیا جاتا ہے۔ ادب میں خیال اہم ہے، جبکہ تاریخ میں خیال سے زیادہ massage کی اہمیت ہوتی ہے۔ اچھا ادب تخلیق کرنے کے لئے اچھی زبان کا ہونا ضروری ہے جبکہ تاریخ سادہ اور سہل زبان مانگتی ہے جس میں کوئی علامت یا ابہام نہ ہو۔ تخلیق اور لوک ادب میں انسانی تجربات پر مبنی جذبات اور داخلی کشمکش کو بروئے کار لانے کا ہنر آنا چاہئے جبکہ تاریخی ادب کے لئے سچے واقعات کو خود مختار بنا کر پیش کرنے کی جرأت ہو اور وہی سچ اپنے وجود کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ اسے کھڑا رکھنے کے لئے جذبات کا سہارا درکار نہیں ہوتا۔ ہیجان خیزی

ادب کا بڑا اگن ہوسکتا ہے لیکن تاریخ میں اگر بے وجہ ہیجان خیزی برپا کردی جائے تو سچ
پیچھے رہ جائے گا، جبکہ تاریخ کا اصل مغز تو سچ اور حقیقت ہوتی ہے۔

کتابیات

1.BranT.Riley, (ed.) Socio-Linguistics- Language in Culture and Society.

2.Croce, Theory and History of Historiography.

3.G.M.Trevelyan, Autobiography and Other Essays.

4.Collin Lucas, (Introduction) Constructing the Past,.

5. M.G.White, Historical Explanation, vol.i.

6.F.Braudel, Annals, quoted by Collin Lucas.

7. Deenis Smith, Historical Sociology.

9.Mazharul Islam, Folk Lore ;the Pulse of the People,

10.Georges Duby, Indologies in Social History, quoted in Contructing the Past,.

12. Alan Dundes, The Study of Folk Lore.

14. John Vincina, Oral Tradition as History.

16. Goff, History of Mentality.

18. John Vincina, Oral Tradition as History.

15. Goff, History of Mentality.

16. E.Oliver, Seasonal Feasts and Festivals.

☆......موتی لال ساقی

وید، مہابھارت، پوران اور کشمیر

تاریخ میں درک حاصل کرنے کے لئے مطالعہ ومشاہدہ کے علاوہ تاریخ سے وابستہ دیگر شعبوں کی گہری اور وسیع جانکاری ہونا لازمی ہے۔ جو باتیں ہمیں کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتیں اُن کا سراغ ہمیں فوک لور، زبان وادب، رسوم ورواج اور مختلف روایات دیتی ہیں۔ اس طرح ایسی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو کتابوں کے گہرے مطالعے کے باوجود سلجھانا ناممکن ہوتی ہیں۔ بات واضح ہے کہ جو اہم باتیں مورخ سے چھوٹ جاتی ہیں اُن کو عوامی ذہن اور تخیل سنبھال کے رکھتا ہے۔ یہی حقیقت سامنے رکھ کر مجھے محمد یوسف ٹینگ کی یہ بات بامعنی اور وزن دار لگتی ہے کہ کسی علاقے کی تاریخ کے ساتھ وہی شخص انصاف کرسکتا ہے جس کی جڑیں وہاں کی زمین میں گہری ہوں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مؤرخ اُس علاقے اور لوگوں کے تہذیبی اور تمدنی سفر کے علاوہ وہاں کی جغرافیہ، زبان، ادب، لوک ادب، سماجی زندگی وغیرہ سے پوری طرح واقف ہونا چاہیئے جس علاقے کی تاریخ مرتب کرنا مقصود ہو۔ اس کے ساتھ ہی مورخ کا گروہ بندی سے بالاتر ہونا بھی ضروری ہے۔ لکھتے وقت وہ اپنے عقائد سے بالاتر ہو اور واقعات کی چھان پھٹک کرنے میں مشغول ہو۔ اس کے نتائج واقعات کے سیاق وسباق کے تناظر میں صحیح ہوں۔ ذاتی پسند یا ناپسند کا تاریخ نویسی میں کوئی دخل نہیں۔ اکثر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سابقہ ادوار میں عقیدے، تاریخ پر غالب ہوتے تھے جس وجہ سے تاریخیں صحیفہ نویسی کے نمونے بن

گئیں ہیں۔تمہید تھوڑی طویل ہوگئی ہے لیکن مجبوری کا کیا کِیا جائے کہ کشمیر کے بارے میں، جو بے شمار کتابیں آج تک لکھی گئیں ہیں ان میں سے اکثر کتابوں میں تحقیقی مواد چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔تساہل پسندی نے اِن کتابوں کو مشکوک بنا دیا ہے۔ لکھنے والے کا ذاتی عقیدہ تحقیق وتجسس پر غالب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ چاہے وہ کلہن ہو یا حسن کھویہامی، بیربل کاچرو ہو یا اعظم دیدمری، کشمیری تمدن کے ساتھ براہ راست وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے سرارل سٹین جیسے عظیم محقق کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے ہیں۔ جہاں تک کشمیر کی تاریخ کے بنیادی ماخذات وید، رزمیہ اور پورانوں کا سوال ہے، اکثر تاریخ نویسوں نے وہی بات بار بار دہرائی ہے جو پہلے ''نیل مت پوران'' اور بعد میں ''راج ترنگنی'' میں درج ہے۔''ستی سر'' سے بات شروع کر کے سیدھے ''گونند'' تک پہنچائی جاتی ہے۔ درمیان میں، جو ہزاروں برسوں کا وقفہ ہے، اُس کا کیا کیا جائے؟ قدیم مورخوں کی بات ہی نہیں آج کل کے مورخوں نے بھی یہ تکلیف برداشت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ اشارہ ہی کرتے کہ مختلف شہادتیں کس نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ درمیان کا جو وقت ہے اس کے بارے میں کوئی حتمی چیز سامنے آسکے اور یہ افسوسناک امر ہے کہ اس حقیقت سے آنکھیں چرانا موجودہ دور میں تحقیق کی روح کے منافی ہے۔تبھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر میں آج تک تالیف کی گئیں اکثر تاریخی کتب صحیفہ نگاری یا داستان گوئی کے دائرے سے باہر نہیں آسکی ہیں۔

ستی سر کے اسطور کو ماہرینِ ارضیات نے توڑ دیا ہے اور قبل از تاریخ دور کو آثار قدیمہ کے ماہرین نے بہت حد تک سامنے لایا ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی بھی ہمارے بعض تاریخ نویس لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ کشمیر کی تاریخ کا جائزہ لینے والے مورخوں نے دستیاب تاریخی حوالوں سے

استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔چینی اور یونانی ماخذات تو دور کی بات ہے، وہ ثانوی حوالوں سے بھی آگاہ نظر نہیں آتے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ماضی کے بارے میں بہت سی باتیں پوشیدہ ہیں۔یہ بات صحیح ہے کہ آریوں کی قدیم ترین کتاب ''رگ وید'' میں کہیں بھی نام لے کر کشمیر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اسی وید کے دسویں منڈل میں نام لے کر کشمیر کے دریاؤں کا تذکرہ ہے اور کسی بھی مورخ نے اس حوالے کا نام بھی نہیں لیا ہے۔''رگ وید'' کا حوالہ بہت ہی اہم ہے۔اس کے طفیل کشمیر کی تاریخ کا وہ دور آنکھوں کے سامنے آتا ہے جس کے متعلق دستیاب تاریخوں میں کوئی بھی تفصیل درج نہیں۔منڈل میں شامل شلوک یوں ہے۔

''ہے گنگائے، ہمنائے سرسوتی، ستودری (ستلج)، پروشنی (ایراوتی، راوی) میری آرادھنا قبول کر۔اسکنی (اسکسن-چناب) سمیت سُن، مرڈ واڈھااور وتستا کے ساتھ سُن۔ارکلیا سوشما کے ساتھ''

رگ وید کا یہ حمد یہ اقتباس بہت اہم ہے کہ اس میں جن دریاؤں کا نام لیا گیا ہے، ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود ان میں سے اکثر کے نام ویسے ہی ہیں۔لگتا ہے جب یہ بھجن تخلیق کیا گیا ہے اس وقت مختلف آریہ قبیلے گنگا اور جمنا کے اس پار تھے اور اس علاقے کا محل وقوع اور وسعت اُن کے زیر نظر تھی۔اُس وقت آریہ خانہ بدوشی اور مستقل بستیاں قائم کرنے کے عبوری دور میں تھے۔تہذیبی اعتبار سے لگتا ہے کہ پرانے مکینوں کو بھگا کر یا زیر کر کے وہ اپنے قدم جما رہے تھے اور جو ہڑپا تہذیب، موجودہ ہریانہ بلکہ اس سے بھی آگے پہنچی ہوئی تھی، اس کے ملبے پر آریہ ایک نیا تمدن تعمیر کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔آریہ بنیادی طور خانہ بدوش تھے مگر ہڑپا تہذیب کے بانی کار مستقل بستیوں میں آباد تھے۔اس بات کا اعادہ شاید غلط نہیں کہ پُرانی بستیوں کو دیکھ کر ہی آریوں کو مستقل بستیاں قائم کرنے کا خیال آیا ہو اور جس تہذیب کو ہم

''ویدک تہذیب'' کہتے ہیں اُس کو سنوار نے سنبھالنے میں قدیم ہڑپا تہذیب کا حصہ اتنا ہی اہم ہو جتنا کہ خود آریوں کا رہا ہے۔ اُس دور کے آریہ کیسے خانہ بدوش اور مستقل آبادی کے عبوری دور میں رہ رہے ہوں گے، اس کا پتہ ندی استوتی میں درج ''مرڈ واڈھا'' دریا کے تذکرے سے ملتا ہے۔ یہ نالہ مرواہ اور وارڈون علاقے کا تمام پانی جمع کر کے کشتواڑ کے نزدیک چناب کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اگر آریہ خانہ بدوش اپنے مال مویشی کے ہمراہ چراگاہوں کی تلاش میں اس علاقے میں نہ آئے ہوتے تو اس پہاڑی نالہ کا ذکر ''رگ وید'' میں آجانا ناممکن تھا۔

''رگ وید'' میں درج اس دریا کا ذکر ''نیل مت پوران'' کی اُس اسطوری روایت کو معنی بخشتا ہے، جس کے مطابق چندر دیو کے وقت تک آریہ جاتی کے لوگ گرمیوں میں یہاں آتے تھے اور سردیوں میں پہاڑوں سے واپس چلے جاتے۔ اُس اسطور سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ آریوں نے کشمیر کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ اپنا مال مویشی لے کر یہ خانہ بدوش اونچی چراگاہوں کا رخ کرتے۔ اسی کے ساتھ ایک اور سچائی بھی ہے کہ یہ وادی ''کشپ مر'' وغیرہ کے نام سے مشہور نہیں تھی۔ جہاں کشمیر کے دریاؤں کا ذکر ''رگ وید'' میں آیا ہے وہاں اُس علاقے کا نام اس میں کیوں نہیں آتا جہاں سے یہ دریا اُبل پڑتے۔ ''ندی استوتی'' میں نہ سہی کسی دوسرے شلوک میں علاقے کا نام ضرور آیا ہو۔

''نیل مت پوران'' اندازے کے مطابق، ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے جب کہ رگ وید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے 2500 ق۔م سے 1400 ق۔م کے درمیان تخلیق کیا گیا ہے۔ حالانکہ تازہ تحقیق کے مطابق ''رگ وید'' کو 2000 ق۔م کا گردانا گیا ہے۔ نیل مت پوران کی روایت کم و بیش ساڑھے تین سے چار ہزار سال پرانی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اسطور کا جامہ

پہن کر لوک روایات نے محفوظ رکھا اور اب اس کی نقاب کشائی ممکن ہو رہی ہے۔ اگر ''رگ وید'' میں فقط ''وتستا'' کا تذکرہ آیا ہوتا تو اسے اتفاق تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہزاروں برس اس نام کا موجود رہنا اس انداز ے میں بھی حائل ہو سکتا ہے کہ ''ندی استوتی'' میں اس نام کا شامل ہونا بہت ہی اہم ہے مگر اس کے ساتھ ہی حمد میں ''اسکنی'' کا نام بھی آیا ہے۔ اس دریا کا ایک اور نام چندر بھا گا (چاند کا عکس) ہے اور سکنی چناب کا ویدک نام ہے جس کا کالا ہونا معنی رکھتا ہے۔ اسی دریا کی یونانی صورت اسکنس یعنی سکندر کو دریا کے پارے جانے کی ہے۔ مگر بنیادی طور خود اسکنس بھی اسکنی نام کی یونانی صورت ہے۔

چناب کو کیوں ویدک شاعروں نے اسکنی کا نام دیا ہے۔ اس کے سرچشمے تک وہی پہنچ سکتا ہے جس نے یہ دریا گھنے جنگلوں کے بیچ بہتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس سارے علاقے میں گھنے جنگلوں کا سایہ چناب کے بدن کو کچھ کچھ کالا سا دکھاتا ہے اور یوں اس دریا کا پانی بظاہر کالا نظر آتا ہے۔

چناب کو ویدک شاعر کا اسکنی نام دینا بہت ہی معنی خیز ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس شاعر نے یہ نام دیا ہے وہ اُس سارے علاقے سے باخبر رہا ہوگا جہاں سے یہ دریا بہتا ہے۔ اُس زمانے میں اس دور دراز علاقے کا جائزہ لینا آریوں کا کشمیر اور اس کے گرد و نواح کے علاقے پر گہری نظر رکھنے کا عندیہ دیتا ہے۔ اتنا ہی کیوں وتستا اور چندر بھا گا کے ساتھ ملنے والا ایسا ہی ایک پہاڑی نالہ ویدک دور کا ''مڑواہ'' رہا ہے۔ یہ نالہ کشتواڑ علاقے میں چناب میں جا گرتا ہے۔ سروے نقشے میں اس نالے کا نام ''مڑواہ واڑون'' درج ہے جب کہ عام لوگ اسے ''مڑواہ وادی'' کہتے ہیں۔ اپنے لگ بھگ 160 کلومیٹر طویل سفر میں یہ نالہ اَمرناتھ سے ہوتے ہوئے بلند بانگ چوٹی تک کا تمام برفیلا پانی جمع کر کے چناب میں مل جاتا ہے۔

ویدوں میں اس نالے کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ گلہ بانی کے دوران آریہ کن دشوار گزار پہاڑوں میں گھوما کرتے تھے۔ کشمیر میں آئی لسانی تبدیلی کی وجہ سے شہری علاقوں میں ''ڈ'' نے ''ر'' کی شکل اختیار کر لی۔ مڑ واہ وادی کا ذکر کرتے ہوئے سٹین لکھتے ہیں :

''اس بات پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ ''مڑ واہ'' اور ''واڑون'' جو اس وادی کا نام ہے، اس کا صوتیات کی بنیاد پر ویدک ''مرڈ واڈ ھا'' نام سے زبردست مماثلت ہے۔ راج ترنگنی میں اگر چہ اس نالے کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے مگر صوتیاتی مماثلت اس کا مبدل ہے۔ لفظ ''ون''، ایک طرف چھوڑ کے ''مرڈ'' لفظ کا تلفظ ''مڑ داہ'' اور ''واڑ ڈاڑ ھ'' لفظ کا بدلا ہو اروپ ہے جو کشمیری لسانی قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے۔''

سٹائین خود مڑ واہ نہیں گئے ہیں ورنہ انہوں نے نالے کے نام کے لئے براہ راست ''مڑ واہ سندھ'' لکھا ہوتا اور انہیں ''ون'' لفظ پر بحث نہیں کرنا پڑتی۔ ''ون'' بہت سے الفاظ کے بعد میں آتا ہے۔ مثلاً کا یہ ون، رُوپ ون، ڈنڈک ون وغیرہ۔ جہاں تک سندھ لفظ کا تعلق ہے اس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ''رگ وید'' کے بعض شلوکوں میں سندھ مطلب سمندر ہوسکتا ہے۔ مگر معنی میں تبدیلی جغرافیائی حالات زیر نظر رکھ کر سمجھ میں آسکتی ہے۔ ایسی بھی جگہیں ہیں جہاں لوگ اصلی سندھ کو تیر کر پار کرتے ہیں بعض مقامات پر سندھ اتنی چوڑی ہے کہ اس کے کنارے پر کھڑا بندہ، یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہتا ہے کہ ندی کنارے کھڑا ہے یا سمندر کے کنارے۔ میکس مولر کے مطابق ''سندھ'' لفظ کے معنی تقسیم کرنا یا کاٹنے والا یا حفاظت کرنے والے اور سامنا کرنے والا ہے۔ اس لفظ کا اصل ''سدھ'' یعنی دور رکھنا یا اچھے رکھنا ہے۔ یہ لفظ پہلے نر تھا اور بعد میں مادہ بن گیا۔ چنانچہ قدیم آریہ بستیوں کا ہندوستان میں عام نام

''سپت سندھ'' یعنی سات دریاؤں کا علاقہ تھا۔ اگر چہ دیگر دریاؤں کو بھی القاب کی رُو سے سندھ کہا گیا ہے لیکن ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب بڑے دریا کی بابت مخصوص رہا۔ ان سات دریاؤں میں پنجاب کے پانچ دریا بھی شامل تھے۔ کشمیر کے معاملے میں سندھ دریا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسا سیلابی دریا جس کو پار کرنا مشکل ہے اور جب وہ غضبناک ہو جاتا ہے تو سب کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔

سندھ لفظ کی بعض اور تاویلیں بھی کی گئیں ہیں۔ آریہ ورت کا ہندوستان نام پڑنے کی وجہ یہی دریا ہے۔ سندھ لفظ کے معنی کالا، چوری کرنا بالکل گمراہ کن ہے جو بہت سی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سندھ علاقے کے ہمسایہ لوگ ایرانی بولتے تھے جو ''س'' کا تلفظ ''ہ'' کرتے تھے۔ اس طرح سندھو، ہندھو بن گیا جو بگڑتے بگڑتے ہندو بن گیا۔

رگ وید کے ''ندآ ستوتی بھجن'' میں کشمیر کے تین اور اگر ''سندھ'' بھی شامل کیا جائے تو چار دریاؤں کا شامل ہونا ثابت کرتا ہے کہ ویدک دور کے لوگوں کو نہ صرف کشمیر کی سرسری پہچان تھی بلکہ اس علاقے کی جغرافیائی صورت حال کی بھی علمیت تھی جسے آج کل کشمیر کہتے ہیں اور اگر سیاسی اصطلاحات میں بات کی جائے تو ''کشمیر'' سے مراد ایک وسیع علاقہ تھا۔ کشمیر کے ساتھ اُن کا تعلق ہر دور میں قائم رہا ہے۔ باتوں باتوں میں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کشمیر اس جغرافیائی خطے کا حصہ تھا جسے ''سپت سندھو'' یعنی سات دریاؤں کا علاقہ کہا گیا ہے۔ بات کو مزید واضح کرنے کیلئے ویدک دور کا ''سپت سندھو'' وہ علاقہ تھا جسے ''نداستوتی'' میں درج سات بڑے دریا سیراب کرتے تھے۔ آر-این-سلنور ''سپت سندھو'' کے دریاؤں میں گنگا، جمنا، سرسوتی، ستلج، راوی اور چناب کے نام گنتا ہے لیکن وہ ''سندھ اور وتستا'' کا نام بھول گیا ہے حالانکہ اس کا اشارہ خود ''نداستوتی'' دیتی ہے اور جغرافیائی اصطلاح پنج ند (پنجے آب) جس کا

نام بعد میں پنجاب پڑ گیا۔اسی طرح ایس۔سی۔رے کا یہ کہنا عجیب لگتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ویدوں میں مڑ واہ اور واڑ ون کا ذکر نہیں ہے۔لگتا ہے کہ دونوں فاضل دوستوں نے خود وید دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔اسی لئے اُن کی نظر اصل سے بھٹک گئی ہے۔ ''نداستونی''، راج ترنگنی مرتب کرتے وقت مارک ارل سٹین کے زیر نظر نہیں رہی ہے۔لیکن یہ کمی انہوں نے تب پوری کی جب انہوں نے 1921 میں'' نداستوتی '' کی بنیاد پر''Some River Names of Rigveda'' نامی ایک چھوٹا سا کتابچہ شائع کیا۔

ویدک دور سے ہی کشمیر کے ساتھ آریوں کے تعلق کی صراحت بعض دوسری چیزیں بھی کرتی ہیں جن کی شہادت کشمیری زبان اور بعض کشمیری رسوم ورواج دیتے ہیں۔یہ ایسی شہادتیں ہیں جن کی تہہ تک پہنچنا اگر چہ ناممکن نہیں کہا جا سکتا لیکن مشکل ضرور ہے۔چنانچہ اسی بے خبری کی وجہ سے اکثر مورخ کشمیر کی تاریخ کی مختلف الجھنیں سلجھا نہیں سکے ہیں اور کشمیری مورخوں نے بھی معاملہ فہمی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

سب سے پہلے ہم کشمیری زبان کا تذکرہ کرتے ہیں جس کے متعلق بہت سے نظریات ہیں اور اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ بنیادی طور اس کا تعلق پشاچ زبانوں کے خاندان سے ہے۔پشاچ نام سن کر چونکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔پشاچ بھی بنیادی طور آریہ تھے۔عالموں کا خیال ہے کہ میدانی علاقوں میں رہنے والے آریہ، پہاڑی علاقوں میں رہنے والے آریوں کو غیر مہذب جان کر'' پشاچ'' کہتے تھے۔دراصل پہاڑوں میں رہنے والے آریہ زیادہ جفاکش اور سرکش تھے اور وہ میدانی علاقوں میں رہنے والے آریوں کی برتری تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے جس وجہ سے ''پشاچ'' کہہ کر اُن سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے آریہ پہلے آئے تھے اور میدانی علاقوں میں رہنے

والے ذرا دیر میں۔ خیر یہ طویل قصہ ہے اسلئے اصلی موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس بات سے کوئی بھی جانکار شخص انکار نہیں کرسکتا کہ کشمیری سرمایۂ الفاظ میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہے جو اب بھی کم وبیش ویدک صورت میں موجود ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ناخواندہ کشمیری کی زبان پر ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ الفاظ ہزاروں برسوں سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ عام بول چال کے الفاظ ہونے کی وجہ سے نہ ان کو سنسکرت مٹا سکی اور نہ فارسی۔ یہاں سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ سنسکرت سے کشمیری میں آئے ہوں گے مگر خود سنسکرت میں ان الفاظ کی صورت بگڑ گئی اور تبدیل ہوئی ہے۔ الفاظ کا اپنی اصل حالت میں کشمیری کا حصہ ہونا بین ثبوت ہے کہ کشمیر ''سپت سندھو'' کا حصہ رہا ہے۔ کشمیری میں مروج تمام ویدک الفاظ کا درج کرنا ممکن نہیں ہے لیکن حوالے کیلئے میں بعض الفاظ یہاں درج کرتا ہوں:

''پور، دُرگ کھل، کلال، دھانیہ (کشمیری دھان) کول، مسر،
منڈل، واکھ، کھار، گندھر، شتہ مون، سب، ارُن (کشمیری ورن)
دج، ہان وغیرہ قابل ذکر ہیں''۔

بات چل ہی رہی ہے اور مجھے یاد آیا کہ کشمیری میں بہت سے آسٹرک الفاظ موجود ہیں۔ آسٹرک وہ لوگ ہیں جنہیں سنسکرت کتابوں میں ''نشاد'' نام دیا گیا ہے۔ آسٹرکوں کے متعلق اس بات کو دہرانا مناسب ہے کہ ''کھش''اور'' آسٹرک'' مغربی راستے سے آریوں سے قبل ہندوستان آئے۔ اس کے بعد جب آریہ اکثریت میں ہو گئے تو انہوں نے ان دونوں ذاتوں کو بھگا دیا اور بہت سے آگے کے علاقے میں چلے گئے۔ کشمیری ال، وانگن، دڑن وغیرہ الفاظ اصل میں آسٹرک ہیں۔ لفظوں کا جائزہ بعض دوستوں کو یہ سوال کرنے پر مجبور کرسکتا ہے کہ بعض الفاظ کا کسی زبان میں ہونے کو تاریخ سے کیسے جوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات جاننا لازمی ہے کہ زبان میں زمانے کا

مکمل ریکارڈ تب سے محفوظ ہے جب لکھنا پڑھنا رائج نہیں تھا۔ چنانچہ ویدوں کی زبان بنیاد بنا کر یہ حقیقت مترشح ہو جاتی ہے کہ آریہ اس عظیم خاندان کا حصہ رہے ہیں جو خاندان ایران اور یونان سمیت ہندوستان اور سارے یورپ میں آباد ہے۔ نسلیات کے سب سے مشکل معاملے سمجھانے میں زبان ایک ایسا ثبوت فراہم کرتی ہے جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں بلکہ مختلف تمدنی نسلی، تاریخی اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ کشمیری بُرز (بھوج پتر) اور ''روسی بیرز'' ہم معنی الفاظ ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی روسی اور کشمیری ایک ہی خاندان کے فرد اور ایک ہی درخت کے پھل رہے ہیں۔ ہمارے کشمیر میں تسلیم شدہ اصول ہے کہ باپ کی وراثت بیٹے کو ملتی ہے نہ کہ بیٹی کو۔ بیٹی صرف اُسی حالت میں وراثت کی حق دار ہوتی ہے جب باپ کے اولادِ نرینہ نہ ہوں۔ اسی طرح متبنیٰ بنانے کی رسم ہمارے سماج میں آج بھی جائز ہے اور مروج بھی۔ یہ سماجی قوانین ویدک زمانے سے قبل آج تک ہماری عام سماجی زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ کشمیر میں اگرچہ کئی سو برس قبل اکثریت نے اسلام قبول کیا اس کے باوجود یہ رسومات اور سماجی قوانین مسلمانوں میں ایک زندہ حقیقت ہیں۔ اسی طرح گھر داماد بنانا بھی بہت ہی قدیم روایت ہے۔ یہ ایک ہندو رسم ہے جو کشمیر میں یکساں طور مروج ہے۔

مہابھارت شمالی ہندوستان کا مہا کاویہ (رزمیہ) ہے جب کہ رامائن، وسطی مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے بارے میں ہماری جانکاری میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ مہابھارت کے مطابق ناگ، کدرو کے بچے ہیں اور کشمیر کا کشپ کی نسبت ''کشیر'' یا ''کشپ مر'' نام پڑا۔ اس طرح ''کشمیر'' وجود میں آنے کے اسطور کا ''مہابھارت'' سے سیدھا میل ہے۔ کیونکہ ''گرڈ'' کے خوف سے ناگ، ستی سر میں چھپنے کیلئے آئے تھے۔ اس اسطور کے پیچھے جو نسلی تصادم کام کرتا ہے وہ اُس نسلی تصادم کا اسطور ہے جو

ہزاروں برس سے ذہنوں میں پلتا رہا اور یہ عیاں کرتا ہے کہ رزمیہ کال میں ''کروکشیتر'' کی جنگ میں کشمیر کے راجاوؤں نے کوروں کی طرف داری کی۔ اس بات کا اشارہ کلہن نے کسی تفصیل کے بغیر کیا ہے۔ ساتھ ہی بعض دیگر ذرائع بھی اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ کشمیر کے ہمسایہ ابھیسار (پونچھ اور جموں علاقہ) کے راجاؤں نے بھی اس جنگ میں کوروؤں کا ساتھ دیا۔ کشمیر کے راجہ کو فوج کے ساتھ ان ہی علاقوں سے گزرنا تھا جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ شمال مغرب کے ان راجاؤں نے مل کر کوروؤں کا ساتھ دیا ہوگا۔ اس طرح کلہن کے بیان میں صداقت کی کرن نظر آتی ہے۔ خود مہا بھارت میں بھی کشمیریوں کا ذکر " کھشر'' نام سے ہوا ہے جو کشمیری لفظ کے بہت قریب ہے۔ مہا بھارت کے بعد پاننی اور پانجلی نے بھی اس طرح کشمیر اور کشمیریوں کا نام لیا ہے۔ یہ وہی ہیں جن کو یونانی، کشمیری لکھتے ہیں۔ مہا بھارت میں ''کشمیر'' کا تذکرہ جنگ ختم ہونے بعد ''یدہشٹر'' کی تاجپوشی کے موقع پر بھی آیا ہے، جب کشمیر کے ایک ہمسایہ راجہ نے پانڈوؤں کو سونا بطور تحفہ پیش کیا۔ اس سونے کو ''پلیکا سونے'' کا نام دیا گیا ہے یعنی وہ سونا جو چیونٹیوں نے کھودا تھا۔ ایسا سونا پچھلے زمانے میں سندھ کے بالائی علاقے میں جمع کیا جاتا تھا۔ اسی طرح نام لئے بغیر یہ بھی کہا گیا ہے کہ شمالی علاقوں کے راجاؤں نے یدہشٹر کو ایک شال نذر کیا تھا۔ یہ راجے گاندھار یا کشمیر جن پد کے رہے ہوں گے۔ کیونکہ یہی علاقہ بہت پہلے ان اشیا کے لئے مشہور رہا ہے اور مہا بھارت میں جن مختلف ناگ راجاؤں کے نام آتے ہیں ان کے ناموں سے منسوب بہت سے مقامات آج بھی کشمیر میں موجود ہیں۔

مہا بھارت ہندوستان کی قدیم زندگی کے متعلق اپنی نوعیت کا واحد انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو بات مہا بھارت میں نہیں وہ کسی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔ اس کے اندر اگرچہ مختلف شعبوں کے حوالے دیئے گئے ہیں لیکن یہ حوالے ایک تاریخی

تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ سامنے لانے میں مدد کرتا ہے۔ مہا بھارت، مہاتما بدھ سے قبل تخلیق کیا گیا۔ بعض محققین اس کی تخلیق کا زمانہ مسیح سے قبل چھٹی صدی اور بعض دسویں سے بارہویں صدی مانتے ہیں۔ اس طرح مہا بھارت میں اڑھائی ہزار برس قبل سے زیادہ زمانے کا اشارہ ملتا ہے۔

''سبھا پرون'' باب میں ہے کہ راجہ کو شمال مغربی علاقے کے ایک راجہ نے ایسا دھاگا پیش کیا جو کیڑوں نے تیار کیا تھا۔ یہ دھاگا صرف ریشم ہوسکتا ہے اور شمال مغربی علاقے میں کشمیر کے بغیر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ریشم تیار کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ریشم کا سرچشمہ چین تسلیم کیا جاتا ہے لیکن لگتا ہے کہ ریشم چین سے کسی زمانے میں کشمیر آیا ہوگا یا ریشم، زعفران کی طرح ہماری روایت کا حصہ رہا ہو۔

ولر جھیل کے بارے میں بھی مہا بھارت میں ایک بلا واسطہ حوالہ ملتا ہے۔ ''سپرنہ ادھیائے'' میں واضح طور لکھا گیا ہے کہ مہا پدم، ناگ چوٹی پر ایک بڑی جھیل میں رہنے کیلئے گیا۔ بات واضح ہے کہ ہندوستان کیا، سارے ایشیا میں ولر سب سے بڑی جھیل ہے۔ کلہن بھی لکھتا ہے کہ گرڑ کے خوف سے ناگ ''شنکھ پدم سر'' میں پناہ گزین ہوگئے۔ یہ وہی ناگ ہیں جن کا ذکر ''سپرنہ ادھیائے'' میں شدھا اور پدم نام سے آیا ہے۔ ڈوگل لکھتا ہے کہ پدم ناگ وہی ہے جسے مہا پدم کہا گیا ہے اور جو ولر کا نگہبان ہے۔ ''سر'' کا ذکر پورانوں میں بھی ملتا ہے۔ بات کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ڈانگے لکھتے ہیں :

''جس جھیل کا ذکر پدم ناگ سرس یا مہا پدم ناگ سرس نام سے ہوا ہے، یہ وہی جھیل ہے جو کشمیر کی پہاڑی وادی میں ہے''۔

اسی طرح مہا بھارت میں زعفران کا ذکر بھی آیا ہے جو ابتدائے آفرینش سے کشمیر سے مخصوص ہے۔ کشمیر میں اگائی جانی والی چیزوں اور ولر کا بلا واسطہ ذکر ظاہر

کرتا ہے کہ رزمیہ دور میں کشمیر کا دیگر ممالک کے ساتھ رابطہ اور بھی استوار رہا ہوگا اور کشمیر کا نام رزمیہ دور اور پانی کے وقت بھی مروج تھا۔ ایک اور روایت دہرانے کے قابل ہے کہ ''شیوپت مت'' کا ذکر مہا بھارت میں بھی آیا ہے اور ایک زمانے میں یہی وقت کشمیر میں بھی مروج رہا ہے جس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں اس نے ''ترک شاستر'' کا روپ اختیار کیا۔ ''سرشٹی شاشتر'' پرناگ ارجن کے ''شنی واد'' اور ''مول سرواستہ وادن'' کا بھی گہرا اثر ہے جس پر اس وقت بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ مہا بھارت میں شامل تمثیل کے مطابق ''شیو پت مت'' کا پرچار پہلے ''شوشری کنٹھ'' نے کیا ہے اور دلچسپ بات ہے کہ شومت کے بانی کار اور شیوآ گمن کا تعلق بھی شری کنٹھ کے ساتھ ہے۔

''وایو پوران'' میں کشمیر کا ذکر یہ کہہ کر کیا گیا ہے کشیر (یعنی کشمیر) شمالی علاقوں کی قوموں میں شامل ہیں۔ ''وشنو پوران'' میں ''کشمیرا'' نام سے کشمیریوں کا ذکر کنک گن، تیل براسن، سیمرن، موھومت، سکندکن، سندھوساور، گاندھار، درشک، ابھیسار، اُتل، شوالہ اور بالکا کے درمیان ہوا ہے۔ جن مختلف قوموں اور قبیلوں کا ذکر آیا ہے، اُن تمام کی نشاندہی نہیں ہوسکی ہے لیکن بعض کے متعلق تفصیلات یوں ہیں۔ سندھو ساور، پنجاب میں سندھ پر بستے تھے۔ انہوں نے مہا بھارت کی جنگ میں خاص حصہ لیا ہے۔ گاندھاری شمال مغربی علاقوں کے مکین تھے، ان کا کشمیر کے ساتھ خاص تعلق رہا ہے۔ ایک وقت گاندھار کشمیر کا جن پد تھا۔ درشک وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اور نام سے بھی کیا جاتا تھا۔ یہ پونچھ سے اُدھر جموں علاقے میں رہتے تھے۔ اکثر درشکوں اور داوروں کا ذکر ابھیسار، مرکب لفظ کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ ابھیساری پونچھ علاقے کے مکین ہیں۔ مہا بھارت اور اُپنشد میں یہ علاقہ گھوڑوں کے لئے نہایت مشہور مانا گیا ہے۔ ارجن کی دِگ وجے میں اس علاقے کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہاں پہنچنا نہایت

مشکل ہے۔ ''وشنو پوران'' کا ایک پیراگراف مہا بھارت سے لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کشمیریوں کے ہمسایہ گُلٹا، ہُن ، پارشک اور وامن جیسے غیر مہذب اور خوفناک لوگ رہتے ہیں۔ اُن کے اندر پارکوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ یا تو فارس کے رہنے والے تھے یا وہ لوگ جو دریائے سندھ کے اُس پار رہتے تھے۔ درو، ابھیساری اس پوران میں نیچ ذات کے مانے گئے ہیں۔ خاص توجہ کے لائق یہ بات ہے کہ کشمیر کے ہمسایوں میں ویش اور شودر الگ الگ قومیں شمار کی گئیں ہیں جن کی بود و باش کا علاقہ شمالی مشرقی علاقہ ہے۔ لیسن کے مطابق شُدرک اور شودر ایک ہی ہیں۔ اُس نے یہ نام اُن لوگوں کو دیا ہے جو سکندر کی مشرقی فتح مندی کے دوران اُن کے آنے کی نشاندہی کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ قوم پنجاب میں بود و باش کرتی تھی۔

''برہت سمتہا'' اگر چہ پوران ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی بے پناہ اہمیت ہے۔ کتاب کے مصنف وراہ مہر نے کشمیریوں کا ذکر دردوں، کھشوں اور کِرتوں کے ساتھ کیا ہے جس میں صداقت جھلکتی ہے لیکن اُس کا کشمیر کو شمالی مشرقی خطے میں شامل کرنا گراں گزرتا ہے۔ وراہ مہر کی طرح چھٹی صدی عیسوی میں مدرک نے بھی کشمیر کا مختصر ذکر کیا ہے۔

پورانوں میں کشمیر کا ذکر مہا بھارت کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہئے تھا لیکن معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ لیکن اس میں حیرانی یا تعجب کی کوئی بات نہیں۔ رزمیہ دور کے بعد لیکن پورانوں کے دور سے قبل بدھ مت کشمیر پہنچا اور زبردست عروج حاصل کر گیا۔ کشمیر مہایان کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ پوران لکھنے والے بدھ مت سے کوئی لین دین نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ کیوں کر اُس دور میں کشمیر میں دلچسپی لیتے، وہ صحیفہ نگار تھے اور کشمیر کے متعلق تفصیلات فراہم کرنا اُن کی دانست میں غلط بات تھی۔ پوران خاص مقصد کے تحت لکھے گئے وہ کشمیر کا تذکرہ کیوں کرتے، اُن کے عقیدے

کے مطابق اس کی بہت کم گنجائش تھی۔ اتنے فراخ دل بھی نہ تھے کہ بدھ مت کا مرکز ہوتے ہوئے بھی کشمیر کا ذکر کرتے۔ کسی غیر مذہب کی سرپرستی اُن کے مطابق گناہ تھا اور اُس زمانے میں کشمیر کا ذکر بدھ مت کی سرپرستی کے برابر تھا۔

(کشمیری سے ترجمہ)

کتابیات:

1. Indo Aryan Languages:Dr.S.K.Chatterji

2. Hindu Civilisation: Dr. R.K. Mukarji.

3. River Names in RigVeda:M.A.Stein

4. Vedas:Friedrich. Max muller.

5.The Early History And Culture of Kashmir: Dr. S.K Ray.

6. The Rig Veda: Kaegi

7. Legends of Mahabharta: Dr.S.A. Dange.

8. Mahabharata, Critical: Bhandarkar Institute.

9.The Vishnu Puran: H.H.Wilson.

10. Encyclopedia fo Indian Culture: R.N.Saltore.

11. Bhagvat Purana: Naval Kishore.

12. Kalhana,s Rajtarangni: R.S Pandit and Stein.

13. History and Culture of Indian People: Bhart Vidya Bhawan, Mumbai.

14. Cultural Heritage of India: Dr. S.K. Chatterji.

☆......ایاز رسول نازکی

برٹش لائبریری اور کشمیر

لائبریری آف دی انڈیا آفس میں برصغیرِ ہند، برما اور دیگر متعلقہ علاقوں سے متعلق دستاویزات جمع کی گئی تھیں۔ یہ تمام دستاویزات اب برٹش لائبریری کا حصّہ ہیں۔ فارسی قلمی نسخوں سے متعلق لائبریری آف دی انڈیا آفس کا ایک کیٹلاگ ۱۹۰۳ء میں آکسفورڈ پریس نے شائع کیا۔اس کیٹلاگ کا ایک نسخہ راقم الحروف کی دسترس میں ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ انکشاف ہوا کہ ان فارسی قلمی نسخوں میں درجنوں ایسے بھی ہیں جن کا تعلق یا تو کشمیر سے ہے یا پھر کسی کشمیری سے۔ان قلمی نسخوں کی تفصیلات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بات پوری شدّت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر نے علم وادب، شاعری، تاریخ، معاشرتی زندگی، غرض زندگی کے لگ بھگ ہر شعبے میں قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ آج وہی کشمیری ان معاملات میں خود اپنے آپ سے اور اپنے اسلاف سے بے خبر ہے۔جن تین بزرگوں کا ذکر کرنا اس مضمون میں مقصود ہے، انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے علمی اور ادبی وجود کا لوہا منوایا تھا۔آج ان تین اصحاب سے اور ان کے کام سے نئی نسل بے خبر بھی ہے اور غافل بھی۔

کشمیر کی سماجی اور حکومتی زندگی سے فارسی بے دخل کر دی گئی اور آہستہ آہستہ ایک بڑی تہذیبی روایت سے ہمارا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ فارسی کی جگہ دوسری زبانیں معرضِ وجود میں آتی گئیں مگر بدقسمتی سے یہ زبانیں وہ مقام پیدا نہ کر سکیں جو فارسی نے کیا تھا۔اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر نے اپنے فارسی دَور میں جو

علمی فتوحات اپنے نام کیں وہ فارسی کے بعد کے دور میں کیوں دہرائی نہیں جاسکیں۔ فارسی دَور میں کشمیر نے نہ صرف شاعری اور ادب بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اسی کیٹلاگ میں علمِ طب پر کئی حوالے نظر سے گزرتے ہیں۔ تاریخ ایک اہم موضوع رہا ہے۔ یہاں جن تین اصحاب کا تذکرہ کیا جارہا ہے ان میں ایک صاحب خالص مورّخ کہلائے جاسکتے ہیں۔ دو دیگر اصحاب کا تعلق فنِ شعر سے بھی ہے اور زبان سے بھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیر اور کشمیریوں کے تعلق سے جتنا ادبی اور علمی اثاثہ دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے، اس کی کھوج کی جائے۔ کشمیر میں ایسے سینکڑوں مخطوطات آج بھی گھروں میں گرد وغبار میں اٹے، کاغذ کے کیڑوں کی غذا بنتے جارہے ہیں۔ انہیں محفوظ کرنے کی خاطر فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔

ا۔ سیف الدین سیف کشمیری

برٹش لائبریری میں ''مجموعۂ تصنیفاتِ آخوند سید سیف الدین کشمیری'' محفوظ ہے۔ سیف الدین کشمیری سیف تخلص کرتے تھے اور اس ''مجموعۂ تصنیفات'' کو تحریر کرنے کے دوران لدھیانہ میں بود و باش کرتے تھے۔ ان کی شاعری کچھ فارسی اور کچھ اُس دور یعنی انیسویں صدی کے وسط میں مستعمل کشمیری زبان میں ہے۔ آیئے ان کے مجموعۂ تصنیفات کا ایک جائزہ لیں۔

ا۔ قطعات سلامیہ با صنائع و رموزِ حروفِ سلام:

اس کے تحت ۲۳ قطعات فارسی زبان میں لکھے گئے درج ہیں۔ لفظ ''سلام'' کے اندر پوشیدہ معانی اور حروف کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مضامین ایک سے انیس قطعات پر پھیلے ہیں۔ قطعہ نمبر ۲۰ اور ۲۱ میں لفظ ''تحیّۃ''، قطعہ ۲۲ 'دعا' اور قطعہ ۲۳ یعنی آخری قطعہ میں لفظ ''الٰہی'' کی وضاحت کی گئی ہے۔ حاشیے پر تفصیلی تشریح بھی درج ہے اور بین السطور بھی وضاحتیں دی گئی ہیں۔ اس حصے کے اختتام پر نثر میں کہا گیا ہے کہ شاعر نے

پہلے گیارہ قطعات شدید بخار میں مبتلا ہونے کے دوران نظم کیئے اور آخر کے بارہ قطعات صحت یاب ہونے کے بعد شکرانے کے طور پر موزون کیئے۔ پہلے قطعے کا پہلا شعر ہے۔

سلام تافتہ انوار بسم از سینش
خواص اللّٰهش از لام برزدہ اعلام

اس کی کتابت شاعر نے خود کی اور تاریخ شوال ۱۲۷۰ھ کی رقم کی۔ (۱۸۵۴ء)

۲۔ مجموعے میں دوسری تحریر جو شامل ہے اس کا عنوان:۔

شرحِ منظوم چیستانِ مُغلّق

اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

حمد حق را کہ بے ھمال بود
لطف او حل ہر شکال بود

یہ ایک طویل قصیدے کی صورت میں تحریر ہے اور اس کی ردیف ''بُوْدْ'' ہے۔
''چیستان''، جو ایک 'پہیلی' کی صورت میں سُرخ روشنائی سے درج ہے اور جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

چیست آں جانور کہ ہیات اُو
گاہ بدرو گا ہے ہلال بود

قصیدے کی صورت میں جس تحریر کا ذکر اوپر آیا وہ اسی پہیلی یا چیستان کی شرحِ منظوم ہے۔ فارسی نثر میں حاشیے میں اور بین السطور روضاحتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

۳۔ مجموعے میں تیسرا اندراج زیرِ عنوان ''نظم و نثر غیر منقوط کہ برائے شاہِ جم جاہ شجاع الملک شاہ مرحوم ساختہ شدہ بوذ''۔

اس حصّے میں جو ایک طویل قصیدے کی صورت میں نظم کیا گیا ہے کئی لوازمات ملحوظِ خاطر رکھے گئے ہیں۔ ایک حصّہ تمام کا تمام بے نقطہ حروف پر مشتمل ہے۔

''عبارات منشور و منظوم در صنعتِ تجرید یعنی بے نقط بزبانِ عربی و فارسی مع دو بیت در صفتِ منقوط التمام یعنی مجرّ د۔''

اسی طرح دوسرے حصّے میں بھی ایک اور صفت پیدا کی گئی ہے۔

''قصیدہ مشتمل بر صنائعِ نادرہ یعنی تجرید و توسیل یعنی اولاً جملۂ حروف متفرقہ بعد ازاں دو دو بہم پیوستہ، پس سہ سہ تا دہ دہ تا موصّل التمام یعنی تمام بیت متّصل''

اس جز کے ساتھ بھی حاشیوں پر تشریح اور بین السطور وضاحتیں درج ہیں۔

۴۔......مجموعۂ تصنیفات کا اگلا حصّہ ''قصائد و غزلہا'' پر مشتمل ہے۔

حمد خداست مطلع دیوان اختراع

نعت نبیست مقصدِ انشاو ابتداع

قصائد اور غزلیات کے ساتھ حاشیے تشریحات سے بھر دیئے گئے ہیں۔

۵......اگلے حصّے میں مختلف اصحاب کو لکھے خطوط، تہنیتی پیغامات وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔

''ابیاتیکہ بطریق رقعات و تہنیت نامہ جات بزرگانِ و عزیزانِ نوشتہ''

پہلا تہنیت نامہ عید کی خوشی کے موقع پر لکھا گیا۔

''در تہنیتِ عید برائے بزرگی''

ایں عیدِ سعید خو ش موا عید

بر بخت مبارک مبارک

۶:۔اگلا اندراج خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے۔

''قصۂ وامق وعذرا بزبانِ کشمیری کہ با فارسی مختلط است''

فارسی آمیز کشمیری زبان میں قصۂ وامق وعذرا شاعر کے اپنے بیان کے مطابق اُس نے اپنی جوانی کے ایّام میں منظوم کیا جب وہ ابھی کشمیر میں ہی بود و باش کرتا تھا اور اس

مسودے کی کتابت اس نے خود لدھیانہ میں ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۷۰ء (ستمبر ۴۔۱۸۵۴ء) کو مکمل کر لی۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ مثنوی کشمیری زبان میں لکھی گئی بہترین مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا۔

خداوندا بکن شیدائے عشقم
بگرداں وامق عذرائے عشقم

مجموعہ تصنیفات آخوند سید میر سیف الدین کشمیری سیفؔ میں آخری تصنیف بھی کافی دل چسپ ہے اور کشمیری زبان و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک اہم دریافت ہے۔

۷۔ قواعدِ زبانِ کشمیری:

یہ تصنیف گرامر، قواعد وضوابط اور رائج الوقت کشمیری زبان کی لغت پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

''حمدِ بے حد بر خدای سخن بر زباں آفرین را کہ السّنہ مختلفہ و لغات گونا گوں آدمیاں را دلیلے''۔

سیف الدین کشمیری نے اس کے کشمیری حصے کے اختتام پر تحریر کیا ہے کہ انہوں نے یہ ڈپٹی کمشنر کی درخواست پر ترتیب دیا۔

میر سید آخوند سیف الدین کشمیری سیف کون تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (پروفیسر عبدالقادر سرورؔی) میں اِن کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں اسی دور میں مرزا سیف الدین کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مگر سرورؔی صاحب نے انہیں صرف تاریخ نویس کی حیثیت سے متعارف کیا ہے۔ ان کے بارے میں سرورؔی صاحب کی تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ ...... میرزا احد کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند میرزا سیف الدین کے

ذمے یہ خدمت ہوئی۔ اُسی زمانے میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کی حکومت حاصل کی تھی۔ میرزا سیف الدین ذہین اور طباع انسان تھے۔ فارسی میں انشاپردازی کی مہارت کے علاوہ اچھے خوشنویس بھی تھے۔ اُن کا اثر اور رسوخ انگریزوں کے پاس اور مہاراجہ کے دربار میں دونوں جگہ خاصا تھا اور اس اثر اور رسوخ سے کام لے کر انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ اور انگریزی حکومت کے تعلقات میں استواری اور خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریز عہدہ داروں اور یورپی سیاحوں سے بھی اُن کے اچھے مراسم رہتے تھے۔ بیرن ہیوگل نے اپنے سفرنامے میں ان کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

> ''میرزا سیف الدین نے بہ حیثیت اخبارنویس کے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء تک کی جو روداد یں لکھی تھیں وہ مرتّب صورت میں محکمۂ ریسرچ میں محفوظ ہیں۔ یہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہدِ حکومت کے سیاسی اور سماجی حالات کی اہم دستاویزات میں ہیں۔ ان کا ایک مستقل کارنامہ ان کی تاریخِ کشمیر ہے جو انہوں نے میجر جان ہیچر کی فرمائش پر ۱۸۵۹ء میں لکھی تھی۔ یہ تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کے نام سے موسوم ہے''۔

جیسا مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے یہ میرزا سیف الدین، ''مجموعۂ تصانیف'' کے شاعر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ دونوں حضرات کا زمانہ ایک ہے۔ مگر جیسا کہ ''مجموعہ تصانیف'' میں تحریر کیا گیا ہے سیف الدین کشمیری سیفؔ کسی وجہ سے کشمیر سے نقلِ مکانی کر کے لدھیانہ میں آباد ہو گئے تھے اور جیسا کہ صاحب تصانیف نے خود اقرار کیا ہے کہ ان کی جوانی تک کا زمانہ کشمیر میں گزرا جس کے دوران انہوں نے ''وامق وعذرا'' کشمیری مثنوی تحریر کی اور بعد میں لدھیانہ چلے گئے۔ لدھیانہ کے قیام کے دوران انہوں نے ''مجموعۂ تصانیف'' کو مکمل بھی کیا اور اس کی کتابت بھی خود کی۔

۲۔اسماعیل بینش کشمیری

بینش کشمیری تھے۔ ان کا نام اسماعیل تھا اور ''ریاضۃ الشعرا'' اور ''آتش کدہ'' دونوں تذکروں میں ان کا ذکر ہے۔ ان تذکروں کے مطابق وہ کشمیر سے دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔

''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے بینش کا ذکر کرتے ہوئے تاریخِ حسن اور صوفی کی ''کشمیر'' دونوں کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں ذرائع سے بھی ان کا نمونۂ کلام یا حالاتِ زندگی دستیاب نہیں ہو پائے۔ سروری صاحب کی کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مُلا بینش کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے۔ ''دانشمندِ بے نظیر بلاغت تخمیر، در سخن سنجی بسیار دلپذیر بود'' اور ڈاکٹر صوفی کا بیان ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھے۔ اُن کا کلام کسی نے نہیں دیا ہے۔ اُن کے حالات بھی دستیاب نہیں ہوئے۔

اب ذرا ان کے بارے میں برٹش لائبریری میں محفوظ ان کی کلیات کا ایک سرسری جائزہ لیتے چلیں۔ اِن کی کئی تخلیقات صف شکن خان (محمد طاہر) کے نام منسوب ہیں۔ صف شکن خان امرا میں سے تھے اور ۱۰۶۸ھ میں 'خان' کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے۔ وہ اورنگ زیب کی بادشاہت کے چھٹے سال میں (۱۰۷۴ھ۔۱۰۷۳ھ) میں کشمیر کے دورے میں اورنگ زیب کے ہم رکاب تھے۔ سرخوش نے لگ بھگ ۱۱۰۰ھ میں اپنے تذکرے میں صف شکن خان کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ ۱۱۰۰ھ تک آتے آتے بینش کا انتقال ہو چکا تھا۔

برٹش لائبریری میں بینش کی کلیات کی تفصیلات یوں ہیں:

۱۔بینش الابصار:۔ نظامی کی ''مخزن الاسرار'' کی بحر میں لکھی گئی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں سچے فقیر (سالک) کے خصائل کا بیان ہے۔ یہ مثنوی اورنگ زیب کے نام انتساب کر دی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلبن برجستہ باغِ نعیم

۲۔کلیات میں شامل دوسری تخلیق ہے'' گنجِ رواں''

بنامے کہ عالم گلستان اوست

بگنجِ رواں فلک شان اوست

اس میں اورنگ زیب کی شان میں قصیدے ہیں۔اس کے علاوہ مرزا محمد قاسم کرمانی دیوانِ کشمیر اور میر جمشید کا شانی (بینشؔ کے سرپرست) کے نام بھی قصیدے میں شامل ہیں۔چار موسموں کا تذکرہ اور ایک ساقی نامہ اس حصّے کے دیگر مشمولات ہیں۔

۳۔گلدستہ:۔اس مثنوی میں تخلیق کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی کشمیر اور لاہور کی تعریف وتوصیف ہے۔

گلدستۂ بوستانِ توحید

حمد ست بچشمِ صاحبِ دید

۴۔رشتۂ گوہر:۔اورنگ زیب کے نام انتساب کی گئی۔اس مثنوی میں ''امیر''اور گوہر'' کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔یہ عاشق ومعشوق مازندران کے''ساری''علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

نتواں یافت درخزینۂ شاہ

رشتۂ گوہرے چو بسم اللہ

اس مثنوی کے بارے میں درج ہے کہ یہ شاعر کے خمسے کی آخری مثنوی ہے۔

۵۔غزلیات:۔ردیف وار غزلیات نقل کی گئی ہیں۔

صبح شد ساقیؔ بساغر کن شرابِ کہنہ را

چوں فلک درگردش آور آفتابِ کہنہ را

۶۔آخر میں چند اور قصائد شاملِ کلیات ہیں۔ان میں سے کچھ امام عالی مقام ؑ کے حضور تحریر کئے گئے ہیں اور کچھ مرزا محمد قاسم (دیوان) جن کا ذکر اوپر آچکا اور صف شکن خان کی خدمت میں لکھے گئے۔

زلفِ تو زد بطالع ناساز ما گرہ
در کار آشنا فگند آشنا گرہ

کلیات کے آخری صفحے پر تحریر کیا گیا ہے۔

" George Curttenden, Moorshidabad, Oct., 4th , 1785"

۳۔خواجہ عبدالکریم بن خواجہ عاقبت محمود

خواجہ عبدالکریم بنِ خواجہ عاقبت محمود بن خواجہ محمد کشمیر سے شاہجہاں آباد منتقل ہو گئے اور یہاں انہوں نے بہ نفس نفیس نادر شاہ کی ہندوستان پر یلغار کے حالات و واقعات کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا اور اس دور کی پوری داستان راقم کی جو برٹش لائبریری میں ''بیانِ واقع'' نام سے موجود ہے۔اس میں نادر شاہ کے حملے سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات درج ہیں۔مزید نادر شاہ کے بعد محمد شاہ اور احمد شاہ کے دورِ سلطنت کا بھی تذکرہ ہے اور آخر میں مصنف نے ایران اور عرب میں اپنے سفر کی تفصیلات بھی درج کی ہیں۔اس تاریخی لحاظ سے بے حد اہم قلمی نسخے کا ایک نامکمل ترجمہ ایف۔گولڈون نے انگریزی زبان میں Memoirs of Khojeh Abdul kurreem ۱۷۸۸ءمیں کلکتہ سے شائع کروایا۔خواجہ صاحب نے کتاب کے آغاز میں اس چار ابواب پر مشتمل ہونے کی بات کہی ہے مگر لگتا ہے کہ آخر میں انہوں نے اس میں کل ملا کر پانچ ابواب تحریر کئے۔ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

بابِ اوّل:۔در ذکرِ عروج و خروجِ نادر سلطان و آمدن او بہ سمتِ ہندوستان

باب دوم:۔در بیانِ معاودت نادر السلطان بسوی ایران و رفتن بہ توران و خوارزم

دریں میان

بابِ سوم:۔ متضمن بعضے وقائع کہ از دارالسلطنت قزوین تا بندر ہوگلی کہ از بنادر متعلقہ سلطنت ہندوستان است مشاہدہ نمود

باب چہارم: درذکرِ بعضے از وقائع کہ از ابتدائی ورود بہ بندر ہوگلی تا وقت وصل و انتقال اعلیٰ حضرت کثیر المروّت پادشاہ درویش صفت محمد شاہ فردوس آرامگاہ، بظہور پیوستہ۔

بابِ پنجم:۔ درذکرِ بعضے امور کہ درایّام سلطنت احمد شاہ بہادر بہشت آمد۔

قلمی نسخے پر سال تحریر درج کیا گیا ہے۔

......سنۂ یک ہزار و یک صد و نود و نہ ھجر سیت''۔

اس طرح سے یہ نسخہ ۱۱۹۸ھ بمطابق ۱۷۸۴ء میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ کتابت خطِ شکستہ میں ہے اور کاتب کا نام درج نہیں کیا گیا۔

اب ایک نظر فرانسس گلاڈون کے ترجمے پر بھی ڈالتے چلیں۔ کتاب کی تشریح میں ناشر نے لکھا ہے'' ایک سربرآوردہ کشمیری، جو نادر شاہ کی ہندوستان سے فارس واپسی کے دوران اس کا ہم سفر رہا اور پھر وہاں سے بغداد، دمشق، ایلوپو، اور مکہ، مدینہ کی زیارت کرنے کے بعد جدّہ کی بندرگاہ سے ہوگلی بنگال بذریعہ سمندر روانہ ہوا۔ کتاب میں ہندوستان کی تاریخ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۴۹ء تک درج ہے، بنگال میں یورپی بستیوں کے بارے میں تفصیلات۔''

خواجہ عبدالکریم کشمیری نے کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے:

''عبدالکریم، فرزند خواجہ عاقبت محمود اور پوتا محمد بولا کی کا، سرزمینِ کشمیر میں تولد ہوا، جو کہ مثلِ بہشتِ بریں ہے جو ہمارے عظیم مورث کی جاگیر تھی اور ان ہی کی طرح اپنی سرزمیں سے ملک بدر کر دیا گیا۔ مگر ایک فرق یہ تھا کہ آدم نے جلاوطنی سے قبل گناہ کا پھل چکھا تھا۔

شعر:۔(انگریزی سے ترجمہ)

میرے دوست بن جاؤ کہ میں اس دور کا آدم ہوں
بجز ملعون ابلیس کے میرا کوئی دشمن نہیں ہوگا

اب میں پوری عاجزی کے ساتھ اُن سے مخاطب ہوتا ہوں جو حقیقی طور پر اہلِ علم ہیں جو علم و دانش میں کلی مہارت رکھتے ہیں اور اس بات پر آمادہ رہتے ہیں کہ دوسروں کی خامیاں معاف کریں۔

جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا، میں شاہجہاں آباد میں مقیم تھا۔ میں نے کافی دیر سے یہ خواہش کر رکھی تھی کہ میں مکّہ کی زیارت کروں اور دیگر متبرک مقامات پر حاضری دوں اور صاحبِ ایمان حضرات کی قدم بوسی کروں...... چونکہ ہر شخص جو دلجمعی سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کی چاہ کرتا رہتا ہے اپنی منزلِ مقصود پا جاتا ہے۔ ایسا ہوا کہ میری ملاقات مرزا علی اکبر سے ہوئی جو کہنے کو تو ریکارڈ کے محافظ تھے، مگر کسی کے وزیرِ اعظم نہ ہونے کے سبب اس عہدے کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے "جو اللہ کی مرضی ہو، ہو جاتا ہے، اور وہی اس کے اسباب بھی پیدا کرتا ہے۔" مرزا علی اکبر نے فوراً مجھے نادر شاہ کے حضور پیش کیا، جس نے وعدہ کیا کہ میں حج کو جا سکوں گا، میں اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

میرے اسفار سے واپسی پر، جو میرے اندازے سے کہیں زیادہ طویل ثابت ہوئے، میرے کچھ عزیز دوستوں (جن کی محبت اور شفقت کے مظاہر میرے تجربے میں بدرجۂ اتم موجود

تھے) نے صلاح دی کہ میں اپنے سفر کی روداد قلم بند کروں، جس میں فارس کے شاہی دربار کی تفصیلات ہوں اور ساتھ ہی ہندوستان کے بے حد دل چسپ واقعات کا ذکر ہو۔ جب سے کہ میں ہوگلی میں وارد ہوا، یہ سب میں نے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں تحریر کرنے کی سعی کی ہے۔"

اس طرح یہ سفر نامہ شروع ہوتا ہے اور قاری کی پوری دل چسپی کا باعث بنا رہتا ہے۔ عبدالکریم الکشمیر ی کی اس یادداشت سے نہ صرف اس زمانے کے ہندوستان کی سیاسی، مجلسی زندگی کا ایک چشم دید تذکرہ سامنے آتا ہے بلکہ نادرشاہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھتا دکھائی دیتا ہے اور سفر کے دوران نادرشاہ کئی مقامات پر اپنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کئی یورپی مورّخوں نے خواجہ عبدالکریم الکشمیر ی کی اس کتاب کو نادرشاہی دَور کو سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ اہم کتاب تصوّر کیا ہے۔

خواجہ عبدالکریم الکشمیر ی ولد خواجہ عاقبت محمود ولد خواجہ محمد بولا کی کے نادرشاہ کے حضور پیش ہونے سے قبل کشمیر کے قیام کے دوران کے حالات زندگی کے بارے میں شاید کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس بات کا عندیہ بھی نہیں ملتا کہ ہوگلی وارد ہونے کے بعد اور اس کتاب کی شیرازہ بندی کے بعد ان کی زندگی کہاں اور کیسے گزری۔

☆......کے۔ڈی۔مینی

جموں کے محل، قلعے اور سرائیں

مبارک منڈی کمپلیکس :

کسی زمانے میں مبارک منڈی کمپلیکس کو ڈوگرہ مہاراجاؤں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا۔ یہ کمپلیکس 165 برس قبل تعمیر ہونا شروع ہوا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ کمپلیکس ڈوگرہ عہد کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ پہلے پہل یہ خوبصورت محل اور اضافی عمارات پر مشتمل تھا۔لیکن 47ء کے بعد اتنے بڑے کمپلیکس کی ضروری دیکھ ریکھ نہ ہوسکی،جس کے باعث کمپلیکس میں بہت سی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئیں۔ 47ء سے قبل یہ ڈوگرہ حکمرانوں کی رہائش گاہ، دربار لگانے اور حکومت کے دیگر انتظامات چلانے کے لئے عملے کے دفاتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔اس مقام کو بڑی کھوج کے بعد منتخب کیا گیا تھا جہاں سے توی دریا، باہو قلعہ اور شہر کا بڑا حصہ دکھائی دیتا تھا۔کمپلیکس کو عمارت کے گروپوں کی صورت میں تعمیر کیا گیا ہے جو دریا کے ارد گرد تعمیر کی گئیں ہیں۔ ہر ڈوگرہ حکمران نے اس کمپلیکس میں ضرورت کے مطابق اضافہ کیا ہے۔ یہاں سے ہی ڈوگرہ حکمران ساری ریاست پر حکومت کرتے تھے۔کچھ عمارتیں ڈوگرہ شاہی خاندان کی رہائش کے لئے وقف تھیں جب کہ بڑے ہال اور گیلریاں سرکاری کام کاج کے لئے تھیں۔ابھی کچھ برس قبل مبارک منڈ کمپلیکس کو ہیرٹیج بلڈنگ قرار دیا گیا ہے اور اس کی ضروری مرمت اور بہتری پر کام جاری ہے۔

باہوقلعہ :

یہ جموں کا پرانا قلعہ ہے جس کو راجہ وینسا وسا کے بیٹے اور راجہ کے بھائی باہو لوچن نے تعمیر کرایا اور اپنے نام پر قلعے کا نام باہوقلعہ رکھا جو باہو قصبے کا حکمران ہوا کرتا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس قلعے کی خستہ عمارت کو دوبارہ تعمیر کروایا تھا اور اس کو ڈوگرہ فوج کی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ قلعہ مہا کالی یا باہو والی ماتا کے مندر کے لئے بھی جانا جاتا تھا۔ اس قلعے سے توی دریا سے لے کر پورے جموں شہر پر نظر رکھی جا سکتی ہے جس کا اس مقام سے نظارہ قابلِ دید ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ قلعہ تب وجود میں آیا جب کچھ تنازعات کے باعث ڈوگرہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یعنی باہو ریاست اور جموں ریاست۔ ان دونوں ریاستوں کو دریا توی ایک دوسرے سے جُدا کرتا تھا۔

ریاسی کا پرانا محل اور اُس کی دیواری تصاویر :

راجہ رنجیت دیو کی حکمرانی سے قبل ریاسی ایک خود مختار ریاست ہوا کرتی تھی جہاں سیال راجپوت حکومت کرتے تھے۔ یہ علاقہ پانچ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ ریاسی قصبے میں راجہ کا محل ہوتا تھا۔ 1926ء میں ودیا رتن کھجوریہ کو ریاسی کے پرانے محل کی دیواروں پر منقش تصاویر کا ایک شاندار مجموعہ ملا تھا۔ ان تصاویر کا موضوع آدھا مذہبی اور آدھا آرائشی تھا۔ کچھ مذہبی تصاویر واقعی شاہکار ہیں۔ اُن میں ایک راجہ کے دربار کا منظر بھی ہے۔ اس کے علاوہ شو، پاربتی، گنیش جی اور سورج دیوتا کی تصویریں بھی ملی تھیں۔ موٹے طور پر اس محل کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے یعنی مردوں کے لیے رہائشی کمرے اور عورتوں کے لئے کمرے، جبکہ بائیں جانب کے حجرے حکمرانوں کے خاندان کے لئے ہوا کرتے تھے۔

امیر محل میوزیم :

لال پتھروں اور ریت کی یہ خوبصورت ترین عمارت ہے جہاں سے پورا جموں علاقہ نظر آتا ہے۔ شمال کی طرف شوالک کے سرسبز پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ سامنے دریائے توی بہہ رہا ہے اور توی کے اُس پار باہو کا منظر قابلِ دید ہے۔ کسی زمانہ میں محل مہاراجہ ہری سنگھ کے والد راجہ امر سنگھ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کو میوزیم میں بدل دیا گیا ہے۔ ڈوگرہ عہد اور ثقافت کی نایاب چیزیں یہاں ملتی ہیں۔ اس وقت اس محل کو ہری تارا چیریٹیبل ٹرسٹ دیکھ رہا ہے۔ میوزیم میں مہاراجہ کا سونے کا تخت بھی موجود ہے جس پر ڈوگرہ حکمران تخت نشین ہوا کرتے تھے۔ یہاں ڈوگرہ پینٹنگز کی گیلری بھی ہے جسے 'نل دھیم ینتی' کہا جاتا ہے۔ 25 ہزار کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری بھی یہاں موجود ہے۔ اس محل کے ساتھ خوبصورت باغ ہے جہاں سیاح سستاتے ہیں۔ یہ جموں کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک ہے۔

قلعۂ راجوری :

یہ قلعہ گاؤں دھنور کی اونچی پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے چاروں جانب راجوری کے علاقے نظر آتے ہیں۔ یہ قلعہ میاں ہاٹھو نے 56-1846ء کے درمیاں بنوایا تھا۔ جب وہ راجوری کا مختار ہوا کرتا تھا۔ قلعے کا تہہ خانہ اور برج بھُر بھرے پتھر کی سلوں سے بنائے گئے ہیں جب کہ اندرونی عمارتوں میں اینٹوں کا استعمال ہوا ہے۔ قلعے کا خاص دروازہ فصیل کی طرف غیر عمودی سمت پر تعمیر کیا گیا ہے اور اس کا رُخ جنوب کی جانب ہے۔ قلعے کے برجوں میں بڑی بڑی توپیں نصب کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کسی دور میں قلعے کی چھتیں مسمار کردی گئیں تھیں۔ آج بھی قلعے کی دیواریں پختہ اور مضبوط ہیں۔ یہ قلعہ علاقے میں لگان کی صورت میں وصول کی گئی جنس کو رکھنے، قیدیوں کو رکھنے اور فوج کی پناہ

گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔

قلعۂ بھیم گڑھ، ریاسی :

قصبہ ریاسی کے قریب جنوب کی جانب بھیم گڑھ قلعہ واقع ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد تب رکھی گئی تھی جب مہاراجہ رنجیت دیو سے قبل اس علاقے کے حکمران سیال راجپوت ہوا کرتے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں اس قلعے کے سامنے والے حصے کی اونچائی تقریباً آٹھ فٹ بلند کی گئی تھی اور عقبی حصے میں بھی تعمیرات ہوئیں تھیں۔ بعد میں میاں موٹا کے پوتے میاں بھوپ سنگھ نے گلاب سنگھ کے خلاف بغاوت کی تو زورآور سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور پھر دھاوا بول کر قبضہ کیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں وزیراعظم ویکفیلڈ کے حکم پر قلعے کے اندر اور باہر بہت سی عمارتیں منہدم کردی گئی تھیں۔ لیکن آج بھی قلعۂ بھیم گڑھ وقت کے وار سہتا ہوا کسی نہ کسی حالت میں قائم ہے۔

چنگس سرائے :

چنگس سرائے صوبۂ جموں میں مغل دور کی ایک اہم ترین عمارت ہے جو آج بھی اصلی حالت میں ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر جن کا کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے 1429ء میں بہرام گلہ میں انتقال ہو گیا تھا، اُن کے جسدِ خاکی کے ایک حصے کو اس سرائے میں دفن کیا گیا تھا۔ مغل سرائے چنگس ضلع راجوری میں جموں پونچھ شاہرہ پر واقع ہے۔ یہ مقام جموں سے 131 کلومیٹر کی دوری پر نوشہرہ اور راجوری کے درمیان پڑتا ہے اور پرانے مغل روڑ پر پانچواں پڑاؤ تھا جہاں مغل کاروان کشمیر جاتے اور آتے ہوئے قیام کیا کرتے تھے۔ سرائے کمپلیکس آج بھی چیڑ کے جنگل سے گھری ہوئی ہے۔ اس علاقے کا اصلی نام خان پور تھا۔ جب چنگس سرائے تعمیر ہوئی تو علاقے کا نام بھی چنگس ہو گیا۔ یہ سرائے 365 سال پرانی ہے جسے ایرانی انجینئر علی خان نے تعمیر کیا تھا۔

1995ء میں مغل سرائے کی حالت نہایت خستہ تھی تو اُس وقت کے مقامی ایم۔ایل۔اے اور وزیر محمد شریف طارق نے اس عمارت کی ترقی کے لئے خود بھی مالی معاونت کی اور آثار قدیمہ کے محکمہ سے بھی رقومات حاصل کر کے اِسے اصلی حالت میں لایا ہے۔ یہ سرائے 44 چھوٹے حجروں، تین دالانوں، مسجد شریف اور وہ مقام جہاں شہنشاہ کی آنتیں دفن ہیں، پر مشتمل ہے۔ بڑا دروازہ مغرب کی طرف ہے جبکہ ایک دروازہ دریا کی جانب بھی کھلتا ہے۔ 2010ء کے بعد جب سے وادیٔ کشمیر کو ملانے والی مُتبادل سڑک مغل روڑ کھلی ہے، چنگس سرائے کے قریب پھر سے رونقیں لگنے لگی ہیں کیونکہ کشمیر سے آنے جانے والے سیاح اور مسافر یہاں رُکتے اور سرائے کا نظارہ کر کے آگے جاتے ہیں۔

نوشہرہ قلعہ :

یہ قلعہ راجوری کی سُکھ توی ندی کے کنارے ایسی اونچی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے جو شمال سے جنوب کی جانب ڈھلوان پر واقع ہے۔اس وقت قلعہ کی فصیل اور اندر کی عمارتیں خستہ حالت میں ہیں۔صرف مستطیل نما سرائے جس کے تین اطراف حجروں کی قطاریں ہیں، وہ اچھی حالت میں ہے۔قلعہ ڈیڑھ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔شمالی نصف حصے میں تین عمارتیں ہیں جو خزانہ، تھانہ اور بارود خانہ کے لئے وقف تھیں۔ قلعے کی ڈیوڑھی عمارت سازی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں قلعے کی مرمت اور وسعت کا کام ہوا تھا۔ قلعے کے قریب مغلیہ دور کی مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ جب کہ ایک کمرہ جو شیشوں سے بنایا گیا تھا اُسے نور محل کہتے ہیں، جہاں شہنشاہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے اپنی بیگم نور جہاں کے ساتھ قیام کیا کرتا تھا۔ پہلے پہل یہ قلعہ شہنشاہ اکبر کے حکم پر راجوری کے راجہ تاج الدین نے تعمیر کرایا تھا، بعد میں ایرانی انجینئر علی مردان خان نے اسے وسعت اور خوبصورتی عطا کی تھی۔

تھنہ منڈی سرائے :

راجوری شہر سے 24 کلومیٹر کی دوری پر تھنہ منڈی میں ایک اور مغل سرائے واقع ہے جو قصبہ تھنہ کے قریب سڑک کے ساتھ ہے۔ یہ کشمیر جانے والے مغل کاروانوں کے لئے ایک بڑا پڑاؤ تھا جہاں کاروان کچھ دن آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوتا تھا۔ سرائے میں چھتیس حجرے، دودالان اور ایک حمام ہے۔ سرائے میں مشرق کی طرف داخلہ ہے۔

نادپور سرائے :

یہ مغل سرائے نوشہرہ سے دس کلومیٹر دُور جموں پونچھ شاہراہ پر واقع ہے۔

قلعہ منگل دیہی :

ضلع راجوری کا قلعہ منگل دیہی ڈوگرہ عہد کی ایک اہم یادگار ہے۔ اس قلعے کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہاں سے سندر بنی، نوشہرہ، بیجا بائیں، لگیوٹ، لمبڑی، بیری پن وغیرہ تمام علاقے دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں قلعہ تعمیر کیا گیا ہے اُس کی اونچی چوٹی پر پرانے زمانے کا منگلا دیوی کا مندر بھی قائم ہے۔ قلعہ 40 کنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور قلعے کی دیواریں 30 فٹ سے 85 فٹ اونچی ہیں۔ قلعے میں دو کنوے ہوا کرتے تھے جو اَب بند کردیئے گئے ہیں۔

یہ قلعہ جو نوشہرہ سیری روڈ کے ساتھ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے، راجہ گلاب سنگھ کے بھائی راجہ دھیان سنگھ نے اپنی پونچھ چبال جاگیر میں 40-1827ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا جہاں ڈوگرہ فوج اور جنگی مجرموں کے علاوہ انتظامیہ کے کارکن بھی رہائش کیا کرتے تھے اور عوام سے جنس کی صورت میں وصول ہونے والے مالیئے کا غلہ بھی رکھا جاتا تھا۔

1977ء کے واقعات میں علاقے کے تمام لوگوں نے عرصے تک قلعہ منگل

دیہی میں پناہ لی تھی۔ آج کل نوراترا کے دِنوں میں یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے جس میں سندربنی، نوشہرہ لمبڑی، بیری ین وغیرہ کے ہزاروں یاتری حصہ لیتے ہیں۔

قلعہ کھمبہ :

قلعہ کھمبہ نوشہرہ سے چالیس کلومیٹر دور اور جھنگڑ سے بارہ کلومیٹر کے فاصلہ پر عین کنٹرول لائن پر واقع ہے اور پہاڑی ٹیلے پر تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ 250 میٹر لمبا اور 60 میٹر چوڑا ہے۔ قلعے میں داخلے کی ڈیوڑھی جنوب کی طرف ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قلعہ پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اُن کے وزیراعظم راجہ دھیان سنگھ نے اپنی جاگیر پونچھ چبال کے تحفظ کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کھمبہ سے تھوڑا دُور راستے میں پانچ پرانے مندروں کے آثار بھی ملتے ہیں جو کشمیر کے پاندریٹھن مندروں سے مشابہ ہیں، جن کی بناوٹ سے کشمیری طرز کی جھلک ملتی ہے۔ علاقہ راجوری میں اسی طرح کا ایک اور قلعہ لام دریا کے کنارے پر بھی واقع ہے۔

پنج ناڑہ مندر :

پنج ناڑہ کے مقام پر پانڈو مندر اور پانڈو کُنڈ کے آثار ملتے ہیں جن سے کشمیری فن تعمیر کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ مندر کشمیر میں اوڑی کے علاقہ بونیار اور ڈیلٹار مندروں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں پانڈو مندر کے علاوہ آس پاس 55 سل بنے ہیں۔ اس مندر کو وقت کی آندھی نے بُری طرح متاثر کیا ہے اور دُور دراز علاقے میں واقع ہونے کے باعث یہاں بہت کم توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے مطابق یہ مندر نویں یا دسویں صدی عیسوی کا ہے اور راجہ جے پادہ کے عہد کے چاندی کے سکے بھی یہاں سے دریافت ہوئے ہیں۔

موتی محل، پونچھ :

موتی محل پونچھ کی ایک خوبصورت ترین عمارت ہے جسے مقامی ڈوگرہ سکھ

دیوسنگھ اور راجہ جگت دیوسنگھ نے 36-1926ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔محل کا نام پونچھ کے پہلے ڈوگرہ راجہ موتی سنگھ کے نام پر موتی محل رکھا گیا تھا۔ یہ محل 125 رکنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور اُس زمانہ میں نو لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا تھا جسے سکاٹ لینڈ کے انجینئروں نے سکاٹس فنِ تعمیر کے تحت بنایا تھا۔ یہ محل شہر کے شمال مغرب کی طرف شینہ چُنگاں پہاڑ کے دامن میں ایسی جگہ بنایا گیا ہے جہاں سے پونچھ شہر کے علاوہ پیر پنچال اور توئی پیر کے پہاڑوں تک نظر جاتی ہے۔

2005ء کے زلزلے میں اس محل کو زبردست نقصان پہنچا تھا لیکن اس کی بحالی کے اقدام اُٹھائے گئے اور اب یہ محل نہ صرف قابلِ رہائش ہے بلکہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہے۔

موتی محل تین منزلہ عمارت ہے۔گراؤنڈ فلور میں داخلے والا ہال، دربار ہال، بلیرڑ روم، لائبریری کا کمرہ، باتھ روم، کچن، بٹلرس کے کمرے، ایک بڑا ہال اور رہائش کے کمروں پر مشتمل ہے۔چھت کو کشمیری ختم بند لکڑی کے کام سے دلکش بنایا گیا ہے۔پہلی منزل میں راجہ صاحب کا بیڈ روم ہے جس کے ساتھ آرام کے لئے کمرہ اور بڑا ٹیرس ہے جہاں سے دُور دُور تک پونچھ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔راجہ صاحب کے کمرے کے دائیں اور بائیں جانب کمروں کے دوسیٹ ہیں جو رانیوں اور بچوں کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے۔جبکہ راجہ صاحب کے بیڈ روم کے پیچھے کمروں کے دوسیٹ ہیں جو کشمیر ہاؤس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔یہاں سے شینہ چوگاں پہاڑ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح دوسری منزل پر بھی چار کمروں کا سیٹ بنا ہے۔موتی محل کے پیچھے رانی محل ہے جو ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔رانی محل کا دروازہ دربار ہال کی طرف کھلتا ہے، جہاں رانی صاحبہ اپنا دربار لگایا کرتی تھیں۔

بلدیومحل :

بیسویں صدی کے آغاز میں بلدیومحل پونچھ کی سب سے دلکش عمارت مانی جاتی تھی۔محل کواُس وقت کے مقامی ڈوگرہ راجہ بلدیوسنگھ کے نام پر بلدیومحل نام دیا گیا تھا،جس نے 1892ء سے 1918ء تک پونچھ پر حکومت کی۔ یہ محل دریاے بیتار کے کنارے وسیع میدان میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ دومنزلہ عمارت کشمیری اور انگلش فنِ عمارت سازی کا بہترین نمونہ ہے۔اس کا گراؤنڈ فلور 21 کمروں پر مشتمل ہے جن میں کانفرنس ہال، دربار ہال، آرام کے لئے کمرے، راجہ صاحب کا نجی دفتر، سٹاف روم اورسیکورٹی روم شامل ہیں۔جبکہ پہلی منزل پردس کھلے اور ہوادار کمرے ہیں جو غلام گردش کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں راجہ صاحب اور اُن کے خاندان کے لوگ قیام کرتے تھے۔اس محل کے ساتھ ایک اورمحل بھی ہے جسے پدم محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جسے راجہ بلدیوسنگھ کے تیسرے بیٹے پدم دیوسنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔

2005ء کے زلزلے میں یہ عمارت بُری طرح متاثر ہوگئی تھی اور اسے رہنے کے لئے ناقابل قرار دیا گیا۔

قلعہ مبارک، پونچھ :

پونچھ قلعہ کوعہد رفتہ کی ریاست پونچھ کے تشخص کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تقریباً ڈھائی سوسال پرانا یہ قلعہ آج بھی قائم ہے جس نے زمانہ کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔لیکن 2005ء کے زلزلے میں اس کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا تھا اور دیواروں میں دراڑیں آگئیں تھیں لیکن اُس وقت کے وزیراعلیٰ غلام نبی آزاد نے موقع پر جائزہ لینے کے بعد 2007ء میں اس کی بحالی کے لئے 796 لاکھ روپے کا پروجیکٹ منظور کیا جس پراب کام چل رہا ہے۔

قلعہ مبارک پونچھ شہر کے جنوب میں ایک ٹیلے پر 21 کنال رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ایسی جگہ تعمیر ہوا ہے جہاں سے پورے پونچھ علاقہ پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔ قلعہ 49 کمروں، چار بڑے ہال، وارانڈا، توشہ خانہ، گول گھر یا راجے کا نجی دربار، مندر، مسجد اور گوردوارے پر مشتمل ہے جس میں داخل ہونے کے لئے شمال اور جنوب سے تین راستے ہیں۔

اس قلعے کی بنیادیں مسلمان عہد میں راجہ عبدالرزاق راٹھور (1701-47ء) میں رکھی گئیں تھیں۔ پہلے اور جنوبی حصے کو 1760-83ء کے در میان راجہ رستم خان راٹھور نے تعمیر کرایا تھا۔ دوسرا حصہ شمال کی جانب (1819-46ء) میں سکھ عہد میں تعمیر ہوا جبکہ تیسرا اور سامنے والا حصہ ڈوگرہ عہد میں بنایا گیا تھا۔ 2017ء میں بلد یو محل میں ضروری مرمت کے بعد یہ محل ایک بار پھر اپنی دلکشی کے باعث پونچھ شہر کی اہم عمارتوں میں شامل ہو گیا جو یہاں کے تمدنی ورثے کی علامت مانا جاتا ہے۔

شیش محل، پونچھ :

شیش محل پونچھ کے آخری راجہ جگت دیو سنگھ نے اپنے بھائی مرحوم راجہ سُکھ دیو سنگھ کی بیوہ رانی اٹلیا کے لئے تعمیر کرایا تھا جنھوں نے 1936ء میں یہاں شفٹ کیا تھا اور اسے رانی اٹلیا محل کا نام دیا تھا جو بعد میں شیش محل کر دیا گیا۔ یہ محل پونچھ شہر کے مغربی حصے میں وزیرِ وزارت ڈی۔ سی آفس کے قریب واقع ہے۔ یہ نو کنال اراضی پر پھیلا ہوا ہے اور 18 بڑے چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے جس میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، میٹنگ ہال، ڈریسنگ روم، غلام گردش اور دیگر کمرے شامل ہیں۔ عمارت تراشے ہوئے پتھروں، سُرخی، چونا، لکڑی کے کام، سفید اور کالی ٹائلوں اور مختلف رنگوں کے شیشوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ 2005ء کے زلزلے میں اس عمارت کو

بھی زبردست نقصان پہنچا تھا، جس کی بحالی کا کام جاری ہے۔اس وقت شیش محل کمپلیکس میں لڑکیوں کے لئے ہائر سیکنڈری سکول قائم ہے۔

مندرجہ بالا عمارتوں کے علاوہ سخی میداں مینڈھر پونچھ میں پرانے زمانہ کی کسی بڑی عمارت کے آثار ملتے ہیں جسے مینڈھر کے عوام پانڈو محل بتاتے ہیں جہاں بن باس کے زمانہ میں پانڈو آئے تھے اور بھیم سین نے اپنی ماں کُنتی کی خواہش پر یہاں ایک اونچا برج تعمیر کیا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ عمارت پانڈوؤں کے دور میں تعمیر ہوئی ہو لیکن سینکڑوں برس بعد جب اس علاقے میں بودھ دھرم کے لوگ آباد تھے، تو پنجاب کے ایک یونانی راجہ میندر یہاں آئے تھے اور اس مقام پر ایک بودھ عالم کے ساتھ مذاکرہ کر کے بدھ دھرم اختیار کیا تھا۔میندر نے اس واقعے کی یاد میں یہاں میندر و یہار بھی تعمیر کرایا تھا جس کے باعث علاقے کا نام بھی میندر ہو گیا جو آگے چل کر مینڈھر ہوا۔

اسی طرح علاقہ مینڈھر میں گانی کے مقام پر ایک ایسے قصبے کے آثار موجود ہیں جن سے یونانی اور بدھ تہذیب وتمدن کے سراغ ملتے ہیں۔یہاں تراشے ہوئے بڑے پتھر کا ایک تیر نما حصہ ملا ہے جس پر مہاتما بدھ کا چہرہ بنا ہوا ہے جو قریب ہی واقع لوہر دیو مندر میں نصب کیا گیا ہے۔

اُدھر علاقہ سورن کوٹ میں اُجالی باؤلی ایک ایسا مقام ہے جہاں باؤلی کے اردگرد کشمیری فنِ سنگ تراشی کے بُت ملتے ہیں اور شاردا لپی میں لکھے ہوئے کچھ الفاظ بھی محفوظ ہیں جہاں بندہ سنگھ بہادر نے ہرنی کا شکار کیا تھا اور ہرنی کے پیٹ سے بچے باہر آ گئے تھے جنھیں دیکھ کر بندہ بہادر جوگی بن گئے اور بعد میں دسویں گورو گوبند سنگھ نے انہیں بندہ بیراگی یا بندہ سنگھ بہار کا خطاب دیا۔

قلعہ گنج پت :

ضلع رام بن میں دریائے چناب کے اُس پار چندر کوٹ کے سامنے ایک اہم قلعہ گنج پت واقع ہے جو علاقہ سراج میں پڑتا ہے۔اس قلعے کو سب سے پہلے مقامی راجپوت سرداروں نے تعمیر کرایا تھا۔قلعہ ایک ایسے اونچے پہاڑ پر واقع ہے جہاں سے سارے علاقہ پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔عہدِ رفتہ میں راجپوت سردار یہاں سے اپنی حکومت چلایا کرتے تھے۔یہاں خطرناک مجرموں اور باغیوں کو قید کیا جاتا تھا کیونکہ اس قلعے سے فرار ممکن نہ تھا۔قلعے میں مہا کالی مندر بھی ہے جہاں رام بن کے عقیدت مند یاترا کے لئے آتے ہیں۔ابھی حال ہی میں قلعہ گنج پت کے مندر کی مرمت کی گئی ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے قلعے کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں وسعت دی تھی۔اُنھوں نے ریاست بمبھر کے آخری راجہ سلطان خان کو گرفتار کر کے اسی قلعے میں قید کیا تھا جو یہاں ہی فوت ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ ڈوگرہ عہد میں کچھ دیر کے لئے شیخ محمد عبداللہ کو بھی یہاں رکھا گیا تھا۔1858ء میں راجوری کے گورنر میاں ہاٹھو سنگھ (جو مہاراجہ گلاب سنگھ کی خادمہ کے بطن سے تھے) نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے قتل کی سازش کی تھی۔لیکن اس سازش کو عمل میں لانے سے قبل ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ گنج پت میں قید کیا گیا تھا۔

قلعہ بھدرواہ :

معروف یورپی سیاح جی۔ٹی۔وائن اپنے سفر نامہ بھدرواہ 1839ء میں لکھتے ہیں کہ بھدرواہ کے بازار کا رخ جنوب کی جانب ہے اور قلعہ شمال کی طرف واقع ہے۔یہ ایک وسیع اور مربع نما قلعہ ہے جو زیادہ تر سلیٹی پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے اور دوسرے پہاڑی قلعوں کے مقابلہ میں عجیب وغریب مقام پر بنایا گیا ہے۔اس کے

پیچھے جنگلات والے پہاڑ ہیں۔ جنگلات کے پسِ منظر میں کوہ کیلاش کے دامن میں اونچے مقام پر ہونے کے باعث یہ قلعہ وادی بھدرواہ کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔ اس قلعہ کا نام رتن گڑھ ہے جس میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک فوج رہائش پذیر ہوتی تھی۔ یہ قلعہ صدر بازار، بھدرواہ سے ایک میل مغرب کی جانب رُنتہ گاؤں میں واقع ہے۔ بازار سے قلعہ کی طرف جاتے ہوئے چڑھائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روایت ہے کہ اس قلعہ کی تعمیر راجہ سمپت پال والی بھدرواہ کے دورِ حکومت میں ہوئی تھی۔ اس راجہ نے قلعہ کو اپنے والد میدانی پال کے نام پر میدانی پور رکھا۔ اس قلعہ کی پرانی تاریخ کے بارے میں کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن بھوشن کول ساکنہ بھدرواہ کے مطابق مسٹر جگن ناتھ کوتوال کے پاس قلعے کے بارے میں ایک پٹہ موجود ہے جس کے مطابق یہ قلعہ چمبہ کے راجہ نے 1731ء بکرمی (1675ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ جی۔ ٹی۔ وائن نے 1722ء میں بھدرواہ کا دورہ کیا تھا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ قصبہ کے مغرب میں تین سو فٹ کی بلندی پر ایک قلعہ ہے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے جس کے ہر کونے میں بُرجیاں ہیں۔ نشانہ بازی کے لئے دیواروں میں سوراخ رکھے گئے ہیں۔ یہاں چار توپیں گاڑھی جاتی ہیں اور پچاس فوجی قیام کرتے ہیں۔ وائن لکھتے ہیں کہ لنگر اندازی کا عمل قلعہ کے شمالی میدانی حصہ میں ہوتا ہے۔ سفر کرنے والوں کو رہائش کی سہولیات میسر ہیں۔ اس قلعہ کے قریب ایک مسجد اور زیارت سعد صاحب واقع ہیں۔ یہ قلعہ رتن گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں فوجی محافظوں کے پاس تھا۔ قلعہ کی عمارت مغلیہ طرزِ تعمیر پر مبنی ہے۔ 1783ء میں چمبہ کی فوجوں نے بھدرواہ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور بھوپ چند آلہ کار بنا اور مقامی راجہ فتح پال اور اُس کے بیٹے دیا پال نے مزاحمت نہ کی۔ 1773ء میں چمبہ کے راجہ نے قلعہ کی مرمت کر کے اسے نئے انداز میں استوار کیا۔

1782ء کے ایک خط میں بھدرواہ کے راجہ فتح پال نے چمبہ کے راجہ راج سنگھ کی فرمان روائی قبول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر بھوپ چند نے نومبر 1772ء میں بھدرواہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1783ء میں ایک معاہدہ کے تحت بھدرواہ کا راجواڑہ مکمل طور پر چمبہ کے دائرہ اثر میں آ گیا۔ لیکن 1805ء میں کشتواڑ کے راجہ محمد تیغ سنگھ نے بھدرواہ پر فوج کشی کر کے اسے فتح کیا تھا۔ بقول عشرتؔ کشتواڑی :

''لوگ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے اور قلعہ بھدرواہ کو نذر آتش کر دیا گیا، جس سے قلعہ کو بہت نقصان پہنچا۔ بعد میں وزیر رتنو نے اُس کی مرمت کی اور قلعہ کو قابلِ استعمال بنا دیا۔ 1821ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم پر دلیہ سنگھ نے بھدرواہ پر چڑھائی کی اور بھدرواہ کا قلعہ وزیر رتنو سے حاصل کیا جو کافی عرصہ سے سکھوں کی تحویل میں تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے بھدرواہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تحت رہا بعد میں چمبہ کے حکمران نے رہیلو کا قلعہ سکھوں کو دیا جس کے بدلے میں بھدرواہ کی حکمرانی چمبہ والوں کے ہاتھ آئی اور پھر ایک سند کے ذریعے بھدرواہ والی چمبہ کی تحویل میں آ گیا۔ آگے چل کر 20/اکتوبر 1827ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے بھدرواہ کو اپنی ریاست جموں میں شامل کر لیا۔ 1846ء کے بعد بھدرواہ ریاست جموں کشمیر کا حصہ بن گیا اور بھدرواہ کی انفرادی حیثیت ختم کر کے اُسے صوبہ جموں میں ملا دیا اور قلعہ بھدرواہ ڈوگرہ فوج کی چھاؤنی اور جیل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ قلعہ کے اندر مہا کالی کا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ مغربی حصہ میں ایک بڑا تالاب ہوا کرتا تھا۔ غلام نبی آزادؔ

سابق وزیر اعلیٰ جموں کشمیر نے قلعہ بھدرواہ کو محکمہ آثار قدیمہ کے تحت لانے کا فیصلہ کیا تھا اور قلعہ میں واقع ڈسٹرکٹ جیل کو کہیں منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ بھدرواہ ڈیولوپمنٹ اتھارٹی نے قلعہ کی بحالی کے لئے تین کروڑ روپے مختص کئے ہیں اور اسے ثقافتی وراثت کے طور پر محفوظ کرنے کے لئے انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچرل ہیری ٹیج ،دہلی کے ماہرین کی خدمات طلب کی گئی ہیں تاکہ یہ قلعہ پہاڑی کلچر کا ایک اہم ثقافتی مرکز بن کر اُبھر سکے۔''

بھدرواہ بسوہلی روڈ پر قلعہ کے بالائی حصے سے ایک کشادہ سڑک تعمیر کی گئی ہے جس کے باعث اب قلعہ کے علاوہ وادی بھدرواہ کے قدرتی مناظر دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔

قلعہ بھدرواہ کے علاوہ قلعہ مرمت گلیاں، قلعہ بھیلا، قلعہ جنگواڑ وغیرہ اہم پرانے قلعے ہیں جو اس علاقے کے عہد رفتہ کے تاریخی پس منظر اور ثقافت کی علامت مانے جاتے ہیں۔

رام بن میں کُل دیوتاؤں کی یاترا :

ضلع رام بن کے علاقے میں تقریباً ہر گاؤں میں لوگوں کا اپنا کُل دیوتا ہوتا ہے، جس کی وہ پوجا کرتے ہیں۔ سال میں ایک بار عقیدت مند جولائی کے مہینے میں ہر گاؤں سے اپنے دیوتاؤں کی یاترا نکالتے ہیں۔ اس یاترا کو راجہ سنگھ پال کے مندر سردھار میں لے جاتے ہیں جو بٹوت کے مشرق میں چناب کی دوسری جانب واقع ہے۔ راجہ سنگھ پال کے مندر میں ان تمام دیوتاؤں کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ عقیدت مندوں کا ماننا ہے کہ گاؤں کے یہ دیوتا راجہ سنگھ پال کے مندر میں آپس میں ملتے ہیں اور عقیدت مندوں سے خوش ہو کر اُن کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔

جہاں رام بن شہر میں کھوناتھ مندر اور جامع مسجد قائم ہیں وہیں بٹوت میں جامع مسجد اور مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد کے دو مندر موجود ہیں۔ اُدھر 1947ء کے واقعات کے بعد کچھ سکھ رفیوجی خاندان بٹوت میں آباد ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے دو خوبصورت ترین گورودوارے یعنی گورودوارہ سنگھ سبھا اور گورودوارہ بھائی روچا سنگھ تعمیر کئے ہیں۔ اسی طرح ضلع ڈوڈہ میں بڑی جامع مسجد اور حضرت شاہ فریدالدین کی یادگار کے علاوہ علاقہ بھر میں مساجد اور آستانوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیبی ورثہ ہماری پہچان اور شناخت ہے۔

☆......اقبال احمد

ضربِ کشمیر

(قسط اوّل)

ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی تہذیب نے جب دھیرے دھیرے اپنے اِرتقائی مراحل سے نکل کے مختلف کنبوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کر لی تو اُس کی ضرورتوں کا آغاز بھی ہوا۔ پہلے پہل اگر چہ ضرورتیں محدود پیمانے پر ہی تھیں مگر دھیرے دھیرے ان میں اضافہ ہوتا گیا اور ایک کنبہ دوسرے کنبے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر انحصار کرتا گیا۔ یہ کنبے اور قبیلے آپس میں چیزوں کا تبادلہ کرتے رہے جس کو جو چیز ضرورت ہوئی وہ چیز وہ دوسرے سے لیتا اور اُس کو اُس کی ضرورت کی چیز دی جاتی۔ اس طرح مختلف خاندانوں اور قبیلوں نے آپس میں چیزوں کا تبادلہ شروع کیا۔ اس نظامِ تبادلہ کو ''بارٹر سسٹم'' کا نام دیا گیا۔ اس طریقۂ کار نے نہ صرف ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کیا بلکہ اس سے سماجی اور اقتصادی طور انسانی تہذیب میں طبقہ جات اور کمنوٹیز کا جنم بھی ہوا۔ کسی طبقہ نے زمینداری کے شعبے کو اپنا لیا اور مختلف فصلیں اُگانے لگا دوسرے طبقہ نے اِن فصلوں کی تجارت شروع کر دی۔ ایک اور طبقے نے اوزار بنانا شروع کر دیا۔ اس طرح پیشہ ورانہ طور انسانی سماج کئی طبقہ جات میں بٹ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ اپنے (Nomadic life) خانہ بدوشانہ زندگی کو ترک کر کے ایک منتخب جگہ پر قیام پذیر ہوا۔ تاریخی اعتبار سے اس سے ہم نئے پتھر کے زمانے کے آخری دور سے گنتے ہیں، جو ایک اندازے کے مطابق تقریباً دو ہزار قبل مسیح

سے پندرہ سو سال قبل مسیح کا زمانہ آتا ہے(Circa 2000-1500 BC)

یہ انسانی دورِ حیات کا ابتدائی دور تھا جب انسان کی ضروریات نہایت ہی محدود نوعیت کی تھیں لیکن پھر مختلف طبقہ جات نے جنم لیا اور یہاں سے ہی چیزوں کے آپسی تبادلہ کا عمل شروع ہوا۔ لیکن جب ہم یہاں سے گزر کر ویدک دور (1500-600 BC) کی طرف آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ضرورت میں قدرے اضافہ ہوا اور چیزوں کے تبادلے کے عمل میں تبدیلی ہونی شروع ہو گئی۔ جہاں پہلے عام چیزوں کو ہی اس عمل میں لایا گیا، سب سے پہلے مال مویشوں کو زرِ تبادلہ کے لئے استعمال میں لانا شروع ہو گیا۔ چونکہ یہ غیر مادی (Intangible) دولت تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی تھی۔ اس لئے انسانی سوچ نے اسی دولت کو پہلے زرِ تبادلہ میں لانے کا سوچا۔ اِن مال مویشیوں میں بھی زیادہ تر انتخاب گائے کا ہوا ہے چونکہ تمام جانوروں میں گائے ہی زیادہ تر فائدہ مند ہوتی تھی جو دودھ کے ساتھ گوبر بھی دیتی ہے، اس لئے اسی کو ذریعہ تبادلہ بنایا گیا۔ رگ وید (Rig Veda) میں لکھا گیا ہے کہ اندر دیو کی مورتی کی قیمت دس گائے کے برابر ہے۔ اس سے اس جانور کی بطورِ ذریعہ تبادلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ویدک دور میں ہی گائے کے ساتھ کئی دوسری اشیا کا بھی ذکر آیا ہے جو ذریعۂ تبادلہ کے بطور استعمال میں لائے گئے ہیں۔ اِن میں مالائیں، گولے اور دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ دوسری طرف رگ وید Rig) (Veda میں ماہرین نے کئی ایسی اصطلاحات (ناموں) کا انتخاب کیا ہے جن کے معنی سکوّں کی مناسبت سے لیا گیا ہے۔ اِن اصطلاحات (ناموں) میں نشکہ، نشکہ گریوا، سوورنا، ست مان اور پدا (Nishka, Nishka Greeva,Suvarna and Sataman Pada) وغیرہ شامل ہیں۔

لیکن یہاں یہ بات وثوق سے نہیں کی جاسکتی ہے اِن کے حتمی معنی کسی ذریعہ تبادلہ نظام سے جوڑا جائے، ہوسکتا ہے کہ کسی زیور کا نام ہوں یا کسی اوزان کا اس لئے یہ کہنا کہ ویدک دور میں کسی سکّے کا اجارہ کسی ایسے نام سے ہوا ہو، مناسب نہیں ہے۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ویدک دور (Vedic ages) کسی شہری دور کی تہذیب نہیں رہی ہے۔ یہ ایک دیہی تہذیب کا دور تھا جس میں انسانی معاشرے نے کسی فنون لطیفہ میں کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ اس لئے جب ہم ویدک دور کے نظامِ تبادلہ کی بات کرتے ہیں تو ہمیں وہی روایتی تبادلہ یاد آتا ہے جب حیوانی دولت خاص کر گائے کا استعمال زیادہ ہوا ہے، ہوسکتا ہے چھوٹے چھوٹے لین دین کے لئے (Transaction) میں گائے کے ساتھ ساتھ فصل، مالاؤں، گولوں اور چھوٹے چھوٹے دھات کے ٹکڑوں کا بھی استعمال ہوا ہوگا۔

جب ہم ہڑاپن دور(Harrapan period) کی بات کرتے ہیں جو ایک نہایت خوشحال شہری تہذیب رہی ہے تو اس دور میں بھی کسی سکّے کی شہادت نہیں ملتی ہے۔ ہڑاپن دور (Harrapan period) تقریباً 2000-3000) (BC تین ہزار قبل مسیح سے دو ہزار قبل مسیح تک کا زمانہ آتا ہے۔ اِس سے عرفِ عام میں وادی سندھ کی تہذیب(Indus Valley Civilization) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ایک شاندار شہری تہذیب رہی ہے جس نے سماجی اور اقتصادی طور پر بہت ترقی پائی تھی۔ اس بات کا ثبوت اس دور کے دریافت شدہ آثارقدیمہ کی جگہوں اور ان سے برآمد شدہ مصنوعات سے ملتا ہے لیکن باوجود ایک ترقی یافتہ تہذیب کے اُن کے ذریعۂ تبادلہ کا نظام بھی روایتی باٹرسسٹم (Bartar system) کا ہی رہا ہے۔ وہ بھی چیزوں کا تبادلہ چیزوں یا حیوانی دولت اور اناج سے ہی کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ ہڑاپہ کے مختلف کھنڈرات سے ہزاروں کی تعداد میں

اُن کی Seals دریافت ہوئی ہیں جن پر انڈس سکرپٹ (Indus alphabets) میں عبارت درج بھی ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے میں یہ سیلز Seals کسی ذریعہ تبادلہ میں استعمال نہیں ہوئی ہیں۔ ہڑا تہذیب کے قدیم آثاروں اور اُس کی مصنوعات پر کام کرنے والے ماہرین ابھی تک یہاں سے کسی سکّے کا پتہ نہیں لگا سکے ہیں۔ یہاں تک کہ جو سیلز Seals اور اُن پر کندہ عبارت یہاں کے قدیم آثار سے دریافت کی گئیں ہیں اُن کی عبارت بھی اِن ماہرین کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کئی دہائیاں گزر گئیں جب اس قدیم ترین شہری تہذیب کا پتہ لگایا گیا مگر ہڑا تہذیب کی کسی بھی جگہ پر یہاں سے درآمدہ لکھائی کے نمونوں کو ابھی تک Decipher نہیں کیا گیا ہے۔ اس دور کے کسی سکّے کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا ہے۔ اس لئے عام رائے یہی ہے کہ ہڑا تہذیب کے لوگ بھی اپنا لین دین روایتی طریقوں سے کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک پہلے کسی دھات والے سکّے کی تاریخ اور اجارہ کا تعلق ہے، یہ کام سب سے پہلے یونانی اور رومی بادشاہوں نے انجام دیا ہے۔ تاریخی اور آثارِ قدیمہ کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یونان کے ایک قدیم بادشاہ نے (Lydia) لیڈیا کی مملکت سے اپنا پہلا سکّہ جاری کیا ہے۔ یہ جگہ آج مغربی ترکی میں آتی ہے اور یہاں سے تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح میں سکّہ جاری ہوا ہے۔ یہاں مجھے علامہ اقبالؔ کا وہ شعر یاد آتا ہے جس میں انہوں نے یونان، مصر، روم کی قدیم تہذیبوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے ۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

یونانی بادشاہوں نے پہلی بار ایک مسلسل اور مکمل کرنسی کا آغاز کیا جو ایک

منتخب وزن اور منتخب دھاتوں پر مشتمل تھا۔ اُنہوں نے سونے، چاندی اور تانبے کے سکّے جاری کئے جو ہیلنسٹک (Hellenstic) دور میں جاری ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی رومن دور کے بادشاہوں نے بھی لگ بھگ اسی دور میں سکّے جاری کرنے شروع کر دیئے۔ اُن کے سکّے بھی سونا، چاندی اور تانبے کے رہے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں ہم جان گئے کہ نہ ہی ہڑاپن دور (Harrapan period) اور نہ ہی ویدک دور میں کسی سکّے کے جاری ہونے کی کوئی تاریخی دلیل ملتی ہے۔ یہاں سے جن قدیم سکّوں کی ہمیں تاریخی اور آثارِ قدیمہ والی یعنی (Archaeological evidence) ملتی ہے، وہ ہے پنچ مارکہ سکہ جس سے تاریخ میں کارشپنا (Karshapana) کا نام دیا گیا ہے اور یہ سکہ یہاں جن پد دور یعنی تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں جاری ہوا ہے۔

جب ہم خطہ کشمیر کی بات کرتے ہیں تو کشمیر کی مختلف کتب تاریخ میں یہاں کے قدیم سکّوں کا ذکر اُن کے ناموں کے ساتھ آیا ہے تاہم سکہ شناسی کا عمل یہاں اُنیسویں اور بیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا ہے۔ اس ضمن میں Alxander Cunningham جیسے بین الاقوامی سطح کے سکّہ شناس کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ کننگھم نے ہندوستان میں آثار قدیمہ کی تحقیق کی بنیاد ڈالی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ برتاطانوی فوج کے انجینئر تھے لیکن فوج سے زیادہ اُنہیں تاریخ تہذیب وتمدن، آثارِ قدیمہ اور سکہ جات جیسے شعبوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اُنہوں نے ہندوستان میں آثار قدیمہ اور سکہ شناسی کا آغاز کیا اور شمالی ہندوستان میں کئی اہم اور دلچسپ دریافتیں بھی کی۔

کشمیر میں بھی آثار قدیمہ کی تحقیق اور سکّہ شناسی کی شروعات بھی کننگھم سے ہوئی۔ اُنہوں نے یہاں کے قدیم فن تعمیر اور سکہ سازی کی تحقیق کی شروعات سائنسی

بنیادوں پر شروع کی اور کئی تحقیقی مقالے بھی لکھے۔ کشمیر میں قیام کے دوران اس نے یہاں کی جہلم وادی سے ہزاروں کی تعداد میں قدیم سکّے دریافت کئے۔ ان دریافت شدہ سکّوں کی پہچان بھی کر لی اور اِن پر کئی مقالے بھی تحریر کئے۔ کننگھم کو یہاں کی جہلم وادی سے یونانی، پارتھین، ہون، کدار اور کتنا ندور کے سکّے دریافت ہوئے ہیں۔ اِن سکّہ جات کی تحقیق کے دوران اس نے یہاں کی سب سے پہلی تاریخ کی کتاب راج ترنگنی کا تنقیدی جائزہ بھی لیا اور اس کتاب کے سامنے کئی سوال بھی کھڑا کر دیئے۔ چونکہ یہ پہلی بار تھا جب یہاں سکّوں اور آثارِ قدیمہ کی تحقیق سائنسی بنیادوں پر ہوئی۔ کننگھم نے کئی ایسے بادشاہوں کے سکّے دریافت کئے جن کا ذکر یا تو راج ترنگنی میں سرے سے نہیں آیا تھا یا اگر آیا تھا تو اُنہیں اس تاریخ میں آگے پیچھے کر دیا گیا تھا۔ کننگھم نے کشمیر سکّے پر جو پہلی تحقیق کی اُس سے اُنہوں نے لندن سے شائع ہونے والے جنرل Numismatic chronicle کے 1846ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔ اسی طرح اُنہوں نے اپنی کتاب Coins of Ancient India جو 1891ء میں چھپی ہے، میں کشمیر کے سکّوں کے لئے ایک باب باندھا ہے اور یہاں سے دریافت شدہ سکّوں کی فہرست بھی مرتّب کی ہے۔ یہ فہرست ایک (Catalogue) کی شکل میں ہے جہاں کشمیری سکّوں کو تصاویروں اور ضروری Description کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ کننگھم کے بعد جن دوسرے یورپی ماہرین آثارِ قدیمہ اور سکّہ شناسوں نے کشمیر کے سکّوں پر تحقیق کی ہے ان میں سی۔ جے راجرس، سر آرسٹائن اور آر۔ بی وائٹ ہیڈ کا نام قابلِ ذکر ہے۔

لیکن اِن دوسرے ماہرین نے زیادہ تر کام یہاں کے مسلم دور کے سکّوں پر کیا ہے جن میں سلاطین، مغل دور اور دُرانی دور کے سکّے آتے ہیں۔ اِن یورپی ماہرین کے ساتھ ساتھ یہاں کے چند مقامی تاریخ دان بھی اس میدان میں آئے

ہیں،جنہوں نے یہاں کے سکّے پر کام کیا ہے۔ اِن میں جی ۔ایم ۔ڈی صوفی، بی ۔این ۔کے بامزے، آر ۔سی کاک، محمد یوسف ٹینگ اور ایس ۔ایل ۔شالہ کے نام آتے ہیں۔لیکن اِن کا کام بہت محدود رہا ہے اور انہوں نے صرف چند سکّوں کا ذکر کر کے اپنی تاریخ کی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ البتہ کننگھم کے ساتھ ساتھ جن دوسرے یورپی ماہرین آثارِقدیمہ اور سکہّ جات کی جب ہم بات کرتے ہیں تو بیشک اُنہوں نے جو جموں وکشمیر کے سکّوں پر کام کیا ہے وہ باضابطہ طور ایک پیشہ ورانہ کام ہے جو سائنسی بنیادوں پر عمل میں لایا گیا ہے۔ اِن کی وہ دستاویزات کشمیر کے سکّے کی ایک مُستند تاریخ کی شکل رکھتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کام ابھی رکا نہیں ہے۔ اس کام کی شروعات جو کننگھم نے انیسویں صدی کے وسط میں کی تھی اس کے بعد بھی جاری رہی اور آج بھی یہ تحقیق ہو رہی ہے۔ موجودہ دور میں بھی کئی یورپی اور ہمارے ملک کے ماہرین آثارِقدیمہ وسکّہ جات یہاں کے سکّوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اِن میں یورپ کے ڈاکٹر ڈیوڈ مکڈویل، جیو کرِبس، میکل مچنر، ڈاکٹر بی ۔ایل گپتا سمیت کئی دوسرے ماہرین شامِل ہیں۔

میکل مچنر (Micheal Mitchner) نے اپنی کتاب کلاسیکل ورلڈ (Coins of Classical World) میں جموں وکشمیر سے پائے جانے والے ہند یونانی، ہند سیتھن اور ہند پارتھن کے لئے الگ باب باندھا ہے اور اُن سکّوں کا نہ صرف ذکر بلکہ اُن کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ خاکسار بھی کئی دہائیوں سے اس تحقیق سے جُڑا ہوں اور میں نے اس موضوع پر بہت سے مضامین اور کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ چونکہ میں نے اس شعبے میں ہندوستان کے ایک مشہور ومعروف ادارے "Indian Institute of Research in Numismatic Studies" میں 1992-93 میں تربیت پائی ہے اور تب سے آج تک جموں و

کشمیر کے سکّو ں پر تحقیق کرتا آیا ہوں۔ پچھلی کئی دہائیوں سے ہزاروں کی تعداد میں سکّے دریافت ہوئے ہیں جن میں کئی Horad بھی شامل ہیں۔ پچھلی کئی دہائیوں سے جوخزانے یہاں سے دریافت ہوئے، اِن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ا: میدان چوگل، ہندوارہ.............................کشان سکّے

۲: تورکھ پورہ، بانڈی پورہ.............................کشان سکّے

۳: صفاپورہ، گاندربل.................................ہندو دور کے سکّے

۴: برتھنہ قمرواری، سرینگر.............................سلاطین دور کے سکّے

۵: والتھو رہ، رفیع آباد.................................سلاطین دور کے سکّے

۶: وتنار، کوکرناگ.................................ہندو دور کے سکّے

۷: چرارشریف، بڈگام.............................ہندو دور کے سکّے

۸: نونر، بڈگام...ٹورمانہ سکّے

اِن خزانوں کی دریافت بالترتیب سال 1983، 1992، 1999، 2010، 2011، 2014، 2016 میں اِن مختلف مقامات سے ہوئی ہے۔ یہ ان سکوں کی تفصیل ہے جو یہاں مختلف مقامات سے حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں سکّے مختلف میوزیموں اور سکّہ کے جمع خانوں میں جمع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سرینگر کے ایس۔ پی۔ ایس میوزیم میں سکّو ں کی تعداد ستّر ہزار 70,000 سے تجاوز کرگئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جموں کے ڈوگرہ آرٹ میوزیم میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں مختلف ادوار کے سکّے جمع ہیں۔ کئی دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کئی سکّے جمع ہیں۔ سکّو ں کی ایک خاصی تعداد یہاں سے باہر چلی گئی ہے جو وہاں کے جمع خانوں اور میوزیموں کی زینت بنے ہیں لیکن سب سے بڑی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں سکّے لوہاروں اور سُناروں

کے کارخانوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں، جو اِن سکّوں کو پگھلا کر دوسری اشیا میں تبدیل کرتے ہیں۔

چونکہ جموں وکشمیر میں سکّہ جات کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ کے لئے کوئی خصوصی ادارہ قائم نہیں کیا گیا اور یہ کام یہاں پر محکمہ آثار قدیمہ کے ذمہ رکھا گیا ہے جو اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ سکّہ جات کا بھی خیال رکھتا ہے۔

دوسری طرف ابھی تک جموں وکشمیر سے دریافت شدہ سکّہ جات کی فہرست بھی سرکاری طور مرتّب نہیں کی گئی ہے۔ ہمارے پاس جو جموں وکشمیر کے سکّوں کے متعلق جانکاری ہے وہ نجی تحقیق سے پتہ چلی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ سرکاری ماہرین سکّہ جات کی خدمات حاصل کر کے سرکاری طور پر سکّوں کی ایک مکمل فہرست یعنی Catalogue مرّتب کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ سکّے کی میراث کو تحفظ دینے کے لئے سرکاری طور بھی اس کے خرید وفروخت کا عمل شروع کیا جائے گا تاکہ جو سکّے یا تو باہر یا پھر لوہاروں اور سُناروں کے کارخانوں کی طرف جاتے ہیں، ہمارے یہاں کے میوزیموں کی طرف آئیں گے اور سکّے کے خزانوں کو اور زیادہ وسیع بنائیں گے۔

یوں تو جموں وکشمیر میں سِکّہ شناسی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے اور اس عمل کی شروعات یہاں تقریباً انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط سے ہوئی ہے، تاہم جب سِکّہ سازی کے فن کی بات کرتے ہیں اِس فن کی تاریخ نہ صرف قدیم ہے بلکہ بہت دلچسپ اور حیران کُن بھی ہے۔

تاریخی شہادت اور دریافت شدّہ سکّہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی سکّے کی ابتدا زمانۂ قدیم سے ہی ہوا ہے۔ راج ترنگنی سمیت دوسرے کتبِ تاریخ کے تنقیدی جائزہ سے سکّوں کے متعلق کئی اصطلاحات کا پتہ چلتا ہے جن میں کوڑی، کانی،

کرشاپن، کیسرہ، دینار، درہم، اشرفی، ٹانکہ، روپکا، سُورنا، ساسن، بارہ کانی، سیاہ پول، پنچھی، پنا، ساسن وغیرہ جیسے نام شامل ہیں۔ اِس اصطلاحی عواد کا استعمال کبھی سکّے اور کبھی ناپ تول کے اوزان کے طور ہوا ہے۔ لیکن زیادہ تر عواد سکّے کے طور ہی ہوئے ہیں جبکہ اِن میں سے کئی ناموں کا تعین ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ البتہ بیشتر اصطلاحات کو متعین کیا جا چکا ہے۔

کوڑی، کرشاپن، دینار، درہم، ٹانکہ، جیسے عواد کو دریافت کیا گیا ہے یہ اُن سِکّہ جات کے نام ہیں جو یہاں مختلف ادوار میں رائج الوقت تھے۔ کوڈی یا کوری، یہ سب سے کم اور سستی کرنسی رہی ہے، اس کا ذکر نہ صرف کتب تاریخ بلکہ ہماری لوک کتھاؤں میں بھی آیا ہے۔ پنڈت کلہن اپنی راج ترنگنی میں جب مہاراجہ سنگرامہ دیوا کا ذکر کرتا ہے تو لکھتا ہے کہ سنگرامہ دیوا نے دولت جمع کرنے کی شروعات کوڈی سے کی جبکہ وہ کروڑ پتی بن گیا۔ اسی طرح کھمیندرا اپنی لوک پرا کا شا میں ایک کنجوس تاجر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ اتنا کنجوس تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو شام کو اپنی کمائی سے صرف تین کوڑیاں دیتا تھا۔ ہمارے یہاں کی لوک کتھاؤں میں بھی ضرب المثل بہت مقبول رہی ہے۔

نۆش لوو ِنہٕ ہار
کھر وتل مورتس ہُنڈ

(یعنی بہو کی قیمت ہار بھی نہیں ہے اور نذر اُتارنے کے لئے بھیڑ کو کیوں ذبح کریں)۔

اس لوک روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوڑی یہاں کوئی خاص قیمت نہیں رکھتی ہے یہ بطورِ ایک ادنیٰ کرنسی کے طور استعمال ہوئی ہے۔

کوڑی کے چھوٹے چھوٹے گولے آبی ذخائر خاص کر سمندروں اور بڑے دریاؤں سے برآمد ہوتے تھے۔ یہ کسی سمندری مخلوق کے بقایاجات رہے ہیں جو شکل

میں انڈے جیسے گول اور چمک دار ہوتے ہیں۔ یہ ریت میں پائے جاتے ہیں۔ کئی قدیم تہذیبوں میں ان کوڑیوں کو بطورِ زیور اور بطورِ ذریعہ تبادلہ بھی استعمال میں لایا گیا ہے۔ چونکہ کشمیر میں دریائے جہلم اور دوسرے بڑے آبی ذخائر سے بھی یہ کوڑی کے گولے ملتے رہے ہیں اور یہاں بھی ان کا استعمال بطورِ ذریعہ تبادلہ میں لایا گیا ہے جس کا ذکر ہم نے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔

سرینگر کے عجائب گھر میں کوڑیوں کے چند نمونے یہاں سکہ جات کی گیلری میں بھی رکھے گئے ہیں۔ اگرچہ تاریخی کتب میں اِن کوڑیوں کا ذکر بطورِ کرنسی ہوا ہے تاہم جب ہم قدیم سکّہ جات کی بات کرتے ہیں تو ہم کوڑیوں کو اِس فہرست میں شامل نہیں کرتے ہیں، کیونکہ یہ قدرتی طور دستیاب تھیں اوران کی بناوٹ میں انسانی ہاتھ کا عمل دخل نہیں رہا ہے۔ دوسری طرف اِن کا کوئی خاص دور بھی متعیّن نہیں رہا ہے۔ یہ زیادہ تر وسطی دور میں بطورِ ذریعہ ءمبادلہ استعمال میں رہی ہیں۔ کلہن پنڈت نے کوڑی کا ذکر کرتے ہوئے جس سنگرام راجہ کی بات کی ہے وہ وسطی دور (949-948) کا راجہ گزرا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوڑی کا استعمال راجہ سنگرام دیوا کے زمانے میں بھی ہوا ہے۔

یہاں جب ہم سکّے کی بات کرتے ہیں تو وہ دھات والے سکّے کی بات ہوتی ہے اور قدیم دھات والے سکّے کا نام مختلف کُتبِ تاریخ میں کرشا پن آیا ہے۔

اشٹ دھائی پانِنی Ashtadhyayi of Pannani میں اِس سکّے کے اصطلاحی معنی قدیم کرنسی کے درج ہوئے ہیں۔ جب ہم کسی دھات والے قدیم سکّے کا ذکر کرتے ہیں تو سب سے پہلے کارشا پن کا نام آتا ہے۔ سکّہ شناسوں نے بہت پہلے سے اِس سکّے کی پہچان کر لی ہے اور علمِ سکّہ شناسی میں اِس کو پنچ مارکہ Pang Marka سکّہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ سکّے چاندی اور تانبے میں دستیاب ہیں اور اِن پر ایک طرف ایک سے لے کر پانچ نشان کنندہ ہیں اور تین سے لے کر چار گرام وزن ہے۔ اس سکّے کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اِس کی ابتدا جن پد Janapadha دور یعنی تقریباً چھ سو (600BC) قبل مسیح میں ہوئی ہے اور مُوریا دور کی آخری دہائی یعنی اڑھائی سو (250BC) قبل مسیح تک ہے۔

جیسا کہ کتبِ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک بشمولِ افغانستان بدھ مت کے ابتدائی دور میں سولہ مختلف جن پدھوں اور مہا جن پدھوں (Minor and Major States) میں تقسیم ہوا تھا جن میں مگدھ، آنگ، کاسی، کوشل، اونتی، وتسا، گندھارا، کمبوجا، چڑی، وجیے، مالا، کورو، پنچلا، متسا، سُرسینا اور آسکا شامل تھے۔ یہ دور تاریخی اعتبار سے چھ سو قبل مسیح تک کا دور گِنا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب پہلی بار برصغیر ہندو پاک سے دھات والے سکّے کی شروعات ہوئی ہے۔ اِن ہی سکّوں کو کتبِ تاریخ میں کارشاپن Karshapana اور علمِ سکّہ جات میں پنچ مارکہ Pang Marka سکّے کا نام دیا گیا ہے۔ اِن سکّوں کی ایک طرف ایک سے لے کر پانچ مختلف نشان کندہ ہیں اِن کا اجرا ان ہی مختلف جن پدھوں سے ہوا ہے۔ اِن کا وزن 3 سے 4 چار گرام رہا ہے۔

ابتدائی دور کے سکّوں پر ایک، دو یا تین نشان کندہ ہیں جبکہ بعد میں مگدھ مہاجن پدھ سے جاری ہونے والے سکّے چار سے لے کر پانچ نشان کندہ ہیں۔

ایسے سکّے چاندی اور تانبے میں بنائے گئے ہیں لیکن چاندی کے سکّے زیادہ تعداد میں بنائے گئے ہیں، جبکہ تانبے میں اِن کی تعداد بہت کم ہے۔ شکل میں ایسے سکّے گول اور چکور ہیں البتہ گندھارا مہاجن پدھ سے جاری ہونے والے سکّے قوس والے سکّے کمر بند جیسے لگتے ہیں۔ ایسے سکّوں پر چھ بازو والا گول نشان کندہ ہے۔

کتبِ تاریخ میں کشمیر کو گندھارا کشمیرا کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور مورخین کی رائے میں جن پدھ دور میں کشمیر اِسی مہاجن پدھ کا حصہ رہا ہے۔

گندھارا جس سے آج قندھار کے نام سے جانا جاتا ہے، مشرقی افغانستان کا ایک تاریخی شہر اور صوبہ ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ ایک مہاجن پدھ رہا ہے جس کی سرحدیں مشرقی افغانستان، شمال مغرب پنجاب، پشاور، پرسیورہ، راولپنڈی اور کشمیر تک پھیلی ہوئی تھیں لیکن حیرانی کی بات ہے کہ کشمیر جس سے تاریخ کی کتابوں میں گندھارا کشمیرا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور گندھارا مہاجن پدھ کا حصہ تصوّر کیا جاتا رہا ہے، یہاں سے ابھی تک گندھارا طرز والے سکّے کی ایک بھی مثال سامنے نہیں آئی ہے۔ یہاں سے جو پنچ مارکہ سکّے دریافت کئے گئے ہیں، وہ زیادہ تر مگدھ طرز والے سکّے ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے مہاجن پدھوں کی نسبت مگدھ نے سیاسی طور پر بہت ترقی پائی اور یہ دوسری چھوٹی بڑی ریاستوں پر حاوی ہوگیا۔ مُوریا (350-225BC) دور میں اس نے اپنی سیاسی اور انتظامی سرحدیں دُور دُور تک پھیلانے کے ساتھ یہاں جاری کردہ پنچ مارکہ سکّے کا پھلاؤ دوسری ریاستوں سے بھی شروع ہونے لگا۔ کشمیر چونکہ مہاراجہ اشوک کے دور میں مُوریا سلطنت کے زیر اثر آیا اور یہاں بھی مگدھ طرز کے پنچ مارکہ سکّے جاری ہوئے۔

جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ اشوک نے یہاں کے کئی شہروں میں کئی مذہبی عبادات گاہیں تعمیر کروائیں جن میں ویچوارہ کے مُٹھ اور مندر شامل ہیں۔

مہاراجہ اشوک نے یہاں وتستا کے دائیں کنارے زبرون پہاڑی کے دامن میں ایک نیا شہر بھی بسایا جس کا نام اُس نے پورن دلستانہ رکھا تھا۔ یہ شہر آج پاندریتھن کے نام سے جانا جاتا ہے اور شہر سرینگر کے جنوب مشرق میں برلب قومی شاہراہ نمبر

44پر آباد ہے۔

یہاں سے کھدائی کے دوران بدھ مت اور ہندو دھرم سے وابستہ تعمیرات کے آثار بھی برآمد ہوئے ہیں۔یہاں کے اِن آثارِ قدیمہ سے دریافت شدّہ مصنوعات آج بھی سرینگر کے ایس۔پی۔ایس میوزیم کی زینت بنی ہوئیں ہیں جن میں بدھ مت اور ہندو مت کے کئی اوتاروں کی مورتیاں بھی شامل ہیں۔

چونکہ مُوریا دور میں پنچ مارکہ سکّے کی اشاعت بھی دُور دُور تک پھیل گئی اور کشمیر جو مُوریا حکمرانوں کے زیرِاثر آیا یہاں سے بھی مگدھ طرز والے یا پنچ مارکہ سکّے کی شروعات ہوگئی۔

جب ہم پنچ مارکہ سکّوں کی سلسلے کی بات کرتے ہیں تو موٹے طرز پر پنچ مارکہ سکّے کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ایک کا نام علاقائی سکّہ اور دوسرے کا نام مرکزی سکّہ (Local and impairal) رکھا گیا ہے۔علاقائی سکّوں میں ایک سے لے کر چار تک نشان کندہ ہیں جبکہ مرکزی سکّوں پر برابر پانچ نشان کندہ ہیں۔علاقائی ادوار کے سکّے مختلف جن پدھوں نے اپنے اپنے علاقہ جات میں رائج کئے ہیں جبکہ مرکزی دور کے سکّے مگدھ کے مہاجن پدھ سے رائج ہوئے ہیں اور دھیرے دھیرے علاقہ جات میں بھی پھیل گئے۔عام طور پر ایسے سکّے قدرے گول اور چکور شکل کے رہے ہیں اور ان پر سکّے کے ایک طرف مختلف نشان کندہ ہیں جن میں گول دائرے کے نشانات، گول پہیے، انسان اور دیگر بیل بوٹے (Circles,wheels,human and animal figures,bow and arrow, little mountains and other geomatrical and designs) شامل ہیں۔

لیکن سب سے دلچسپ بات اِن کی نشانیوں کی یہ ہے کہ پنچ مارکہ سکّے کی

ہرکڑی میں، سورج اور چھ بازوؤں والا نشان (Sun and six armed symbol) ہر کڑی پر دوہرایا گیاہے۔ ہر ایک نشان الگ الگ ٹھپوں (Punches) سے کندہ کئے گئے ہیں۔

چونکہ ایسے سکّوں پر کوئی عبارت درج نہیں ہے اس لئے انہیں غیرتحریرشدہ سکّے سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک ہزاروں کی تعداد میں سکّے برصغیر ہندوپاک اور افغانستان سے دریافت ہوچکے ہیں اور سکّہ شناسوں نے ان کی پہچان بھی کی ہے۔ اس سکّے کے کئی کیٹلاگ (Catalogue) بھی ترتیب دیئے گئے ہیں اور یہ سکّے مختلف میوزیموں اور دوسرے سکّہ جات کے خزانوں کے زینت بنے ہوئے ہیں۔

جموں وکشمیر کے کئی پرائیویٹ Private جمع خزانوں میں بھی ایسے سکّے پائے جاتے ہیں۔ سمیتھن بجبہاڑہ سے 83-1980 کی دہائی میں کھدائی کے دوران کئی پنچ مارکہ سکّے دریافت ہوئے ہیں جو اِس وقت مرکزی محکمہ آثار قدیمہ Archaeology Survey of India کی زیرنگرانی محفوظ ہیں۔ ایسے سکّے یہاں اتفاقاً بھی دریافت ہورہے ہیں جبکہ ایسے سکّے یہاں سے باہر بھی جاچکے ہیں۔ جو سکّے یہاں کے ایس۔ پی۔ ایس میوزیم میں جمع ہیں اُن کی پہچان ہوئی اور اُن کی ڈاکیومینٹیشن بھی ہوئی ہے۔ لیکن جموں وکشمیر کی دوسری جگہوں سے دریافت شدہ ایسے سکّوں کی تفصیل زیادہ دستیاب نہیں ہے البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ایسے سکّے جو یہاں سے دریافت ہوچکے ہیں اِن میں زیادہ تعداد مگدھ طرز کے سکّوں کی ہے جو مُوریا دور میں جاری ہوئے ہیں۔ اِن سکّوں پر حسبِ روایت سکّے کی ایک طرف سورج اور چھ بازوؤں والے گول نشانات بھی ہیں۔ جبکہ سکّے کی دوسری طرف کبھی صاف تو کبھی کسی چھوٹے نشان کو ظاہر کرتی ہے۔

کیا ایسے سکّے مگدھ سے لا کر یہاں جاری کئے گئے ہیں یا انہیں یہاں ہی کسی جگہ ڈھالا گیا ہے۔ یہ موضوع ابھی بحث طلب ہے۔ چونکہ جو پنچ مارکہ سکّے یہاں دستیاب ہوئے ہیں اُن پر ابھی زیادہ تحقیقاتی کام نہیں ہوا ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پنچ مارکہ سکّے کی دریافت یہاں بھی ہوئی ہے۔ ایسے سکّے مُوریا دور میں یہاں بھی رائج رہے ہیں اور یہی سکّے سب سے قدیم سکّے مانے جاتے ہیں۔

(جاری)

☆......سید سلیم گردیزی

مسز ہاروے اور کشمیر

(ایک جری خاتون کی الم انگیز داستان)

1850ء میں سیاحت کشمیر کے حوالے سے تاریخ میں ایک ایسی رومانی داستان دفن ہے جس کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ یہ رومانی داستان ایک عرصہ تک برطانیہ اور برصغیر میں مقیم برطانوی افسروں کی گفتگو کا عنوان رہی ہے۔ یہ مسز ہاروے کی المیہ داستان ہے۔مسز ہاروے کی ذاتی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور مہم جو طبیعت کی مالک ایک برطانوی خاتون تھیں۔ وکٹر شراک مونٹ اور چارلس ہیوگل کے برعکس مسز ہاروے کی شادی اس کے خوابوں کے شہزادے سے ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی محبت کا یہ خوشگوار آغاز ایک ناخوشگوار انجام میں تبدیل ہوگیا۔اس کا شوہر ایک فوجی افسر تھا۔ وہ اپنی سیماب صفت اور فنکارانہ مزاج کی حامل بیوی کو بھی فوجی قواعد وضوابط کی رسی میں کس کر رکھنا چاہتا تھا اور بیوی اس قدر فوجی نظم وضبط کے بندھنوں میں کس کر رہنے کو تیار نہ تھی۔ یہی وجہ ہے مسز ہاروے فوجی افسر کی بیوی ہونے کو Galley Slave کا نام دیتی ہے۔شوہر سے اس کا نباہ نہ ہوسکا اور اس کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔ اسی عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے کشمیر، تبت اور دوسرے مشرقی ممالک کا سفر اختیار کیا۔

اگر چہ اس داستان کا مرکزی کردار بدقسمت مسز ہاروے ہی ہے لیکن ہنوریا لارنس (Hanoria Lawarance) بھی اس کہانی کی اہم کردار ہے جو

سر ہنری لارنس کی بیوی تھی۔ سر ہنری لارنس اس وقت پنجاب میں برطانوی انتظامیہ کا سر براہ اور پنجاب کا بے تاج بادشاہ تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہونے والے بدنام زمانہ معاہدۂ امرتسر میں حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا بنیادی کردار تھا۔ کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کرنے کے بعد سر ہنری لارنس نے گلاب سنگھ کو کچھ انتظامی مشورے دینے اور ریاست میں امن و امان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے 1850ء میں اپنی اہلیہ ہنور یالارنس اور اپنے بچوں ہیری (Harry) اور ہنی (Heny) کے ساتھ کشمیر کا سفر کیا۔ وہ سری نگر میں شیخ باغ میں واقع مہاراجہ گلاب سنگھ کے گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ سر ہنری لارنس اپنی سرکاری اور اس کی بیوی اور بچے نجی سرگرمیوں میں مصروف تھے کہ سر ہنری لارنس کو اپنے بیوی بچوں کو سری نگر میں ہی چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیے لداخ جانا پڑا۔ راستے میں اس کی ملاقات دراس کے مقام پر مسز ہاروے سے ہوئی جو لیہہ سے سری نگر کی جانب آرہی تھی جبکہ سر ہنری لارنس سری نگر سے لیہہ کی جانب رواں دواں تھے۔

کیپٹن سے ملاقات :

مسز ہاروے نے اپنا بیشتر سفر تنہا جاری رکھا تاہم راستے میں کولو کے مقام پر اس کی ملاقات ایک اور فوجی افسر سے ہوئی جسے اس نے کیپٹن ۔ایچ (Captain H) کا نام دیا ہے۔ یہ افسر وہاں اسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اس نے مسز ہاروے سے اظہار ہمدردی کیا اور اسے ان خطرات سے آگاہ کیا جو ایک اجنبی عورت کو دشوار گزار علاقے میں تنہا سفر کے دوران پیش آسکتے ہیں۔ اس نے مسز ہاروے کو پیش کش کی کہ وہ اسے اپنا ہم سفر بنالے تا کہ وہ دوران سفر اس کی ضروریات کی تکمیل اور تحفظ کی ذمہ داری نبھا سکے۔ وہ تنہا سفر اور راستے کی مشکلات سے چنداں خوفزدہ نہ تھی

لیکن اس کے ہمدردانہ لب و لہجے میں محبت بھری پیشکش کو ٹھکرا نہ سکی اور اسے اپنا ہم سفر بنالیا۔ یہاں سے اس کی مشکلات اور مسائل کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آسمان سے ٹپکا اور کھجور میں اٹکا کے مصداق وہ اپنے فوجی شوہر سے جان چھڑا کر سکون کی تلاش میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور وادیوں میں نکلی تھی لیکن یہاں اسے ایک اور فوجی افسر سے پالا پڑ گیا تھا۔ دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دراس میں جب سر ہنری لارنس سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس وقت H Captain اس کا ہم سفر تھا۔ اگر چہ ان دونوں کا اپنا اپنا سامان سفر تھا اور اپنے اپنے ملازم تھے، جو اُن کا سامان اٹھائے ہوئے تھے لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ عین اس دن جب ان کی ملاقات اچانک ہنری لارنس سے ہوئی، دونوں ایک ہی خیمے میں مقیم تھے۔ ایک نوجوان شادی شدہ انگریز خاتون کی ایک اجنبی کے ساتھ اس درجہ قربت پر سر ہنری لارنس کو سخت غصہ آیا۔ اس نے HCaptain کے افسر بالا کو اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی اس میں اس نے لکھا:

> The night before we met ...she had a bed he had none,and they had only one tent up.The same thing would have happened last night,have we not given them shelter.

سر ہنری لارنس کی اس رپورٹ پر HCaptain کے خلاف کیا کاروائی ہوئی، اس کا تو کچھ علم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ کیپٹن ایچ نے مسز ہاروے کے ہمراہ سفر جاری رکھا۔ دراس میں مسز ہاروے نے سر لارنس سے وادی میں جھیل ڈلر کی سیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور سر ہنری لارنس نے اسے کشتی کے ذریعے جھیل مانسبل سے ہوتے ہوئے جھیل ولر اور وہاں سے براستہ دریائے جہلم سرینگر پہنچنے کا راستہ سمجھایا تھا۔

مچھروں کی یورش:

یہ اگست کا مہینہ تھا اور وادیٔ کشمیر پر مچھروں کی یورش تھی۔ اس دور میں کشمیر کی سیاحت کے لیے اگست بدترین مہینہ تصور ہوتا تھا۔ جھیل مانسبل کے کنارے ایک بوسیدہ سی عمارت میں انھوں نے پہلی رات مچھروں کے پے در پے حملوں کے باعث جاگ کر گزاری۔ اگلے دن مسز ہاروے نے کشتی کرائے پر لی اور جھیل ولر کی سطح آب سے نشاط باغ کے اس حصے میں منتقل ہوگئی جو خواتین کے لیے مختص تھا۔ کیپٹن ایچ بھی اسی باغ میں قیام پذیر تھا۔ شام کو دونوں اکٹھے شالیمار باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ شالیمار باغ تھامس مور کی نظم ''لالہ رخ'' کی وجہ سے پہلے سے ہی ان کے قلب و نگاہ میں سمایا ہوا تھا۔ اگر چہ شالیمار باغ میں بھی اکا دکا مچھروں نے انہیں تنگ کیا لیکن پھر بھی خیر گزری کہ شالیمار کی رومان پرور فضاؤں سے وہ خوب لطف اندوز ہوئے۔ مسز ہاروے لکھتی ہیں:

> ''شالیمار باغ کا محل اگر چہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے لیکن باغ اب بھی بہت خوبصورت ہے۔ باغ کے فوارے ہمارے استقبال میں رقصاں ہیں۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں محل کے مرمریں ستونوں پر قوس قزح کے رنگ بکھیر رہی ہیں۔ شالیمار باغ کی خوبصورتی نے میرا دل موہ لیا ہے''۔

دوسرے دن مسز ہاروے کو محسوس ہوا کہ نشاط باغ شہر سے دور ہے لہذا اس نے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ معلوم نہیں مسز ہاروے نے نشاط باغ چھوڑنے کا فیصلہ واقعی دوری کی وجہ سے کیا تھا یا کیپٹن کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی سے وہ اُکتا گئی تھی۔ تاہم شالیمار باغ سے اس کا جانا ٹھہر گیا تھا۔ شیخ باغ جہاں سر ہنری لارنس کی اہلیہ اپنے بچوں سمیت مقیم تھیں، میں کوئی مکان اب خالی نہیں تھا۔ جس میں مسز ہاروے منتقل ہوسکتی۔ تلاش بسیار کے بعد منشی باغ سے ملحق دریائے جہلم پر ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لیا اور مسز ہاروے اس میں منتقل ہوگئی۔

پُراسرار طرزِعمل:

اس عرصہ میں مسز ہاروے اور کیپٹن ۔ایچ کے تعلقات کی نوعیت کیا رہی؟ مسز ہاروے کی تحریروں سے اس کی تفصیل نہیں ملتی البتہ سر ہنری لارنس کی اہلیہ لیڈی لارنس کی تحریروں سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ وہ یوں کہ چند دنوں کے بعد لیڈی لارنس کو مسز ہاروے کا ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ وہ منشی باغ کے اس ہاؤس بوٹ میں اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتی ہے۔ کیونکہ کیپٹن ۔ایچ اس کی جان اور عزت کے در پے ہے اور اسے مسلسل پریشان کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے مناسب قیام کا بندوبست کیا جائے۔ ہنوریا لارنس نے اس کے جواب میں اس کی حوصلہ افزائی کی اور لکھا کہ وہ اسے اپنی بچی سمجھتی ہے اور اس کی حفاظت اور قیام طعام کی پوری طرح ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہے۔ لہٰذا وہ وہاں سے شیخ باغ میں اس کی رہائش گاہ پر منتقل ہو جائے۔ مسز ہاروے نے اس کے جواب میں چپ سادھ لی اور چند دن کے بعد اسی مضمون کا ایک اور نوٹ ہنوریا لارنس کو دوبارہ بھیجا جس میں تاخیر کے لئے معذرت اور آئندہ کے لئے اس سے امان طلب کی گئی تھی۔ جواب میں ہنوریا لارنس نے پہلے سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ اپنی شفقت دہرائی۔ لیکن حسب سابق اس مرتبہ پھر مسز ہاروے نے خاموشی اختیار کر لی۔ چند دن کے بعد پھر اپنی پریشانیوں کا رونا رو کر اس کے ہاں منتقل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب مسز لارنس نے اپنے ملازموں کو بھیجا کہ اس کا سامان وہاں سے اٹھا کر اس کے ہمراہ اس کی رہائش گاہ پر لائیں۔ ملازمین کے جانے پر مسز ہاروے نے پھر معذرت کر لی اور کہا کہ اس نے اب سری نگر سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اگلی صبح وہ سری نگر سے روانہ ہوگئی۔ مسز ہاروے کے ساتھ ہونے والی یہ ساری خط و کتابت ماوڈ ڈائیور(Maud Diver) کی لکھی ہوئی ہنوریا لارنس کی سوانح عمری میں موجود ہے جو 1936ء میں برطانیہ سے شائع

ہوئی جبکہ دوسری طرف مسز ہاروے اپنے جریدے میں لکھتی ہیں کہ اس نے میڈم ہنوریالارنس کی دعوت پر منشی باغ چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ شیخ باغ منتقل ہوگئی البتہ کیپٹن سے ہونے والی نوک جھونک کا ذکر گول کر دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسز ہاروے نے ایسا پُراسرار طرز عمل اختیار کیوں کیا کہ وہ بار بار ہنوریالارنس سے مدد کی التجا بھی کرتی ہے اور اس کی طرف سے مشفقانہ پیش کش پر چپ بھی سادھ لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ منشی باغ میں مسز ہاروے اور کیپٹن۔ایچ کے درمیان نوک جھونک کا معاملہ چلتا رہا ہو اور اس میں نرمی اور شدت کے ساتھ ہی مسز ہاروے کا طرز عمل بھی بدلتا رہا ہو۔ بالآخر اس نے کشمیر سے کوچ کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔اس کے بعد ایسا لگتا ہے کہ کیپٹن۔ایچ اس کی زندگی سے نکل گیا اس نے کسی اور سمت قسمت آزمائی شروع کر دی ہوگی۔ کیونکہ بقول اس کے وہ سری نگر سے اسی دن کانگڑا کی طرف نکل گیا تھا اور پھر اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ مسٹر ہاروے کی کہانی میں اب (We) کی جگہ (I) نے لے لی ہے اور اس کے بعد کا سارا بیان صیغہ واحد متکلم ہی میں ہے۔

دوبارہ آمد:

کوئی نو ماہ بعد اگلے سال جون میں وہ پنجاب کی سیر و سیاحت کے بعد دوبارہ کشمیر آئی۔ پہلی مرتبہ سری نگر سے براستہ اننت ناگ سے ہوتی ہوئی کشمیر سے پنجاب میں داخل ہوئی تھی۔اس مرتبہ وہ بالکل متضاد سمت سے یعنی دریائے جہلم کے ساتھ چلتے ہوئے بارہ مولہ سے وادی میں داخل ہوئی اور بذریعہ کشتی ولر جھیل کی سیر کو نکل گئی۔اس مرتبہ اس کے ساتھ کوئی کیپٹن نہ تھا۔ البتہ تلخ و شیریں یادیں اس کے ساتھ تھیں۔سوپور کے قریب ایک گھنے سایہ دار درخت کی خنک چھاؤں میں اس نے دن کا کھانا کھایا اور پھر ولر جھیل کی سطح آب پر تتلی کی طرح تیرتی پھری جھیل مانسبل نے

بھی اس کے قلب ونظر کو تازگی بخشی۔ اب کی بار نہ کوئی کیپٹن۔ ایچ اس کے لئے بلائے بے درماں بنا تھا اور نہ مچھروں کی یورش نے اس کی ناک میں دم کیا تھا۔ کیونکہ یہ جون کا مہینہ تھا۔ کشمیر میں سیاحت کے لئے خوشگوار ترین موسم۔ پھر وہاں تمام مقامات پر گئی جہاں نو ماہ قبل کیپٹن۔ ایچ کے ساتھ وہ جا چکی تھی۔ نشاط باغ کا وہ گوشہ بھی دیکھا جہاں وہ قیام پذیر رہی اور منشی باغ بھی جہاں وہ اور اس کا ہم سفر مقیم تھے۔ کیپٹن۔ ایچ سے اس کی محبت اور نفرت Hate Love کا کھیل ہمیں اس کے دوسرے سفر کشمیر میں بھی جا بجا جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ نشاط باغ کے اس چنار کے درخت کے پتے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ کرتی نظر آرہی ہے جس کے نیچے وہ اور کیپٹن۔ ایچ گھنٹوں بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے۔

سمر ہاؤس میں قیام :

اس مرتبہ اس نے نشاط باغ میں خواتین کے لئے مختص حصے میں قیام کرنے کی بجائے سمر ہاؤس میں قیام کیا۔ باغ نشاط کا یہ حصہ اسے بہت پسند آیا۔ سنگ مرمر کی بنی ہوئی محرابیں، شور مچاتے پانی کے جھرنے، رنگ و نور میں بسے ہوئے فوارے اور پس منظر میں ڈل جھیل کا خوبصورت نظارہ۔۔ یہ سب کچھ اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ ڈل جھیل میں بنے ہوئے جزیرے چار چنار بھی گئی، جہاں قبل ازیں وکٹر ڈاک مونٹ قیام کر چکا تھا اور جہاں چارلس ہیوگل ہنڈن اور وائینے نے اپنی یادگار لوح نصب کی تھی۔ چند ٹوٹے پھوٹے ستونوں کی ایک عمارت کے کھنڈرات اور چند درختوں کے سوا یہاں اور کچھ نہ تھا۔ اس جزیرے کی ویرانی سے وہ بہت پریشان ہوئی واپسی پر دلاور خان کے باغ بھی گئی جہاں قبل ازیں یورپی سیاح قیام کرتے تھے۔ ڈاک مونٹ، مور کرافٹ، فاسٹر، ہیوگل، ہنڈرسن، وائینے، ڈی سدری اور جوزف ولف سب نے یہاں قیام کیا تھا۔ دلاور خان کا باغ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اس کی

سیر سے وہ حد درجہ مایوس ہوئی۔

انسانی ڈھانچے چار چنار اور دلاور خان کے باغ کی خستہ حالی اور ویرانی پر آنسو بہانے کے بعد مسز ہاروے آبی گزرگاہ کے راستے واپس اپنے ٹھکانے پر آ گئی۔ گزشتہ نو ماہ کے دوران کوئی بھی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اسی شام جو سری نگر میں اس کی آخری شام تھی، اس کے نوکر نے غلطی سے تھرمامیٹر توڑ دیا تھا۔ بس پھر کیا تھا؟ مسز ہاروے کا پارہ چڑھ گیا۔ پہلے تو اس نے ملازم کی خوب خبر لی۔ پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنی روئی جتنی گزشتہ سال اپنے محبوب کتے کی موت پر بھی نہیں روئی تھی۔ روزانہ کا درجۂ حرارت کا ریکارڈ کرنا اس کا معمول تھا اور اب وہ اس معمول کو جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہ رہی تھی۔ اس نے تھرمامیٹر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار جوڑ کر اسے کارآمد بنانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اسے کون بتاتا کہ

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا

واپسی:

سری نگر میں کوئی ہفتہ بھر قیام کرنے کے بعد سیماب صفت، خطر پسند اور سفر نصیب مسز ہاروے اننت ناگ کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں سے وہ چشمہ ویری ناگ اور جہانگیر کا باغ دیکھنے کے بعد براستہ بانہال جموں جانا چاہتی تھی۔ راستے میں اس قدر بارش ہوئی کہ اس کا سارا راستہ جل تھل ہو گیا۔ وہ گدھا جس پر مسز ہاروے سوار تھی دھان کے کھیت میں گر گیا اور مسز ہاروے کیچڑ سے لت پت ہو گئی۔ رات کا وقت تھا، موسلا دھار بارش جاری تھی اور دلوں کو دہلا دینے والی بادلوں کی گرج اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی بجلی کی چمک نے ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ مسز ہاروے، اس کا گدھا اور ملازم تینوں بارش میں بھیگے، گرج چمک میں سہمے اور کیچڑ میں لتھڑے

ہوئے اپنی منزل ویری ناگ کی جانب رواں دواں تھے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔
بجلی لمحہ بھر کے لئے چمکتی تو ساری وادی روشنی میں نہا جاتی لیکن اگلے ہی لمحے تاریکی کی
مہیب چادر ساری وادی کو دوبارہ اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ بادل کی خوفناک گرج سے
دل دہل جاتے۔ ایسے میں ڈری سہمی اور تھکی ماندی مسز ہاروے کی حالت زار ناگفتنی
تھی۔ لکھتی ہے کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تاہم
اسے حوصلے سے کام لینا تھا کیوں کہ غریب الوطنی میں ایک صنف نازک کے لئے
حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حوصلہ ہی واحد ہتھیار تھا۔ گرتے پڑتے، روتے
دھوتے وہ رات کے پچھلے پہر ویری ناگ پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ جہاں اس نے بقیہ
رات اور اگلے دن کا کچھ حصہ آرام کیا۔ اگلے دن جب وہ جاگی تو گزشتہ رات کی
تلخیاں کافی حد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ تھکاوٹ کسی حد تک اتر چکی تھی۔
وہ تازہ دم ہو کر ایک نئی مہم سر کرنے کے لئے تیار تھی۔ وہ تو خیر گزری کہ اس قدر تیز
بارش میں بھیگ کر بھی وہ نمونیہ سے بچ گئی تھی۔ اب وہ مکمل طور پر خوش وخرم اور تر وتازہ
تھی۔ آج اسے ویری ناگ سے بانہال کی چوٹی تک کا سفر کرنا تھا۔ دن بھر کے سفر کے
بعد جب وہ بانہال کی چوٹی پر پہنچی تو اس نے مڑ کر وادی کشمیر کا آخری نظارہ کیا۔ اس
چوٹی سے وسیع وعریض وادی کشمیر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی نظر آتی ہے اور دریائے
جہلم قسمت کی لکیر کی طرح اسے بیچوں بیچ سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے
دوسرے سرے تک چلا یا جاتا ہے۔ یہاں سے وادی کے تمام نشیب وفراز، وادیاں اور
مرغزار، سرو اور چنار واضح نظر آتے ہیں۔

موتی لال ساقیؔ: چند یادیں، چند باتیں

موتی لال ساقیؔ کو میں نے جون 1975 میں پہلی بار کلچرل اکیڈمی میں دیکھا۔ اکیڈمی کی ملازمت کے دوران ترتیب وتدوین کے سلسلے میں ڈکشنری پروجیکٹ میں کام کرنے کا موقع میسر ہوا تو پروجیکٹ کے دوسرے کارکناں سمیت موتی لال ساقیؔ کے ساتھ بھی میری بالمشافہ ملاقاتیں ہوئیں اور پھر ان ملاقاتوں کا یہ سلسلہ آخر تک ایسا برقرار رہا کہ ہر ملاقات پہلی سے زیادہ بامعنی، پُراثر، معلومات افزا اور خنک آمیز شیریں ہوتی تھی۔

ڈکشنری پروجیکٹ کے سربراہ پروفیسر ایس۔ کے۔ توشخانی سے لے کر محمد یوسف چپراسی تک ہر فرد اپنی ایک الگ دنیا رکھتا تھا اور ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ موتی لال ساقیؔ، چمن لال چمنؔ، رسل پوپر، محمد احسن احسنؔ، بشیر اختر، بدری ناتھ کلا اور عبدالغنی ندیم سب شاعر اور ادیب تھے۔ ولی محمد میر اور محمد یوسف مسکین ادب شناس اور بہترین خطاط تھے۔ محمد یوسف چپراسی اگرچہ غربت وافلاس کا مارا تھا مگر تھا بڑا جہاندیدہ شخص۔ شاعروں، ادیبوں، فن کاروں اور ادب نوازوں کے اس طبقہ میں مسعود ساموں اور میری باریابی یا ہمارا اندراج اکیڈمی کی تاریخ میں بہت ہی چونکا دینے والا تھا۔ بہرکیف مسعود ساموں تو کچھ مدت کے بعد کشمیر یونیورسٹی چلے گئے۔

کلچرل اکیڈمی کی ملازمت کے دوران دو افراد کی صحبت نے مجھ جیسے مسِ خام کو کندن بننے کی صلاحیت بخشی ہے، ان میں سے پہلا نام پدم شری موتی لال ساقیؔ

کا ہے جن کی رہبری، رہنمائی اور وقتاً فوقتاً مفید اور کارآمد مشوروں نے مجھے جادۂ ادب کا راہ رو بنایا۔ دوسرا نام پدم شری محمد یوسف ٹینگ کا ہے جن کے تفویض کردہ Challanges سے بھرپور کام خوش اسلوبی سے انجام دے کر نہ صرف اُن سے شاباشی پائی ہے بلکہ اپنے اندر بڑے سے بڑا Challange قبول کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔

جہاں تک موتی لال ساقی کا تعلق ہے وہ کشمیر کی ایک عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت رہی ہے۔ انہیں اردو، انگریزی اور کشمیری تینوں زبانوں پر نہ صرف یکساں دسترس تھی بلکہ انہیں اِن زبانوں کے ادب پر بھی کامل دستگاہ تھی۔

آنجہانی ساقی 1936 میں بڈیار بل کشمیر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بعد میں مہنور ماگام میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے محکمہ دیہات سدھار میں گرام سیوک کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ ریڈیو کشمیر سری نگر میں ملازم ہوگئے جہاں وہ ایک عرصہ ''دیہاتی بھائیوں کے لئے'' ایک معلوماتی پروگرام پیش کرتے رہے۔ پھر وہ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہوگئے۔ کشمیر میں پُرآشوب صورت حال کی وجہ سے ہجرت کی اور ادہم پور میں عارضی سکونت اختیار کی۔ دل کا عارضہ لاحق ہونے کی وجہ سے وہ علاج معالجہ کے لئے دہلی چلے گئے جہاں 12 مئی 1991 کو انہوں نے سروجنی نگر نئی دہلی میں اپنے بڑے فرزند وجے ساقی کے مسکن پر رحلت فرمائی۔

موتی لال ساقی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے مگر انہوں نے کشمیری نثر میں بھی قابلِ ذکر تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔ جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے ''مودری خواب'' اُن کے عہدِ شباب کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ''من سر'' اُن کی ایک اور کتاب ہے جس پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ اُن کی دوسری تخلیقات میں

''مرگ ون''، ''مرثی''''نیری نغمہ'' اور'' آ گرنیب'' کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے سلسلے میں صمد میر، گاشر، آزاد ہندی نغمہ،'' کاشر لکہ باتھ (۵جلدیں)' کلیاتِ شیخ العالم (۲ جلدیں) کتابوں کے علاوہ اردو، کشمیری اورانگریزی میں متعدّد معلوماتی اورفکرانگیز مضامین تحریر کئے ہیں۔انہوں نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

موتی لال ساقیؔ اردو۔کشمیری اور کشمیری۔کشمیری کی مکمل لغات کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف کشمیریانہ کی تین جلدوں کی ترتیب اور تدوین کے اراکین میں سے ایک اہم رکن رہے ہیں۔انہیں مجموعی طور پر زبان وادب کی خدمات کے لئے پدم شری ایوارڈ سےنوازا گیا ہے۔

موتی لال ساقیؔ کے ساتھ میرے گہرے روابط تھے۔کلچرل اکیڈمی میں اپنی ملازمت کے دوران اوراس کے بعد بھی میرا جواُن کے ساتھ تعلق خاطر رہا،اس کے پیش نظر میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم وآ گہی کے اعتبار سے کلچرل اکیڈمی میں اُن کا کوئی ہم سر نہ تھا۔میں کلچرل اکیڈمی کے ماحول میں موتی لال ساقیؔ جیسے افراد کے ساتھ چھ سال تک شب وروز مسلسل کام کرتے ہوئے علم وادب کی انگیٹھی میں تپ کراس قدر حوصلہ مند ہوگیا تھا کہ ادب کی ہر جہات میں موتی لال ساقی کی اہلیت اورتفوق دیکھ کر میں اُنہیں از راہِ مذاق 'ادبی بقال' کہتا تھا۔اگرکبھی کبھار معاملات اور مسائل سے متعلق اردو،انگریزی اور کشمیری زبان میں کسی موضوع پر کچھ برجستہ لکھنا ہوتا تو ساقیؔ صاحب کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے اورتھوڑے سے وقفہ کے بعد ایک جامع دستاویز ایسے پیش کردیتے جیسے عمروعیار کسی ضرورت مند کو اپنی زنبیل سے اُس کی مطلوبہ شے نکال کر دیا کرتے تھے۔درحقیقت اس مقام کے حصول کے لئے انہوں نے دیہات سدھار ،ریڈیو اور کلچرل اکیڈمی کے علاوہ مختلف ادبی تنظیموں،دوردرشن،اخبارات اوررسائل کے ساتھ وابستہ ہوکرادب کی تخلیق میں اپنی

عمر کا ایک حصّہ کھپا دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح عقیق سینکڑوں بار ترشنے کے بعد نگینہ کی صورت اختیار کرتا ہے اُسی طرح ساقؔی بھی مسلسل محنت کرنے کے بعد شعر وادب میں شہرت اور نام وری کے سزاوار ہوئے۔

نامی کوئی بغیرِ مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

موتی لال ساقؔی کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نہ بتاتے ہوئے بھی بہت کچھ بتایا اور کچھ نہ سکھاتے ہوئے بھی کافی کچھ سکھایا ہے۔ جیسے عطّار کی دکان پر ہمیشہ بیٹھنے والا شخص عطر کا پنبہ لگائے بغیر ہی عطر میں بسا ہوا معلوم ہوتا ہے، اُسی طرح میں نے بھی اس 'ادبی بقال' کی صحبت میں زبان وادب کے کئی اسرار ورموز سیکھے ہیں۔

شیخ العالم شش صد سالہ تقریبات کے دوران شیخ العالم کی زندگی، فن اور فکر جیسے مختلف موضوعات پر سیمیناروں کے انعقاد کے لئے مضامین لکھنے لکھوانے کا جب سلسلہ شروع ہوا تو ایک دن میں نے ذرا جھینپتے ہوئے موتی لال ساقؔی سے کہا کہ میں بھی شیخ العالم کے بارے میں کسی موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا، ہاں لکھو، شیخ العالم اور کشتواڑ پر لکھو۔ یہ سن کر مجھے لگا کہ انہوں نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ بھلا شیخ العالم کا کشتواڑ سے کیا تعلق؟ شیخ العالم تو لل دید کے ہم عصر اور اُن کے بعد کشمیری زبان کے سب سے بڑے ریشی شاعر ہوئے ہیں۔ اُن کی زیارت تو چرار شریف میں ہے۔ کشتواڑ کے ساتھ ان کے تعلق کی کیا تُک ہے؟ دو تین دن تک میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ آخر کار کافی غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ساقؔی صاحب مجھ سے مذاق نہیں کر سکتے، کیونکہ آج تک انہوں نے کبھی مجھ سے مذاق نہیں کیا ہے۔ اس لئے شیخ العالم کا کشتواڑ سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہوگا۔ چنانچہ میں

اپنے دفتری کام کاج سے فرصت نکال کر لائبریری سے انگریزی، اردو اور کشمیری میں شیخ العالم کے بارے میں کتابیں لاتا رہا اور مطالعہ کرتا رہا۔ چند دن کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ حضرت شیخ العالم کا کشتواڑ کے ساتھ ایک نہیں تین طرح کا تعلق ہے۔

(۱) شیخ العالم کے آباواجداد سرتھل کشتواڑ کے رہنے والے تھے۔

(۲) اُن کے چار مقتدر خلفاء میں سے دو خلیفے (زین الدّین اور لطیف الدّین) کشتواڑ کے رہنے والے تھے۔

(۳) شیخ العالم کی شاعری میں وادیِ چناب کی زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ موجود ہے۔

گویا شیخ العالم کا کشتواڑ کے ساتھ آبائی، روحانی اور لسانی تعلق ہے۔ ''شیخ العالم اور کشتواڑ' کے عنوان سے جب میرا یہ مقالہ شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اس کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ میں نے اس سے حوصلہ پا کر لگ بھگ دوسو صفحات پر مشتمل 'شیخ العالم۔ ایک مطالعہ' کے عنوان سے کتاب لکھ کر شائع کی جس پر 1994 میں مجھے ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے کتابوں کے مقابلے میں ''بیسٹ بک ایوارڈ'' ملا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا اس کتاب کے سبھی ابواب نہ صرف ساقیؔ کی نظروں سے گزرے ہیں بلکہ انہوں نے ان کی نوک پلک بھی درست کی۔

موتی لال ساقیؔ مجھے ہمیشہ شیرازہ اور ہمارا ادب کے مختلف خصوصی شماروں کے لئے مضامین تحریر کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ راجا اونتی ورمن، بابا داؤد خاکی، تاریخِ اقوامِ کشمیر۔ ایک جائزہ، رسؔا جاودانی کی اردو شاعری، ضلع ڈوڈہ کے لوک عقائد وغیرہ کئی مضامین میں نے اُن ہی کی تحریک پر تحریر کئے ہیں۔

کشمیر سے ہجرت کے بعد موتی لال ساقیؔ کے لہجے میں کافی تلخی پیدا ہوگئی تھی جو وطن سے مہجوری کا لازمی نتیجہ تھی۔ کہتے ہیں ایک روز اُنہیں غالباً ادہم پور کے

اطراف میں ایک ایسی چڑیا نظر آئی جو عام طور پر گرم علاقوں میں نہیں ہوتی بلکہ کشمیر میں ہوتی ہے۔ آنجہانی ساقؔی اُسے دیکھتے ہی مہجوری کے جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ انہوں ایک نظم کہی جس میں وہ اس چڑیا سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا تم بھی میری طرح ہجر کی ماری ہو؟ جو اس اجنبی ماحول اور ناموافق موسم سے نبرد آزما ہو رہی ہو۔

موتی لال ساقؔی ایک مقبول اور معروف شخص تھے۔ ان کے روابط ریاست اور ریاست سے باہر اکثر پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ تھے۔ اُن کی زبان وادب کی باریکیوں پر ہمیشہ نگاہ رہتی تھی اور اپنے جانکاروں کو اُن سے آگاہ بھی کرتے تھے۔ کشمیر میں اُن کے دوستوں میں داکٹر برج پریمی اُن کے ہم پیالہ وہم نوالہ تھے۔ ساقؔی کی طرح انہوں نے بھی ہجرت کی اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ جموں پہنچے جہاں کچھ دنوں کے بعد کشمیر سے مہجوری کے درد وکرب کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ اُن کے انتقال کے چند برس بعد جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں برج پریمی میموریل سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر برج پریمی کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کے ایوانِ صدارت میں موتی لال ساقؔی بھی تھے۔

موتی لال ساقی کشمیری زبان کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ایک بار دفتر میں بیٹھے بیٹھے باتوں باتوں میں انہوں نے اپنے کچھ شعر سنائے۔ جب انہوں نے یہ شعر سنائے۔

بہارُک وَق تہ بیہ گوس جام آسُن
ژوداہمہ زونِ ہُند گوس شام آسُن
شبا بِک نغمہ گیس آسِن نیٹین کیتھ
میہ گوس بیہ برونہہ کنہ گُلفام آسُن

تو یکا یک میری نگاہوں کے سامنے ان میں بیان کیا گیا منظر ایسا پھر گیا کہ میں نے فی البدیہہ اِسے اردو کا جامہ پہنا دیا۔ چنانچہ میں کشمیری زبان کے اس عالی قدر شاعر اور ادیب کے بارے میں اپنے اِن برجستہ اور بے ربط خیالات کو ان کے کشمیری اشعار کے اس اردو ترجمہ پر ختم کرتا ہوں۔

فصلِ گُل ہو اور دورِ جام ہو
چودہویں کا چاند، رنگیں شام ہو
نغمۂ شیریں لبا لب جام ہو
اور میرے رو برو گل فام ہو

☆......دینا ناتھ نادمؔ
مترجم:۔سید محمد مبشّر رفاعی

سفرنامۂ چین

اس کا نام سن یاوی تھا۔معصوم سا چہرہ، یاسمن کے پھول کی بند کلی جیسی چھوٹی ناک۔جلد کی ابھرتی ہوئی سفید رنگت میں سے چھوٹی چھوٹی ،پتلی اور دبی ہوئی آنکھیں، لیکن آنکھوں کی رنگت مانسبل جھیل کی چکا چوند اور گہرائی جیسی۔وہ ان سب میں قدرے زیادہ ہی پست قد تھی۔ہمارا جہاز جوں ہی پیکنگ کے ہوائی اڈے پر اترا، کچھ بچے ایک ٹولی کی صورت میں اپنے اپنے دامن میں پھول لئے ہمارے پاس آئے اور نہایت ہی پیار اور محبت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔اس جہاز میں میرے ساتھ ہندوستان، پاکستان اور سری لنکا کے کچھ اور امن پسند مندوبین تھے۔ان میں خاص طور سے پاکستان ٹائمز کے مدیر مظہر علی خان، ان کی اہلیہ طاہرہ مظہر علی خان اور سری لنکا کے فیلکس بندرانا یکے قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ کیرلا کے جوزف منڈیسری، مہاراشٹر کے آر کے کھادیلکر، مشرقی پاکستان کے شیخ مجیب الرحمٰن اور میرے عزیز دوست ترلوچن دت بھی ہمارے ساتھ تھے۔جوں ہی ہم لانج میں داخل ہوئے ،تو انگریزی بولنے اور سمجھنے والے کئی ترجمہ کار چینی نوجوان وہاں آ پہنچے۔ان میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی۔میری مدد کیلئے یہی سن یاوی آئی۔اُس نے میرا نام پوچھا تو میں نے ٹھاٹھ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میں ایک باضابطہ کمیونسٹ ہوں۔ مجھے لگا تھا کہ وہ یہ سن کر حیران ہو جائے گی۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔شاید میرے بچگانہ رویّے پر۔

ہمیں پیکنگ ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ یہ ایک شاندار ہوٹل تھا جس میں ہر طرف مخمل اور ریشم بچھا ہوا تھا۔ مجھے یہ جنت کا ایک محل خانہ محسوس ہوا۔مخمل اور ریشم کے علاوہ اطلس ہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ پیکنگ پہنچتے ہی مجھے شدید سردی محسوس ہوئی ۔ اکتوبر شروع ہونے والا تھا لیکن بھلا کی ٹھنڈ تھی ۔مصیبت یہ کہ میرے پاس مناسب کپڑے نہیں تھے۔ جولائی میں ایک دن گھر کیلئے دودھ لینے کی غرض سے بازار گیا تھا، جہاں موتی لال مصری کے ساتھ ملاقات ہوئی۔اس نے کہا کہ امن کانفرنس میں شرکت کیلئے جالندھر جانا ہے اور جانے کیلئے گاڑی تیار ہے۔ میں نے گھر جا کر عجلت میں پتلون اور بش شرٹ زیب تن کئے اور جا پہنچا جالندھر۔امن کانفرنس کے اختتام پر وہاں پولیٹیکل سکول کا انعقاد ہوا۔ دال کی ایک کٹوری اور ایک سوکھی روٹی۔ یہ تھی صبح اور شام کی غذا۔ سیاسی سکول کے غالباً دو دن گزر جانے کے بعد مجھے دلی جانے کا حکم ہوا۔مجھ سے کہا گیا کہ پاسپورٹ وہیں تیار ہوگا اور یہ کہ ہندوستانی وفد کے ساتھ چین جانا ہے۔ میں انتہائی حیران ہو کر رہ گیا۔ میں تو مفلسی کی حالت میں دن گزار رہا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی ۔اسی سوچ میں تھا کہ کروں تو کیا کروں ۔لیکن سیاسی شوق نے جنون کی شکل اختیار کی تھی۔ اس پر پہلی بار چین جانے کی ہوس۔ بہر حال کافی کھوج اور تلاش کے بعد وہاں پریم ناتھ کا چرو سے نائٹ سوٹ کا ایک پاجامہ حاصل کر سکا۔

چنانچہ وہ بھی تقریباً میرے ہی قد کا ہے، لہٰذا پاجامہ لینا فائدہ مند ثابت ہوا۔ دلی میں اندر موہن سے فلالین سے بنے ایک جیکٹ کا انتظام ہوا اور شیلا بھاٹیہ نے میرے لئے ایک نئی پتلون سلوائی ۔ پیروں میں ایک پھٹی پرانی چپل پہنی تھی اور یہی پہن کر میں چین جا پہنچا۔جنوبی چین میں گرمی کا موسم تھا، لہٰذا مجھے سردی کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔بس پتلون اور بش شرٹ سے گزارہ ہوتا تھا۔لیکن جب میں پیکنگ

پہنچا، وہاں موسم خزاں جوبن پر تھا اور کافی سردی تھی، میں کانپ اٹھا۔ سب لوگ ادھر اُدھر آ جا رہے تھے، لیکن میں سمٹ کر بستر کے اندر گھس گیا۔ دوسرے دن مجھے بخار آیا۔ میں نے پینسلین یا سلفا لینے کی خواہش ظاہر کی تا کہ جلدی سے صحت یاب ہو جاؤں۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ''ہم بلا وجہ ایسی ایذا رساں دوائیاں تجویز نہیں کرتے ہیں۔'' میں روس میں بھی اسی قسم کے ایک تجربے سے گزرا تھا۔ وہاں جب میرے دانت میں درد ہوا تو وہاں بھی مجھے اینٹی بائیوٹک دینے سے منع کیا گیا بلکہ درد دنداں اخراج دنداں کے مصداق میرا دانت جڑ سے اکھاڑا گیا۔ دو ایک روز کے اندر جب میرے بخار میں افاقہ ہوا، تو میں نے پینے کیلئے پانی طلب کیا۔ لیکن کسی کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ البتہ مجھے چکن سوپ لینے کی صلاح دی گئی۔ جس دن مجھے دوپہر کا کھانا کھانا تھا، اس وقت میرے سبھی روم میٹ سیر سپاٹے کے لئے گئے تھے۔ میں بستر میں پڑا پڑا وقت کا زیاں کر رہا تھا۔ اسی وقت ترجمہ کار سن یاوی میرے پاس آئی۔

اُس نے میٹھے انداز میں بولا، ''آپ صحت یاب ہو رہے ہیں۔'' میں نے پوچھا کہ دو روز تک کہاں تھی۔ اس نے جواب میں کہا، ''میں جب بھی یہاں آئی، آپ کو گہری نیند میں پایا۔ اسی وجہ سے آپ میری آمد سے بے خبر رہے۔'' مجھے پتہ چلا کہ اُس کو ایک لاکھ ین ملتے ہیں۔ یہ تقریباً ایک سو بیس روپے بنتے ہیں۔ اس میں سے وہ ساٹھ روپے دائی اماں کو دیتی ہے جو اس کی بیٹی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ خود کپاس کے ایک کارخانے میں کام کرتی ہے اور شوہر 400 میل دور ایک مل میں ملازمت کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ گفتگو کے دوران انتہائی حسین انداز میں اپنے ہونٹوں کو حرکت دے رہی تھی۔ اس نے پوچھا، ''آج نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟''۔ میں نے کہا کہ نہ رات میں نیند آئی اور نہ دن میں۔ اس نے کہا کہ گھر کی یاد آ رہی ہوگی۔ میں نے

جواب میں کہا کہ کچھ ایسا ہی ہے اور پھراس بیماری کی وجہ سے میں کمرے میں قید ہوکر رہ گیا ہوں۔سب لوگ فاختہ کی مانند کھلے آسمان میں پرواز کررہے ہیں اور میں جیسے مفلوج ہوکر رہ گیا ہوں۔ میں تو بے کار ہوکر رہ گیا ہوں۔اس نے کہا،'' آپ فکر کیوں کرتے ہیں، میں یہیں آپ کے پاس رہوں گی۔''میرے اندر کا شیطان جاگ گیا۔ میں نے پوچھا،''کیا کروگی۔''اس نے کہا کہ میں پریوں کی کہانی سناؤں گی۔ اُسی طرح جس طرح میں اپنے بچے کو سناتے سناتے سلا دیتی ہوں،تب جب وہ بیمار ہوتا ہے۔میں ایک دم خاموش ہوگیا۔ مجھے بہت پہلے جوانی کی حالت میں سورگباش ہوئی میری بڑی بہن یاد آئی۔ جیسے وہ زندہ ہوکر میرے سامنے آ گئی ہو۔میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہوئی اور میرے تن بدن پر کپکپی طاری ہوئی۔

اسی روز شام کو درزی بلایا گیا۔میرا ناپ لیا گیا اور مجھ سے کوٹ، پتلون اور اوورکوٹ کیلئے کپڑا پسند کرنے کو کہا گیا۔خود وہ سب ڈبل جین کے بند گلے والے سوتی کرتے اور پاجامے زیب تن کئے ہوئے تھے۔مجھے بلیزر اور کشمیر نامی کپڑے میں سے سوٹ منتخب کرنے کیلئے کہا گیا۔ مجھے لگا کہ انہیں میری مفلسی کا احساس ہوا ہے۔ میں نے کافی منع کیا تھا،لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ بہرحال میں نے وہی کپڑا اور وہی رنگ پسند کیا، جو میں نے وہاں بہت سارے لوگوں کے پاس دیکھا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے علاوہ تقریباً سبھی مندوبین کیلئے کپڑے سلوائے گئے تھے۔شاید میری ہی حالت زار کو دیکھ کر۔

بیماری کے دوسرے تیسرے روز بعد میں بھی یہاں وہاں آنے جانے لگا۔ پیڑوں سے پتے جھڑنے کا موسم تھا۔ابھی بھی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔لیکن خوشنما دھوپ بھی کھل اٹھی تھی۔ایک روز ہم پیکنگ کے ایک نامور شاعر ماؤون سے ملنے گئے۔وہ ایک خوبصورت سے ایک منزلہ مکان میں بود و باش کرتے تھے۔مکان کے

اطراف انتہائی صاف ستھرے تھے۔ آس پاس میں پیڑ پودے تھے لیکن خزاں کے مارے ہوئے۔ اس شاعر نے ہمیں چھوٹی بحر کے اشعار سنائے۔ ان اشعار میں اگر چہ انقلاب کا احساس نہ تھا، البتہ یہ عشق ومحبت کی بُو اور جذبے سے سرشار تھے۔ میں نے اس کے ڈرائنگ روم میں رکھے ایک میز پر پھولوں کے کچھ گملے دیکھے۔ ان میں لگے پودوں کی شاخوں سے چھوٹے چھوٹے سنترے لٹک رہے تھے۔ مجھے لگا کہ یہ کوئی چینی فن ہے اور پودوں پر سجاوٹ کی غرض سے مٹی سے بنائے گئے سنترے رنگ چڑھا کر لٹکائے گئے ہیں۔ لیکن جب یہ حقیقت مجھ پر کھلی کہ یہ دراصل سنترے ہی ہیں، میں انتہائی حیران ہو کر رہ گیا۔ ماوون نے ایک سنترہ کاٹا اور ہم سب میں ایک ایک قاش تقسیم کی۔

امن کانفرنس کئی روز تک جاری رہی۔ ہم پورا دن کانفرنس میں شرکت کرتے تھے اور پھر رات کو''نین این مین'' چوک میں جیسے بے قابو ہو کر ناچ گانا کرتے تھے۔ اس میں عمر کا کوئی لحاظ نہیں رہتا تھا۔ نام، ذات، قوم، یہ سب جیسے ایک ہی ملت میں ضم ہو کر رہ گئے تھے۔ اور وہ ملت تھی۔۔۔''انسان۔ امن دوست انسان''۔ ہم نے کافی جگہیں دیکھی۔ ایک جگہ ہم نے چاول کے دانے پر ایک مکمل شعر تحریر کیا ہوا دیکھا۔ ہم نے کچے دھاگے سے بُنا ہوا ایک قالین دیکھا۔

ہم نے چینی اوپیرا دیکھا جس میں 65 سالہ می لا خان ایک 14 سالہ دوشیزہ کا رول کر رہا تھا اور اس کا حسن و جوانی دیکھ کر انسان اپنے دل پر جیسے بلا وجہ قابو کھو بیٹھتا تھا۔ ہم نے نانکنگ بطخ کی ضیافت کھائی، جس کا گوشت زبان پر رکھتے ہی مکھن کی مانند پگھل جاتا تھا۔ ہم نے پرندوں کے گھونسلوں کو ابال کر تیار کیا گیا رس پیا، جس سے جسم و جاں میں تازگی بھر جاتی تھی۔ ہمیں کھانے کیلئے سیب ملتے تھے۔ میں آپ کو بتادوں کہ میرا نزلہ اور زکام کس سے ٹھیک ہوا؟

ایک دن مجھے تلی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں دی گئیں۔ان سے بہت بدبو آرہی تھی،جس کی وجہ سے میں نے منہ بنایا۔سن یاومی حسبِ معمول مسکرائی اور کہا،''یہ ایک نایاب مچھلی ہے۔ دور ایک سمندر میں سے پکڑ کر لائی جاتی ہے۔آپ اسے کھائیں۔کل تک پوری طرح ٹھیک ہوجائیں گے۔''مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے جیسے تیسے دو ایک مچھلیاں حلق سے اتاردیں۔پھر کیا! دوسرے دن صبح ،نہ نزلہ تھا اور نہ کھانسی۔

تقریباً پندرہ روز بعد ہم پیکنگ سے روانہ ہوئے۔ہمارے لئے ایک نئ ریل گاڑی رکھی گئ تھی،جس کا نام''امن ریل'' رکھا گیا تھا۔اس میں الگ الگ کئ ایک کمرے تھے۔الگ الگ بستر۔اندر ہی اندر راہداری اور برآمدے اور بیچوں بیچ ایک ڈائننگ ہال۔

میں اب مفلس نہیں تھا۔نیا لباس زیب تن کیا تھا۔سردی کی کپکپاہٹ سے بھی نجات ملی تھی۔ہمیں شہر شہر رکنا تھا۔ ہر ایک چیز کا مشاہدہ کرنا تھا۔لوگوں سے ملنا جلنا تھا۔بے شمار چائے پینی تھی۔اصلی چائے، ہری چائے لیکن نہ شکر اور نہ دودھ۔میں قدرتی طور پوری طرح صحت یاب ہوگیا۔میں پورے دن میں کم از کم تیس بار چائے نوش کرتا تھا۔

تین شین پہنچتے ہی میں بے ہوش ہوگیا۔پریم ناتھ کا چروکا جو پاجامہ لیا تھا وہ پھٹ گیا۔پریم ناتھ دبلا پتلا ہے اور میں قدرے ہٹا کٹا۔پاجامے کا پھٹنا ایک قدرتی امر تھا۔بہر حال! جیسے تیسے میں نے کہیں سے سوئی دھاگا لے آیا اور پاجامہ سی دیا۔لیکن پاجامہ اس قدر تنگ تھا کہ دوبارہ اُسی جگہ پر پھٹ گیا۔لیکن میں بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔میں نے ایک بار پھر مرمت کی اور شنگھائی تک ساتھ لے کر گیا۔

شنگھائی میں مجھ پر اوپر والے کی مہربانی ہوئی۔ وہاں ہمیں ریشم کا نائٹ

سوٹ تحفے میں دیا گیا۔ میں نے راحت کی سانس لی۔ جب ہم شنگھائی سے روانہ ہوئے، میں نے پُرانا پاجامہ لپیٹ کے وہیں ایک کونے میں رکھ دیا اور ریشم کا نائٹ سوٹ پہن کر ریل گاڑی میں سوار ہوا۔شنگھائی سے ہمیں نانکنگ جانا تھا۔سفر کے دوران ایک دن میں نے ریل گاڑی میں اپنے برتھ پر ایک پارسل دیکھا۔ میں نے کھولا تو وہی پرانا پاجامہ پایا۔ دھلا ہوا، سلا ہوا، سلیقے سے پیک کیا ہوا۔ نانکنگ پہنچ کر میں نے کافی خوشی محسوس کی۔ وہاں چنار کے پیڑ بھی تھے اور سفیدے کے بھی۔ لیکن چنار کا گھیراؤ اور قد چھوٹا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ چنار اس سے لمبے نہیں ہوتے ہیں؟ وہاں ہم ایک بودھ وہار میں بھی گئے۔ بالکل ویسے، جیسے یہاں پرانے زمانے میں ڈل میں ملتے تھے۔ نانکنگ میں کچھ مندوبین کو زربافت کے بٹوے دئے گئے۔ ان میں کچھ کنکریاں تھیں، جن پر سوکھے ہوئے خون کے دھبے تھے۔ یہ ان شہیدوں کا خون تھا، جو 1927 میں وہاں ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے تھے۔

نانکنگ کے بعد ہانگ چو ہمارا اگلا پڑاؤ تھا۔ سوچا کہ جاتے جاتے وہ پھٹا پرانا پاجامہ کہیں پھینک دوں گا، لیکن ایسا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار لپیٹ کر ریل گاڑی کے برتھ پر لگے بستر کے نیچے رکھ دیا۔ سوچا کہ اب یہ کسی کے ہاتھ نہ آئے گا۔ اس کباڑ کو کہاں لے کر جاتا۔

ہانگ چاؤ انتہائی خوبصورت شہر ہے۔ وہاں بے مثال جھیلیں ہیں۔ ان میں سرسبز جزیرے ہیں۔ جزیروں میں پیڑ پودے لگا کر ان کی شاخوں کو اس طرح کی شکل دی گئی ہے کہ کچھ کے صوفے بنے ہیں۔ کچھ پیڑوں کی کرسیاں بنی ہیں۔ کچھ کے میز اور کچھ کے تخت پوش۔ سب تازہ و سرسبز۔ کہیں کہیں چائے کے پودے، جن سے سبز چائے کی پیداوار ہوتی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ پودوں پر برجستہ کلیاں۔ چائے کی یہ کلیاں اور یہ پھول پیس کر چائے کی کیتلی کے اوپر ڈال دئے جاتے ہیں جس سے سارا

ماحول مہک اٹھتا ہے۔ ہانگ چاؤ میں ہم ایک دن گپھا دیکھنے گئے۔ وہاں میں نے شاردا رسم الخط میں بودھ منتر پتھروں پر کندہ دیکھا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہاں ہم نے بھی ایک تمدنی پروگرام کیا۔ مجھے اپنی نظم ''واون وون نم'' کا امین کامل صاحب کا کیا ہوا ترجمہ از بر تھا۔ وہی نظم ترنم میں گائی، جس پر روہنی بھاٹیہ نے رقص کیا۔ چینیوں نے بہت پسند کیا۔ رات کو جب میں سونے کی غرض سے بستر پر گیا، تو وہاں ایک لفافہ پایا، جس میں پریم ناتھ کا چرو کا پاجامہ سلیقے سے رکھا ہوا جیسے مجھے گھور رہا تھا۔

ہانگ چاؤ سے ہم چین کے اپنے آخری پڑاؤ کانتون پہنچے۔ یہ جگہ دریا کے کنارے پر آباد ہے۔ ہمارا ہوٹل بھی دریا کے کنارے پر تھا۔ یہاں تک آتے آتے ہمارے کئی ساتھی واپس وطن لوٹ چکے تھے اور بیشتر ہوائی جہاز کے ذریعے۔ لہٰذا میں اپنے وفد کا منتظم مقرر ہوا تھا۔ ہماری نشستیں رات دیر گئے ہوتی تھیں۔ ان میں یہ فیصلے کئے جاتے تھے کہ کس دن کیا کام ہوگا اور کس طرح ہر ایک کام کو بخوبی منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ میٹنگ میں صرف اہم کامریڈ حصہ لیتے تھے۔ میرا ساتھی ترلوچن دت کامریڈ نہیں تھا۔ وہ محض ایک ہمدرد تھا۔ لیکن اگر اسے ذرہ برابر بھی شک ہو جاتا کہ اس کو میٹنگ میں شامل نہیں کیا جاتا ہے تو وہ بہت برا مان جاتا۔ اسی چیز کو مدنظر رکھ کر میں اس کے سو جانے بعد اپنے بستر میں تکیہ گھسا کر کمرے سے باہر نکلتا تھا۔

خیر! کانتون سے نکلتے وقت میں نے پاجامے کے تعلق سے اپنی خواہش صفحہ قرطاس پر اتاری۔ میں نے لکھا کہ یہ پاجامہ بے شک میرے سفر کا ساتھی ہے، لیکن اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کو اب آگے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ آپ لوگ یہ نہ سوچیں کہ کس قدر بے ربط انسان ہے، راستوں میں کچرا پھیلاتا ہے، یہ سوچ کر اس کو کہیں پھینکا نہیں۔ دریا برد اس وجہ سے نہیں کیا کہ آپ لوگ پانی گندا ہونے کے ڈر سے اس میں ہاتھ بھی نہیں ڈالتے ہیں، تو کہاں یہ پھٹا پرانا پاجامہ۔ اب آپ سے

درخواست ہے کہ اس پاجامے کو یہیں رکھنے کی میری خطا نظر انداز کریں اور اس کو پھر ایک بار میرے پاس نہ بھیجیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس وصیت نامے کو میں نے سوئی کی مدد سے پاجامے کے ساتھ ٹانک کر رکھا اور پاجامہ میز پر رکھ دیا۔

چین کی سرحد پار کرتے کرتے ہانگ کانگ کے علاقے میں داخل ہوتے وقت میری نظریں بار بار پیچھے کی طرف مڑ رہی تھیں کہ کہیں پاجامہ میرے تعاقب میں نہ ہو۔

(ماخوذ: سفرنامہ نمبر 1975، سون ادب)

☆......ڈاکٹر سید محمد حسنین

صنفِ انشائیہ

ا۔ مضمون اور انشائیہ:

انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے۔ یہ اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب ایک مخصوص صنفی مقام کا حق دار ہے۔ ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، عام زبان میں ''مضمون'' سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے۔ اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظ کہانی میں ہے۔ آپ کے زیر مطالعہ سب رس ہو یا حکایاتِ لقمان، باغ و بہار ہو یا فردوسِ بریں، رستم و سہراب ہو یا آخری تحفہ یا سحر البیان، آپ غور کریں ہر تصنیف میں آپ اساسی طور پر کسی قصہ یا واقعہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں قصے کی نوعیت مختلف ہے۔ ان کا رنگ و روپ اور وضع قطع مختلف ہے۔ مگر ان تصنیفات میں ایک بنیادی عنصر موجود ہے، جو کہانی ہے۔ اس لحاظ سے ان مختلف تحریروں کو کہانی سے موسوم کرنا حق بجانب ہے۔ ادب کی اصطلاح میں اگر ایسا خیال کرنا درست ہوگا۔ کہانی ہوتے ہوئے بھی یہ تصنیفات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ان میں سے ہر تحریر کو بالترتیب ہم ان ناموں سے منسوب کرتے ہیں۔

تمثیلیہ (ALLEGORY)، حکایت (FABLE) داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ کہانی کی یہ مختلف صورتیں ادب میں اپنا ایک مخصوص صنفی مقام رکھتی ہیں۔

یہی حال مضمون کا ہے۔ لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول اور عامیانہ لفظ ہے۔ اس کے دائرے میں بہت ساری باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل نوعیّتوں کی تحریریں ملاحظہ ہوں۔

(۱) عزیز و اقربا کے نام کے خطوط، (۲) کسی موضوع پر سنجیدہ فکر آرائی، (۳) کسی موضوع پر حزن آگیں تمثیلی اظہار، (۴) کسی بڑے انسان کی حیات کا ایک رخ (۵) روزناموں اور رسالوں کے ایڈیٹوریل (۶) جلسوں کی رپورٹ، (۷) ڈائری کا ایک صفحہ (۸) کسی دلچسپ شخصیت کا مرقع (۹) کسی موضوع پر لطیف و شگفتہ بیان (۱۰) کسی ادبی یا ثقافتی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال۔۔ مذکورہ بالا نوع کی تحریریں بہ اطمینان و آسانی ''مضمون'' سے موسوم ہو جاتی ہیں مگر یہ نامناسب ہے۔ ایک متعلمِ ادب کا ان تحریروں کو محض مضمون قرار دینا اس کے مطالعہ ادب کا قصور ہے۔ یہ مختلف النوع تحریریں نثر سے متعلق ہیں۔ اختصار ان کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر تحریر اپنی صورت اور مزاج کے بموجب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں موضوع اور اسلوب MATTER & MANNER یعنی روح اور قالب کا فرق ہے۔ یہی اختلاف اور یہی فرق بساطِ ادب پر ان کے مخصوص مرتبہ و مقام کا اصل سبب ہے۔ مذکورہ بالا نوع کی تحریریں ادبی اور صنفی لحاظ سے بالترتیب ان ناموں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ (۱) مراسلہ (۲) مقالہ (۳) کیفیہ (۴) سوانح یا سرگزشت (۵) اداریہ (۶) روداد، (۷) روزنامچہ (۸) خاکہ، (۹) انشائیہ (۱۰) رپوتاژ۔

انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے۔ بظاہر یہ خیال درست ہے۔ پر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خبر و خیریت ملتی ہو یا مقالہ کی فکر خیز بصارت ج ہو، جس میں کیفیہ کی رقت خیزی ہو یا سوانح کے تاریخ وار کارنامے ہوں، جس میں روداد کی خشک

کارروائیوں کا ذکر ہو یا روز نامچہ کے غیر متعلق بے ربط بیانات ہوں۔ مراسلہ، مقالہ، کیفیہ، سوانح، روداد، روز نامچہ، خاکہ اور رپوتاژ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ایسی مخصوص تحریریں ہیں جنھیں ہم اصناف ادب کا مرتبہ دیتے ہیں۔ ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک خاص صورت ہے اور نثری ادب میں اس کا اپنا ایک صنفی مقام ہے۔ انشائیہ کو اس لئے محض ایک مضمون خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ مضمون نویسی چھوٹے بچوں یا اسکول کے لڑکوں کا شغل ہے۔ یہ شغل ادیب کے لیے موزوں نہیں۔

۲۔صنفِ مقالہ:

انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت یا صنف ہے۔ ادب کی دیگر اصناف میں اس کا رشتہ مقالہ سے قریبی ہے۔ کہانوی اصناف یعنی تمثیلیہ، حکایت، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہ اعتبار صنف، اس کا موانہ مقالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور دیانت ہوتی ہے۔ مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ حکمت وفلسفہ یا عالم ودانش کے کسی پہلو یا رخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اس کے دائرے میں ادب، علوم اور سائنس کے حکیمانہ، عالمانہ اور فاضلانہ امور کے لئے پوری گنجائش ہے۔

یہ باتیں یا اس نوع کی تمام سنجیدہ باتیں بڑی اہم ہیں۔ ان سے ہماری شناسائی ضروری ہے۔ ان کی خشکی، دشوار فہمی یا بے کیفی کے پیش نظر ہم ان کی قدر و قیمت سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ علوم اور سائنس سے ہماری لاعلمی یا بے تعلقی ہمارے لئے ذہنی مفلسی کا سبب ہوگی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص ان کے مطالعہ سے گریز نہیں کرسکتا۔ علوم اور سائنس سے دور رہ کر وہ وقت اور زمانہ کی رفتار وترقی سے یقیناً دور ہو جائے گا۔ اچھے اور مفید مقالے اس اہم مقصد میں ہمارے

کام آتے ہیں۔ یہ ہمیں وقت اور زمانہ کی رفتار وترقی کے ساتھ آگے لے چلتے ہیں۔
ایک مثال سے یہ بات اچھی طرح روشن ہوجائے گی۔

آج امریکہ اور روس کا اسپٹنک ، انسان کی ذہنی کاوش کا ایک سب سے حیرت ناک اور جیتا جاگتا کرشمہ نظر آتا ہے۔لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔عقل کو اسے سمجھانا ضروری ہے ہم روس یا امریکہ کے اسپٹنک کو ماہِ نخشب یا جامِ جمشید جیسے فرضی نشے قرار نہیں دے سکتے۔ ایسا خیال کرنا ہماری حماقت کی دلیل ہوگی۔آج کا انسان اس حیرت انگیز ایجاد کوسوچ سوچ کر دم بخود ہے۔اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں اس مصنوعی چاند کی ایک جھلک دیکھنے کو نہ جانے کتنی بار آسمان پر بے تابانہ اٹھی ہیں۔ ہمارا ہوشمند دماغ اس عینی صداقت کو سمجھنے کے لیے پریشان اور بےکل رہاہے۔ یہ کیسا طیارہ ہے؟ کس طرح یہ گردش کرتا ہے؟ کون سی طاقت اسے سطحِ زمین سے اربوں میل کی بلندی پر پہنچادیتی ہے؟ چاند کی سطح پر گھوم گھوم کرنت نئے مشاہدات کرنا اور نمونے فراہم کر کے بامراد مراجعت، خلابازوں کا زندہ رہنا، زمین والوں سے سلسلہ کلام جاری رکھنا، کس قدر عجیب اور کتنی حیرت افزا سچائیاں ہیں یہ۔اس قسم کے سوالات عقل میں نہ سمانے والے بےشمار سوالات، ہمارے دماغ میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ایسے موقع پر ایک سادہ سا مقالہ ہماری آسودگی کا سبب بن جاتا ہے۔طعبیات ، فلکیات اور دیگر متعلقہ سائنٹیفک مضامین کے پس منظر میں اس موضوع پر ایک مختصر سی تحریر کے مطالعہ سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جانا یقینی ہے۔''خلائی جہاز'' یہ ایک اچھا سا معلوماتی مقالہ ہمارے ذہن کی ایک بند دریچے کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے۔آپ غور کریں اس نوع کی تحریر ہمارے لئے کتنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ایک ناقابل فہم اور دشوار بات جو بے حد سنجیدہ ہے، سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ یہی سنجیدگی مقالوں کی روح ہے۔

یہ مثال ایک علمی مقالہ کی تھی جس کی روح سائنس کے چند اونچے نکات سے معمور تھی۔ اسی طرح دیگر سنجیدہ امور بھی مقالوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ ملک کا پانچ سالہ منصوبہ ہو یا کالجوں میں مذہبی تعلیم کی اہمیت، سیکولرزم کی موت ہو یا نظریہ ٔ حیات بعد الموت، نالندہ کی ثقافتی زندگی کی ایک جھلک ہو یا اشتراکیت میں انفرادی آزادی۔ یہ یا اس قسم کی کوئی علمی بات مقالوں کا موضوع ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ادب، فن، شاعری اور تنقید جیسے ادبی امور بھی بخوبی مقالوں میں پیش کئے جاسکتے ہیں ایک ذی علم اہل قلم ان عنوانات پر سیر حاصل بحث کرسکتا ہے۔ ذی علم سے مراد خواندہ محض نہیں بلکہ ایسا شخص جس کی ان دشوار اور ادق باتوں پر اچھی خاصی نگاہ ہے اور جس کا اپنا مطالعہ بھی ہے۔ اس کے مطالعہ میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہوگی، مقالہ میں اسی قدر روزن اور استحکام ہوگا۔

مقالہ نگار کے لئے دو بنیادی اوصاف کی شرط لازمی ہے یعنی عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج۔ اگر وہ کسی کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔ بڑے اور فاضل مقالہ نگار کی شخصیت کا پہلا رخ عالم کا ہوتا ہے اور دوسرا انشاپرداز کا، وہ صرف بلند واعلیٰ اور اہم وادق سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا بلکہ عام فہم اور دل نشیں انداز سے پیش کر کے اسے قابل قبول بھی بنا دیتا ہے۔

مقالوں میں حکمت، فلسفہ، علم ودانش یا سائنس کی ادق وارفع باتیں سپرد قلم کی جاتی ہیں۔ اس سپردگی میں مگر عالم، مفکر یا سائنسدان کی روش اختیار نہیں کی جاتی۔ مقالوں کی زبان اور اسلوب صاف اور دلکش ہوتا ہے۔ یہاں باتیں علوم اور سائنس کے عجیب وغریب اشارات اور وضع ومصطلحات کے بل بوتے پر نہیں چلتی بلکہ یہ ادبی رنگ رکھتی ہیں۔ باتوں کی خشکی، بے کیفی اور سنجیدگی پر مجاز وتمثیل کا ہلکا سا چھڑکاؤ کر دیا

جاتا ہے۔ان چھینٹوں سے تحریر میں تروتازگی اور شگفتگی آجاتی ہے۔ یہ مقالوں کی زبان اور اسلوب کا سبب ہے کہ ان ادق اور ارفع باتوں کو بلا دردِ سر ہم ذہنی طور پر بہت کم وقت میں قبول کر لیتے ہیں۔

۳۔مقالہ اور انشائیہ:

مقالہ کی روح سنجیدگی اور متانت ہے۔مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف وشفاف ہوتی ہے۔اس کی تیز شعاعوں سے نفسِ تقریر کے مختلف گوشے منور ونمایاں ہو جاتے ہیں۔ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موجِ تحریر یا نفسِ مضمون سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔انشائیہ نگار بھی کسی امر پہ روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ روشنی رنگا رنگ ہوتی ہے۔اس میں دھندلکا اور برّاقی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ روشنی ہماری توجہ کو ایک ہی راستے پر نہیں لگاتی بلکہ یہ اسے اٹھکھیلیاں کراتی ہے۔مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے یا پاتے ہیں۔ایسی باتیں یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گونا گوں اضافہ ہوتا ہے جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔انشائیہ پڑھنے کے بعد ہر کوئی گم کردہ شئے پا لیتے ہیں۔ایسی شئے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔ایسی شئے، جو ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ دنیا حیوانوں سے بھری پڑی ہے۔اس میں شیاطین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔زندگی اور خوش گوار زندگی تو انسانوں کی حاجت ہے اور انسان کا انسان بن کر انسانیت کا اندازہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسانی قدروں کی تمیز اور پہچان کے لئے فرزانگی کی ضرورت ہے اور یہ فرزانگی تھوڑی سی حیوانیت سے بڑے مزے میں حاصل ہو جاتی ہے۔اس مقصد کے لئے انشائیہ بہت مفید ہے۔ یہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے جس سے ہماری انسانیت میں

چستی اور توانائی آجاتی ہے۔

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے۔ اس سے ہم میں متانت، ضبط اور سلیقہ آتا ہے۔ انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے۔ اس سے ہم میں رندی اور آوارہ خیالی آتی ہے۔ مقالوں کی سنجیدگی اور نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی آوارگی یا بدمستی ہی دور کر سکتی ہے۔ مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے اور انشائیوں میں تاثرات کا۔ مقالوں کا کام فکر خیزی ہے اور انشائیوں کا کیف انگیزی۔

مقالہ نگار ایک معلمِ ادب ہوتا ہے۔ اس کا کام درس و تدریس ہے۔ اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں۔ وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔ اس میں متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے۔ اس کا شیوہ لفاظی نہیں۔ وہ جو جانتا ہے، کہتا ہے اور جتنا جانتا ہے، سناتا ہے۔ وہ ہمیں گمراہ نہیں کرتا۔ انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بات کہتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ پر کہتا ہے۔ وہ جتنا جانتا ہے، اس سے زیادہ سناتا ہے لیکن اس کی باتیں بکواس نہیں، یہ مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ یہ ہماری فہم و ادراک کو منجمد ہونے سے بچاتی ہیں۔ ان سے ہمارے طائر تخیل کو پر لگتے ہیں۔ انشائیہ نگار کی گپیں ہماری قوتِ تمیز پر ٹھوکریں لگاتی ہیں۔ یہ ہم پر ان تازیانوں جیسا کام کرتی ہیں جن کی نرم چوٹیں سہہ کر ہم زیادہ ہوشمند اور زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔

مقالہ اور انشائیہ دونوں نثری ادب کی اصناف ہیں۔ مقالے سنجیدہ ادب کو فروغ دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے۔ انشائیوں کی شریعت و طریقت کا حساب اس کے برخلاف ''ادب لطیف'' کے ذمہ ہوتا ہے۔

<u>۴- ادبِ لطیف اور انشائیہ:</u>

انشائیہ کو ''ادبِ لطیف'' یا ''انشائے لطیف'' جیسی مصطلحات سے بھی موسوم

کیا جاتا ہے۔ یہ نامزدگی صحیح نہیں۔ یہ اسی طرح نا مناسب ہے جیسے ہمارا اور آپ کا حیوان جیسے عامیانہ لفظ سے یاد کیا جانا۔ آپ اتفاق کریں گے کہ ہم حیوان کی ایک قسم ہیں اور خصوصی قسم، کارخانۂ قدرت کے اس ارضِ بسیط پر ہمارا مرتبہ و مقام انسان کا ہے، چرند یا پرند یا دوسرے حیوان کا نہیں۔ اسی طرح انشائیہ بھی ادب لطیف میں داخل ہے۔ پر یہ ادب لطیف کی ایک خاص صورت ہے۔ ادب میں اور ادبِ لطیف کی مختلف اصناف کے پیشِ نظر انشائیہ کو ہم ایک مخصوص صنفی مقام دیتے ہیں۔ ادب میں اس کا رشتہ ادبِ لطیف سے ہے اور یہ رشتہ بڑا قریبی ہے۔ ادبِ سنجیدہ سے اس صنف کا تعلق محض رسمی ہے۔ ادب لطیف اور ادبِ سنجیدہ کا اجمالی بیان اس جگہ نامناسب نہ ہوگا کہ اس کے پیشِ نگاہ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

ہر زبان و ادب کے دو حصے ہوتے ہیں' ادبِ لطیف اور ادبِ سنجیدہ۔ انگریزی میں ان کے لئے LIGHT LITERATURE اور SERIOUS LITERATURE مستعمل ہے۔ ادبِ لطیف میں شعری اور نثری اصناف داخل ہیں اور ادبِ سنجیدہ میں علوم اور سائنس۔ عمرانیات، فلسفہ، تاریخ، معاشیات اور نفسیات کا تعلق علوم سے ہے اور طبیعات، فلکیات، نباتیات اور جین نیات وغیرہ کا سائنس سے۔ یہ سارے علمی اور سائنٹیفک مضامین اپنی سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی کے بموجب ادبِ سنجیدہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبِ لطیف کے شعری اصناف میں غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی اور نظم وغیرہ شامل ہیں اور نثری اصناف میں داستان، ڈراما، ناول، افسانہ، خاکہ، سوانح، مقالہ اور انشائیہ وغیرہ داخل ہیں۔

ادبِ لطیف زبان و ادب کا وہ حصہ ہے جس میں علوم اور سائنس کا گزر نہیں۔ یہ انسان، مہذب و متمدن انسان کی وہ حسی و ذہنی تحریری کاوشیں ہیں جو اساسی طور پر تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان میں نہ علوم اور سائنس جیسی سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ

ان کی جیسی خشک بیانی۔ ادبِ لطیف کی باتیں نرم، نازک اور لطیف ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے دل ودماغ سے سنجیدگی کی طالب نہیں ہوتیں۔ یہ براہ راست ہمارے احساس کو چھوتی ہیں۔ ہمارے جذبات وخیالات سے یہ رشتہ رکھتی ہیں اور ہمیں نت نئے کو ائف سے ہم کنار کردیتی ہیں۔

ادبِ لطیف زبان وادب کا ایک حصہ ہے۔ یہ کاخِ ادب کی ایک شاخ ہے، کوئی مخصوص کمرہ نہیں۔ یہ ادب کی ایک شاخ ہے، تحریر کی کوئی خاص صورت نہیں لیکن عام طور پر اسے ایسا نہیں سمجھا جاتا۔ ادب لطیف سے مراد عموماً ایک خاص رنگ اور لب ولہجہ کی تحریریں لی جاتی ہیں جو نیازیت یا ٹیگوریت کی مثال ہوتی ہیں۔ یہ وہ شاعری کہی جاتی ہے جو اپنی جمالیاتی قدروں کے ساتھ نثر میں قلم بند کی جاتی ہے۔ یہ کسی شدید داخلی پُراز ہیجان کیفیت کی رقت انگیز و درد آگیں ترجمانی کرتی ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ تحریریں خالصتاً رومانی ہوتی ہیں۔۔ ایک زمانہ میں اس نوع کی تحریروں کا ہمارے ادب میں بڑا چرچا تھا۔ انشائے لطیف، یا ادبِ لطیف جیسے نام پر ہمارے نوخیز ادب نواز ان نگارشات کے لئے جان دیتے تھے۔

بلاشبہ یہ تحریریں اپنی نیم گفتنی یا لذت آگیں، ابہام کے بموجب اپنی ایک خاص شکل رکھتی ہیں مگر یہ شوخ رنگ وپُراز آہنگ تحریریں۔ اگر ادب میں صنفی لحاظ سے کسی مقام کو پانے کی مستحق ہیں بھی تو بے نام ونشان رہیں، دیگر اصنافِ ادب مختلف ناموں سے نامزد ہوئیں پر ان کا کوئی نام نہ پڑ سکا۔ اپنے نومشق قلم کاروں کے ہاتھ یہ بدنام رہیں اور گمنام مریں۔ آسانی کے لئے ان تحریروں کو ہم ''کیفیہ'' سے یاد رکھیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کیفیہ وہ پھل تھا جو پکنے سے پہلے سڑ گیا۔

تو انشائیہ کو ادبِ لطیف یا کیفیہ سے موسوم کرنا نامناسب ہے۔ ادبِ لطیف میں وہ تمام نثری اور شعری تحریریں داخل ہیں جو خالصتاً تاثرات کا نتیجہ ہیں جن میں

احساسات، جذبات اور تخیلات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ذاتی مشاہدات و تجربات سے یہ بھرپور تحریریں اپنی مخصوص وضع وقطع یا شکل وصورت رکھتی ہیں اور ہم انھیں اصنافِ ادب یعنی LITERARY FORMS کے نام سے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ان ہی اصناف میں ایک صورت ان رومانوی تحریروں کی ہے جنھیں میں نے کیفیہ کا نام دیا ہے اور جو نثر کی شاعری کہی جاتی ہیں۔

انشائیہ نگار کا تعلق ادبِ سنجیدہ سے نہیں ہوتا، ادبِ لطیف سے ہوتا ہے اور یہ تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔اس کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادبِ لطیف کے ذمہ ہوتا ہے۔اس کی زبان اور دماغ دونوں شاعر کے ہوتے ہیں، مفکر یا سائنس دان نہیں ہوتے۔وہ ادبِ لطیف کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کی خاک اڑاتا ہے لیکن اس گہرے تعلق سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ادبِ سنجیدہ کی سرحدیں اس کے لئے آؤٹ آف بانڈ ہوتی ہیں یا فلسفہ وحکمت، علوم اور سائنس جیسے شعبہ ہائے ادبِ سنجیدہ کے پاس انشائیہ نگار کا پھٹکنا بھی محال ہے۔وہ ادب کے ہر شعبہ اور زندگی کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہے۔اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔وہ آزاد وخود مختار ہے۔یہ ساقیٔ محفل خاص ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ عارفِ عرش نشیں بھی ہوتا ہے۔ہاں، ادبِ سنجیدہ کی وادی سنگلاخ ودشوار گزار میں انشائیہ نگار کے لئے ٹھہرنا مشکل ہے۔یہ اس کا مسکن نہیں۔وہ صرف ادبِ سنجیدہ کی جھلکیاں لے سکتا ہے۔اس کی خوش طبعی فلسفہ وحکمت اور علوم وسائنس کی ٹھوس اور مجرد صداقتوں کا سامنا نہیں کرسکتی۔

۵۔انشائیہ میں داخلیت:

چمبر لیمب اور ورجینا ولف اس صنف میں داخلیت کی تیزی اور جذبی کوائف کی ترجمانی پر زور دیتے ہیں۔ ایچ۔ہیڈسن اسی خیال سے انشائیہ کو بالکل ذاتی نوعیت کی تحریر قرار دیتا ہے۔یہی درجہ ہے کہ اس صنف کو PERSONAL

ESSAYS اور LIGHT ESSAYS سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اپنی اس امتیازی خصوصیت کی بنا پر انشائیہ کے خدوخال کا آپ نے اندازہ کیا ہوگا، صنف مقالہ سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں اور ان کی سرحدیں دور ہو جاتی ہیں۔

داخلیتی طریقہ کار SUBJECTIVE WAY OF TREATMENT انشائیہ نگار کا فرض ہے۔ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ صرف اپنے دل کی برائیوں میں نہیں اترتا بلکہ پرانے دل ودماغ کے پاس بھی جا پہنچتا ہے۔ یہ داخلیت اس کے ذاتی مشاہدات کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہ ذاتی ہوتے ہوئے بھی پرانی بوباس لے کر آتی ہے۔ اس میں ایسی شیفتگی ہوتی ہے جو تر وتازگی رکھتی ہے اور وقتی نہیں ہوتی۔

داخلیت ہمیں کیفیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اس صنف کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ لیکن کیفیہ کی داخلیت پُر درد اور پُر سوز ہوتی ہے۔ یہ براہ راست قلب تک اترتی جاتی ہے اور قلب میں ایک لذت انگیز اضطراب اور ناقابل بیان کسک پیدا کر دیتی ہے۔ انشائیہ کی داخلیت اس قدر رقیق اور شدید نہیں ہوتی۔ انشائیہ اور کیفیہ دونوں اصناف بظاہر اپنی نوعیت کے بموجب تاثراتی ہوتے ہیں لیکن اول الذکر میں دھوپ چھاؤں کی بہار ہوتی ہے اور لیل والنہار کا سماں بھی۔ کیفیہ میں اس کے برخلاف صرف نورِ سحر کا منظر ہے یا تاروں کی تنک تابی۔

کیفیہ میں ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے مگر انشائیہ کے پڑھنے والوں کو وہ خمار میسر ہوتا ہے جس کی لہریں چڑھتی اور اترتی رہتی ہیں۔ کیفیہ نثر کی شاعری ہے جس میں انگریزی صنفِ شاعری BALLAD جیسی بات ہوتی ہے۔ انشائیہ نثر کی غزل ہے جس کا ہر مصرعہ ایک نیا کیف اور نیا سرور بخشتا ہے۔ انشائیہ کی داخلیت صرف ہمارے دل کو نہیں چھیڑتی، یہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے، یہاں وارداتِ قلب سے کہیں زیادہ محشر خیال کا جادو چلتا ہے۔

یہ تحریر قلم کار کی ادبی شخصیت کی نہ صرف غماز ہوتی ہے بلکہ اس میں قلم کار کے مزاج و مذاق کا خاص رنگ اور نظر وفکر کا اصل انداز ہ بھی ابھر جاتا ہے۔ اپنی شخصیت وانفرادیت کی عکاسی کا اسے جیسا عمدہ موقع یہاں نصیب ہے، جو دوسری نثری یا شعری اصناف میں حاصل نہیں۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ انشائیہ قلم کار کی شخصیت کے طبعی نقش ونگار کی نمود وظہور کا ایک بے مثال سانچہ ہے۔ انشائیہ کے کینوس پر قلم کار کی وہی صلاحیتیں طلوع ہوتی ہیں اوراس کی انشائیہ کی شفق پھوٹتی ہے۔ اپنی شگفتہ بیانی سے وہ ہمیں اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں کبھی جذبی گھٹاؤں کی پھوار ہوتی ہے اور فکری تجلیاں کوندتی ہیں۔

۶۔صحافت اور انشائیہ نگاری:

انشائیہ نگار کے لیے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔

HE CAN CATCH HOLD OF ANYTHING AND MAKE SOMETHING OUT OF NOTHING.

یہی اس کی منفرد شان ہے چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات، ہر ادا اور ہر کیفیت اس کی زد میں آسکتی ہے، اپنی افتادِ طبع اور شگفتہ نگاری سے وہ ہر بات میں کچھ بات پیدا کرسکتا ہے۔ آپ کہیں گے کچھ بات پیدا کر دینا ایک اچھے صحافی کے لئے بھی کوئی دشوار بات نہیں۔ وہ ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ کسی موضوع پر موثر انداز میں بہت کچھ کرسکتا ہے۔

مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ صحیح ہے کہ صحافی بھی موضوع کا پابند نہیں ہوتا، بے بات کی بات پیدا کر دینا یا بات کا بتنگڑ بنا دینا صحیفہ نگاری کی ایک شان ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ نگار کی طرح وہ بھی آزاد ہے مگر دونوں میں فرد ہے اور بنیادی فرق ہے۔ انشائیہ نگار کا ضمیر پاک ہوتا ہے۔ صحافی کے یہاں طہارتِ نفس ممکن نہیں۔ اس

کی تحریروں پر ایک چھاپ ہوتی ہے جو کسی مسلک یا پالیسی کی چھاپ ہے۔ یہ چھاپ ہلکی ہوتی ہے جسے ہماری نگاہیں نہیں، عقل دیکھ سکتی ہے۔ اداریئے اور شذرات میں، خواہ یہ روزناموں کے ہوں یا ماہناموں کے، پڑھنے والوں کو ہم خیال وہم مشرب بنانے کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔ انشائیہ میں دل کا یہ چور نظر نہیں آتا۔ انشائیہ نگار کا دل صاف اور بے لوث ہوتا ہے۔ اس کا اپنا نہ کوئی سوچا سمجھا مسلک ہوتا ہے اور نہ یہ کسی پالیسی کا اسیر ہوتا ہے۔ یہ بالکل آزاد رہتا ہے اور خود مختار بھی۔ اس کی قلم کاری پر کوئی سینسر نہیں۔

صحافی کی باتوں میں سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی ہوتی ہے۔ یہ باتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں۔ ان میں مقالہ جیسی گہرائی یا پائیداری نہیں ہوتی۔ اچھا صحافی جیک آف آل ہوتا ہے، مگر اچھا مقالہ نگار جیک آف آل نہیں ہوتا۔۔ یہ کنواں جیسا گہرا ہوتا ہے، پھیلا ہوا پانی نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار بھی جیک آف آل ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ اس کی باتوں میں مگر نہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ اس پر کوئی چھاپ رہتی ہے۔ اچھا انشائیہ ایک بہتا ہوا دھارا ہے، رواں دواں اور جولاں۔

صحافی بھی مقالہ نگار کی طرح دعوتِ فکر دیتا ہے۔ پر، اس کی باتوں میں عموماً کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس میں دینے کے ساتھ دوہنے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے، یعنی دوسروں کو ہم کار وہم خیال بنا لینے کی صلاحیت۔ بے غرض بے مطلب قلم نہیں اُٹھاتا اور نہ دیانت کے ساتھ قلم چلاتا ہے۔ وہ اپنے کام کی بات لکھتا ہے اور باتوں میں کتر بیونت کو جائز اور خورد بُرد کو روا قرار دیتا ہے۔ مقالہ نگار کو اس کے برخلاف دیانت سے واسطہ رکھنا ہوتا ہے۔ اغماز اس کی عادت نہیں۔ انشائیہ نگار ہمیں دیتا ہے، ہم سے کچھ مانگتا نہیں۔ اس کی باتوں میں سوال یا طلب کا لہجہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں آسودگی بخشتا ہے اور شگفتہ کرتا ہے۔ الغرض انشائیہ نگار کے لئے موضوع

کی کوئی پابندی نہیں، وہ بالکل آزاد اور خودمختار ہوتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ ہر جگہ جا سکتا ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ شرط کیف واثر ہے، کیونکہ بات کا تبنگڑ بنانا اس کا شیوہ نہیں۔ اسے دل سے سروکار رکھنا پڑتا ہے، دماغ سے، دماغ والوں سے نہیں۔ وہ کوائف بخشتا ہے، افکار نہیں دیتا۔ وہ گپ کرتا ہے، درس نہیں دیتا۔ وہ دل بہلاتا ہے، دل کا درد نہیں ابھارتا۔ اس کا کام خوش گفتاری ہے، مسلک وآئین کی تبلیغ واشاعت نہیں۔ اس کا طائرآزادو پرفشاں رہتا ہے۔

سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر دینا اور غیر سنجیدہ کو سنجیدہ بنا دینا، معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کی نیرنگئ نظر کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ پارلیمینٹ کو ارہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کے نواہائے سمع خراش کو طرحی غزلیں!۔ وہ اسٹپنک کو محبوبۂ تقویٰ شکن کی ڈولی بنا سکتا ہے اور خوش نصیب لا کا کو جرنل ڈی گارل۔

۷۔ قصہ گوئی اور انشائیہ نگاری:

انشائیہ میں قصہ گوئی کا مطلق گزر نہیں۔ اس کی شریعت میں ''کہانویت'' کفر ہے۔ کچھ انشائیہ نگاروں کے یہاں یہ خیال اب بھی رائج ہے کہ انشائیہ میں کسی پُر لطف ہلکے پھلکے قصے یا دو چار پھڑ کتے ہوئے واقعات کا بیان احسن ہے۔ یہ خیال قطعاً درست نہیں۔ نثری ادب میں یہ صنف ''مضمون'' کے دائرے میں سما سکتی ہے۔ پر یہ کہانی کے ''حلقہ'' میں جگہ نہیں پا سکتی۔ ادب میں قصہ گوئی یا واقعہ نگاری کے لئے مختلف اصناف مقرر ہیں۔ یہ اصناف کہانی کی مختلف بھرپور، مکمل اور خوشنما صورتیں ہیں جن کی تشکیل وتعمیر میں فنی ضوابط وقیود کا لحاظ لازمی ہے اور جو تمثیلیہ' حکایت، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی سے موسوم ہیں۔ کہانی لکھنے یا پڑھنے کے لئے ہمارا ان اصناف سے رجوع کرنا لازمی ہے۔ ادب میں ان کے علاوہ، کہانی یا قصہ کے لئے کسی مزید صنفی شکل کا کوئی وجود نہیں۔

تو'انشائیہ''کہانی'' کی شکل قطعاً نہیں۔اس کی مقبولیت اور دل کشی کا سبب نہ قصہ گوئی ہے اور نہ واقعہ نگاری۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جو محض غیر سنجیدہ خیالات اور ذاتی تاثرات کی ترجمانی کے لئے وقف ہے۔کہانی یا قصہ یا واقعہ کی پیشکش کے لئے یہ صنف بالکل ناموزوں ہے۔اس صنف میں کہانی کو جگہ دینا گویا لوٹے میں چائے پینی یا پلانی ہے۔

روایتی طور پر ہر کہانی کی تشکیل وتعمیر کے لئے چند اجزا کا استعمال لازمی سمجھا جاتا ہے۔ادبی اصطلاح میں یہ اجزائے ترکیبی''اجزائے ثلاثہ'' کہے جاتے ہیں۔ یہ تین اجزا پلاٹ، کردار اور زمان و مکاں ہیں۔ انگریزی میں ان کے لیے CHARACTER , TIME & SPACE جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔

کہانوی اصناف کی تعمیر اجزائے ثلاثہ کے بغیر ناممکن ہے۔ انشائیہ میں اجزائے ثلاثہ کا استعمال کسی حال میں بھی جائزہ نہیں ۔ انشائیہ کی روح تاثرات ہیں، غیر سنجیدہ ذاتی تاثرات، لیکن کہانی کا مغز پلاٹ یا ماجرا ہے، طویل یا مختصر پلاٹ۔ انشائیہ میں خیالات کی بے ربطی اور بے ترتیبی ہوتی ہے۔قصہ گوئی یا واقعہ نگاری سے انشائیہ میں وہ تنظیمی وحدت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے لئے عیب ہوتی ہے۔کہانی میں اس کے برعکس، خیالات کا گزر نہیں۔ یہاں قصہ یا واقعہ کا دخل ہے اور اس قصہ یا واقعہ میں بھی ربط، ترتیب اور توازن شرطِ اولیں ہے۔انشائیہ کی دل کشی کی اصلی وجہ انتشارِ خیال یا ذہنی آوارگی ہے۔کہانی کی کامیابی کا راز اس کے برخلاف، اتحادِ خیال میں مضمر ہوتا ہے۔انشائیہ میں تاثرات کی بوقلمونی نظر آتی ہے اور کہانی میں واقعاتی اجزا کا تنوع ملتا ہے۔

انشائیہ میں واقعہ سے مصرف لیا جا سکتا ہے، مگر واقعہ نگاری جائز نہیں کہی جا سکتی۔انشائیہ نگار واقعات کے چھینٹے اڑا سکتا ہے، واقعات کے گھروندے نہیں بنا سکتا۔آپ جانتے ہیں کہ ہر واقعہ میں خواہ یہ چھوٹا سے چھوٹا کیوں نہ ہو بے شمار ناہموار

سالم وغیر سالم ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ ٹکڑے بیکار و مہمل نہیں کہ انفرادی طور پر ان کا کوئی وجود نہیں۔ ادب میں ان کی جزوی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ ان واقعاتی ننھے ننھے ٹکڑوں کو ہم عام طور پر ''لطیفوں و چٹکلوں'' سے یاد کرتے ہیں۔ ادب میں ان کا اصطلاحی نام محاضرات ہے۔ انشائیہ میں محاضرات کی قدر و قیمت بڑی اہم ہے۔ یہ اسی قدر اہم ہیں جتنی پُر تکلف دسترخوان پر انواع واقسام کی چٹنیاں۔ محاضرات کے استعمال، مناسب استعمال سے انشائیہ کی رنگا رنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ محاضرات سے لگے لپٹے جو نہایت خفیف ولطیف اثرات ہوتے ہیں اور ان کی ناہمواری میں جو دلکشی مگر حیرت فزا کیفیتیں ہوتی ہیں۔ قلبِ انشائیہ میں سما کر یہ باتوں کو زیادہ شگفتہ اور زیادہ دل گیر بنا دیتی ہیں۔ ان کے مصرف سے انشائیہ کی بہار میں بھی ایک نکھار آ جاتا ہے۔ انشائیہ نگار وہ ہے جو لطائف اور چٹکلوں کے علاوہ طرحدار اور رسیلے اشعار قولِ محال اور دور از کار تعلیمات وغیرہ سے خوب خوب کام نکلا ہے۔ ان کے مصرف سے باتوں میں کچھ ایسی نیرنگی پیدا ہو جاتی ہے جیسے جشنِ چراغاں میں آتش بازی کے نمونے بھی سامنے ہیں!

اسی طرح اس صنف میں سیرت نگاری کا بھی موقع نہیں۔ تخلیق شخصیت یا مرقعہ نگاری انشائیہ نگار کا کام نہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمارے سامنے خاکہ نگار کی ذات آتی ہے۔ انشائیہ شخصیت یا انفرادیت کے نقوش وجلوؤں سے کام نکالا جا سکتا ہے، مگر انھیں مرکزی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ نقوش وجلوے یہاں ذیلی مقام رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کہانوی اصناف میں ایک نہایت ہی قوی مگر خفیف مادہ ہوتا ہے جسے اصطلاح میں مرکزی خیال یا بنیادی خیال (Theme) کہتے ہیں۔

ہر افسانہ، ڈراما یا ناول میں کسی نہ کسی مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے۔ مطالعہ سے پہلے ہم اس سے لاعلم ہوتے ہیں۔ اگر چہ مطالعہ کے بعد ہم پر یہ عیاں ہو

جاتا ہے۔ یہ اسی بنیادی خیال کی کشش اور قوت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کہانی کے اجزائے ثلاثہ میں ایک گہرا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ پلاٹ، کردار اور زمان و مکاں میں اس سے ایسی اکائی پیدا ہو جاتی ہے جو مجموعی طور پر اجزائے ثلاثہ کے اتحاد کا سبب بن جاتی ہے۔ انشائیہ میں اس اکائی یا اتحاد کا مطلق گزر نہیں کیونکہ اس میں بنیادی خیال سے قلم کار کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ کسی بنیادی خیال کی پھولی پھلی شکل نہیں۔ اس کی کامیابی کا راز تاثرات کا اتحاد نہیں، ان کی بوقلمونی ہے۔

۸۔ مزاح نگاری اور انشائیہ:

اس صنف کو مزاح نگاری سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری قرار دینا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے۔ مزاح نگاری، ہجو نگاری، المیہ نگاری یا رومان نگاری قلم کاری کی مختلف ادائیں ہیں۔ یہ تحریروں کی صورتیں نہیں۔ ادبی نگارشات میں ان کی نوعیت توصیفی ہوتی ہے، صنفی نہیں ہوتی۔

تحریروں کا اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب کوئی خاص صورت اختیار کر لینا ایک بات ہے اور ان میں کسی خاص رنگ کا پایا جانا اور بات ہے۔ ادبی تحریروں کو ہمیں صنفی لحاظ سے دیکھنا چاہئے اور ادب پارہ یا اصنافِ ادب سمجھ کر انھیں جانچنا اور پرکھنا چاہئے۔ تحریروں کی ادبی شناخت کی پہلی منزل ہے۔ افسوس ہے اگر ہم اس بنیادی بات سے ہی لاعلم ہیں۔

تو، مزاح نگاری ایک وصف ہے صنف نہیں۔ یہ قلم کار کی فطرت یا طبع کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ وصف یا خصوصیت نثری تحریروں میں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور شعری تحریروں میں بھی۔ مزاح کو ذاتی طور پر میں انشائیہ کا جوہر خیال کرتا ہوں۔ یہ انشائیہ نگار کی سیرت کا خمیر ہے اور یہی اس کی قلم کاری کا روغن، کیفیہ نگار کی طرح محزوں یا قنوطی نہیں ہوتا۔ زندہ دلی اس کا مسلک ہے، خوش طبعی اس کی عادت اور شگفتہ

بیانی اس کا مذاق۔ انشائیہ نگار سیلانی ہوتا ہے، خفقانی نہیں ہوتا۔ اس کی وحشت میں غمنا کی نہیں طربنا کی ہوتی ہے۔ وہ سودائی بن سکتا ہے، پر مجنوں نہیں ہوسکتا ہے۔ وہ صحرانوردی کر سکتا ہے، سرنہیں پھوڑ سکتا۔ اس صنف میں نہ وا سوخت جیسی سوختنی و بے زاری ملتی ہے اور نہ مرثیہ جیسی سینہ کوبی ونواح خوانی۔ انشائیہ نگار کے لئے رجائیت نعمت ہے اور قنوطیت لعنت۔ یہاں ہمیں رونے رُلانے کے مواقع نہیں ملتے، ہنسنے ہنسانے کے بہانے ملتے ہیں۔

انشائیہ ادب کی وہ کمیں گاہ ہے جہاں قلم کار محفوظ ومطمئن بیٹھ کر جب اور جس پر چاہیے تیر چلا سکتا ہے۔ اکرام ودُشنام سے بے پروا ہوکر وہ ہر نام اور کام کی عظمت اور ذلت کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اپنی تابکاریوں کے اظہار واشتہار پر ہم انشائیہ نگار پر کوئی قانونی دفعہ نہیں چلا سکتے کیونکہ ادب کے اس گوشہ میں قلم کار کو ہر طرح کے بیان کی چھوٹ ہے۔ یہ گفتار کا وہ غازی ہے جیسے سات نہیں، سینکڑوں خون معاف ہیں۔ یہ بزم سرور کا وہ ساقی ہے جسے شراب میں کچھ ملانے کی اجازت ہے۔ اس کی مستی وقلندری سے باتوں کی سمیت اور سنگینی کافور ہو جاتی ہے۔ اس کی بہک اور سنک میں ایسا نشاط وکیف ہوتا ہے جو مزاج کو برہم نہیں کرتا اور خفگی کو دل لگی بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ میں کہی گئی باتوں کی تاثیر میں کسی خرابی یا خطرے کا امکان نہیں اور دراصل یہی منتہائے کمالِ انشائیہ ہے۔ اس کے برخلاف کسی ادبی تحریر میں نرم گرم یا تلخ وترش باتیں اگر غیر انشائیاتی رنگ میں قلم بند کر دی جائیں تو احمد جمال پاشا کے الفاظ میں ''خون خرابا" کی نوبت آسکتی ہے۔

انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں، ظرافت اور ہجو یعنی Humour & Satire۔ یہ انشائیہ کے دو شوخ رنگ ہیں۔ اس کی زعفران زار زمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب مواقع میسر ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا عام ہے،

اگر چہ اپنے پر دوسروں کو ہنسانا آسان نہیں۔ اس کے لئے ہمت اور قربانی کی ضرورت ہے۔ انشائیہ کی تیرگی دوسروں کی حماقت اور اپنی خفت دونوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بیک نگاہ یہاں آنکھوں کے تنکوں کے ساتھ بڑی بڑی شہتیریں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اچھے اور معیاری انشائیے سے اصلی ہنسی اور کھسیانی دونوں میسر ہوتی ہیں۔

ظرافت اور ہجو سے انشائیہ کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ انشائیہ کے وہ رنگ ہیں جس سے اس کی فضا میں دھنک برپا ہو جاتی ہے۔ یہ دھول خیالات سے اُڑائی جاتی ہے۔ یہ دھول دھپّا کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ظرافت کے لئے بالغ ذہن، نفیس طبیعت اور شائستہ مزاج کا ہونا شرط ہے، ورنہ ظرافت میں بھانڈ پن اور سوقیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ ظرافت نا مطابق خیالات سے پیدا کی جاتی ہے، نا مطابق واقعات سے نہیں پیدا کی جاتی۔ انشائیہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ پر، سینگ لگا کر لاتیں چلانا قابل تعریف نہیں بلکہ سینگوں کے بغیر بن جانا یا بنا دینا قابل تعریف ہے۔ اچھے انشائیوں میں ظرافت و ہجو کے رنگ نہایت پختہ ہوتے ہیں۔ یہاں ہجو کا دوررس اور ظرافت کا بلند پایہ ہونا لازمی ہے۔ یہ ظرافت اور ہجو کی معنی خیز لطافت کا سبب ہوتا ہے کہ ہنستے ہنستے ہم جیسے کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں۔

ہوشیار انشائیہ نگار وہ ہے جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر فائر کرنے کا طریقہ جانتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ PASSIVE اور INDIRECT انداز برتتا ہے۔ عام طور پر اس کے یہاں ترسیل کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ اولاً کبھی وہ ایسے لطیفے اور چٹکلے بیان کرتا ہے جن کے پس منظر ہماری سرفرازی و سربلندی کی پستیاں ابھر آتی ہیں۔ دوم کبھی وہ ہماری شخصیت کے اس پہلو کو چھبتے ہوئے اشعار اور حکیمانہ اقوال کے چوکھٹے میں فٹ کر دیتا ہے کہ خوبی اور خرابی از

خودنمایاں ہو جاتی ہے۔سوئم کبھی وہ آپ بے حجاب ہو کر ہیں مجوب ومنفعل کر دیتا ہے۔ ان مقاصد میں جس داؤ سے وہ زیادہ کام چلاتا ہے، وہ مزاح ہے۔ مزاح انشائیہ نگار کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ وہ طبعاً ظریف ہوتا ہے۔ خندہ زنی اور تبسم ریزی اس کی عمدہ صفت ہے۔ ہجو اور طنز و مزاح کی دو نہایت دشوار اور نازک قسمیں ہیں۔ان کے استعمال پر وہ درک رکھتا ہے۔ وہ ماہر ہجو نگار ہوتا ہے اور کامیاب طنز نگار بھی۔مزاح کے ذریعہ وہ نہ صرف اپنی مراد پوری کرتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے وہ تحریر میں ظرافت کے نت نئے پھول کھلا دیتا ہے۔رنگین،خوشبو دار اور خوشنما،جن کی شگفتگی کی جلد زائل نہیں ہوتی۔

دلیر اور شاطر انشائیہ نگار وہ ہے جو شب خون کا جگر رکھتا ہے اور مورچہ بدل بدل کر حملہ کرتا ہے۔تاک جھانک اور نظارہ بازی اس کی عادت ہے اور خوش بیانی اس کا سحر۔اس سحر سے دور کی کوڑیاں لاتا ہے جو سر پھروں اور سر چڑھوں کے بھوت اُتار دیتی ہے۔

انشائیہ نگار طبعاً ظریف ہوتا ہے مگر اس کی ظرافت کی مردم گزیدہ کی استہزا نہیں، یہ مردم جہاں دیدہ کی گرفت ہے، مصلحانہ اور منصفیانہ۔ یہ ظرافت مثبت توانائی رکھتی ہے جو اصل سے کھوٹ اور نقل سے خالص کو علاحدہ کر سکتی ہے۔ بڑا انشائیہ نگار وہ ہے جس کے آئینہ گفتار میں ناکردہ گناہوں کی حسرت اور کردہ گناہوں کی خفت نظر آجائے اور پڑھنے والے کو ایسا شعور و شادمانی نصیب ہو کہ وہ ریا اور ہنر میں تمیز کر سکے۔

۹۔غیر سالمیت:

انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت اس تحریر کی غیر سالمیت ہے جو اس صنف کے موضوع اور فارم دونوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ نثری اصناف میں مقالہ اور شعری اصناف میں نظم اور رباعی ۔ یہ تین ایسے منفرد سانچے ہیں جو تحریر کی نہایت صاف ،سجل

اور ہموار صورتیں ہیں۔ ان اصناف کا بنیادی وصف قلم بند باتوں کی داخلی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم دوسرے الفاظ میں کوائف و افکار کی عضویاتی ترکیب یا باطنی ربط پر دلالت کرتی ہے اور ان تحریروں کی ساخت میں سالمیت اور استحکام پیدا کر دیتی ہے۔ قلم بند باتیں پھر ایک واضح صورت اختیار کر لیتی ہیں اور انھیں ایک بے داغ ستھرا ادب خوشنما پیٹرن نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ پیٹرن جو دراصل کوائف و افکار کی اندرونی اور ظاہری سالمیت کی ضمانت ہے، مثال کے طور صنف رباعی میں نہایت واضح ہوتا ہے۔

انشائیہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس صنف کا کوئی مقرر پیٹرن نہیں۔ یعنی نظم کی طرح اس صنف میں کسی مشکل تجربہ یا مقالہ کی طرح کسی مبسوط و مربوط بات کی گنجائش نہیں۔ قلم بند باتیں یہاں غزل کے شعر کی طرح آزاد ہوتی ہیں جس طرح غزل کے اشعار میں داخلی یا ظاہری ترکیب و ترتیب لازمی نہیں، انشائیہ میں بھی بے ترتیبی ناروا نہیں۔ اتنا ہی نہیں قلم بند باتیں یہاں مطلع و مقطع کی حد بندیاں بھی نہیں رکھتیں کہ باتوں کے آغاز و انجام کا علم ہو سکے۔ انشائیہ کی اس غیر سالمیت کو مشہور نقاد ڈاکٹر جونس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''AN IRREGULAR, INDIGESTED, NOT REGULAR AND ORDER BY PERFORMENCE......".

وہ اس صنف ادب کو قرار دیتا ہے یعنی ناہموار غیر متحدد باتوں کی اس بے ترتیب قلم بندی کو بحیثیت مجموعی وہ تحریر کا ایک لازمی وصف سمجھتا ہے اور انشائیہ کو قلم کار کا کوئی منظّم کارنامہ تصور نہیں کرتا۔ معیاری انشائیہ میں باتیں نیم فکری تاثراتی باتیں ہی ہمیشہ منتشر رہتی ہیں۔ یہ متحد نہیں ہوتیں۔ اس میں بہک اور چہک کی وہ دلآویز کیفیات ہوتی ہیں جو قلم کار کی ذہنی خوش خرامی کا خوش گوارہ نتیجہ ہیں۔ اس ذہنی کیفیت کو ڈاکٹر جانسن IT یسی IS A LOOSE SALLY OF THE MIND سے یاد کرتا ہے۔

ڈاکٹر جانسن نے اس سلسلے میں ایک لفظ (INDIGESTED) بھی استعمال کیا ہے، جو مجھے مکروہ اور گندہ محسوس ہوتا ہے۔ذاتی طور پر مجھے اس خیال سے اختلاف ہے کہ ادب کی اس صنف میں قلم بند باتیں غیر ہضم شدہ اور ناپخت مواد کی نوعیت رکھتی ہیں یا انشائیہ خام ذہن کا عمل ہے۔اس بنیادی خیال سے کیسے انکار ہوگا کہ ہر تحریر خواہ نثری یا شعری جو فن پارہ کا یہ مرتبہ رکھتی ہے قلم کار کی فنکارانہ تخلیقی قوتوں کی آنچ سے بالیدگی پاتی ہے ۔ہر قسم کے خام اور خارجی مواد ،جنہیں ادیب یا شاعر استعمال کر کے ہی اس کی آتشِ نہاں سے پک کر زمین نہ صرف اپنی ظاہری شکل وصورت کھودیتے ہیں بلکہ یہ تحلیل ہوکر اس کے فن کا کیمیائی جز بن جاتے ہیں۔

جارج سین بری نے اس ذہنی کیفیت کے اظہار کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"AFTER DINNER MONOLOGUE OF AN INTERESTING AND WELL INFORMED MAN..."

آپ جانتے ہیں کہ ڈنر عام کھانا نہیں ہوتا اور ڈنر کے بعد ڈرائنگ روم کی نشست عام نشست نہیں ہوتی۔ایسی دلچسپ اور پُر لطف ساعت میں ہی دانا وفرزانہ کے انداز گل افشانی گفتار میں جو ترنگ اور تیور، جو بہار اور نکھار ہوگا وہ کس درجہ داد کا مستحق ہوگا ،منٹوں منٹوں میں بدل جانے والے وہ موضوعاتِ تکلم جو کچی باسمتی کی خوشبو اور غالبؔ کی تمثیلی شاعری،طلبا کا ہڑ بونگ اور جاپانی میٹرالن شرٹ چھبتی ہوئی گولائیاں اور مکانوں کی قلت، رفیع کی گلوکاری اور خلا بازوں کی کامیاب مراجعت جیسے مختلف سامنے کے موضوعات ووسائل پر مبنی ہوں گے۔متکلم کی زبان و بیان سے سامعین فرحت انگیز اثر قائم کر دیں گے۔اس نے تکلف اور برجستہ ''خوش گپی'' کی امتیازی خصوصیت ،آپ غور، کریں گفتگو کے مسلسل موضوعات کی بوقلمونی اور ایک واحد تیور (Mood) یا ترنگ کا بہاؤ ہوگا۔

الغرض اس صنف کی منفرد خصوصیت باتوں کی بے ترتیبی ہے۔ غیر سالمیت اس تحریر کی کشش ہے، وہ کشش جو آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں میں نظر آتی ہے یا زلفِ پریشاں کا حسن دل پذیر ہوتی ہے غیر سالمیت سے اس تحریر کی ساخت میں لچک، نرمی اور ناہمواری آتی ہے۔

۱۰-وحشی خیالات کی تربیت ترتیب:

غالبؔ کہتے ہیں ''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے''۔ تمام عالم نہ سہی پر انسانی دماغ بے جا طور پر ایک بڑا ریلوے جنکشن ہے جہاں انواع و اقسام کے چھوٹے بڑے خیالات معمولی و غیر معمولی، رنگین و بے رنگ، اَنمل بے جوڑ خیالات، ہر لمحہ آتے، گزرتے اور ٹھہرتے رہتے ہیں۔ ان کی آمدورفت اور ان کی رفتار و قیام ہمارے فکر و تصور اور مشاہدات کی قوت وزور کے بموجب ہوتی ہے۔ یہ خیالات آپ نے اندازہ کیا ہوگا قطعاً خود رو، آزاد اور وحشی ہوتے ہیں اور ان پر بہ آسانی کنٹرول اور قدرت مشکل ہے۔

ذہنی کیفیت کی اس ہلچل، اس انتشار اور اور اس بے ترتیبی کی حسن کارانہ پیش کش کے لئے ادب میں جو سب سے موزوں اور مفید ذریعہ ہے، وہ انشائیہ ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ وحشی اور آوارہ گرد خیالات کی گرفت اور ان کی تربیت کے لیے انشائیہ سے بڑھ کر دوسری کوئی صنفِ ادب مناسب نہیں۔ جس طرح جنگلی جانوروں کو انسان نے اپنی فہم و فراست کے ذریعہ پالتو اور کارآمد بنالیا ہے، انشائیہ نگاری کے ذریعہ خیالات کی وحشت اور آوارہ گردی اور ان کی شورش و یورش پر قابو و قدرت پانا آسان ہے۔ اس ذہنی کیفیت جسے علمِ نفسیات میں ''شعور کی زیریں رو'' کہتے ہیں کی ترجمانی میں مغربی کہانی کاروں نے ناول کے سانچے سے بھی مدد لی ہے۔ ان میں شہرۂ آفاق مصنف جیمس جوائس کا تجربہ سب سے نمایاں ہے اور اس کا

مشہور ناول ULYSSIS اس کی مثال ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' بھی اسی نہج کی تخلیق ہے۔

تو، انشائیہ وحشی خیالات کی گرفت کی نہایت مناسب صورت ہے جو ذہن اور فن کے مطالبے بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔ انشائیہ کی اس خصوصیت کے پیشِ نظر ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ نثری ادب کی یہ تحریر عصر حاضر کی بے چینی اور پریشانی کے اظہار میں قلم کار کا بہت دور تک ساتھ دے سکتی ہے۔ اس ضمن میں آج کا ایک تازہ مسئلہ بے اختیار سامنے آجاتا ہے جس کا ذکر ضروری ہے اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس پس منظر میں ہم ادب کی اس صنف کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ کرسکیں گے۔

اس صدی میں انسان ترقی وتہذیب کی اس بلندی پر جا چکا ہے جو عہد گزشتہ کی کسی دہائی میں نظر نہیں آتی لیکن ساتھ ہی اس بے نظیر کامرانی کا دوسرا رخ بھی ہے۔ یعنی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عہد حاضر کی تہذیبی برکتیں بے سود اور بے کیف محسوس ہو رہی ہیں۔ قدروں کی شکست وریخت اور متواتر بربادی سے زندگی کی زیب وزینت ختم ہوگئی ہے۔ معاشرہ میں خواہ یہ مغربی ہو یا مشرقی، ایک نراجی کیفیت طاری ہے۔ آج کا انسان اس خستہ اور بے برکت زندگی میں ہر طرح کے قیود وضوابط کو توڑ کر آسودگی کے انجانے پُرامن گوشے کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے۔

مہذب زندگی کے یہ بدشکل اور بد ہیت نمونے بلاشبہ آنے والے عظیم خطرے کی آہٹیں ہیں۔ یہ خطرہ کیا ہے؟ اس ہیجان وانتشار کے اسباب کیا ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ نہایت اہم سوالات ہیں جن پر اس جگہ گفتگو کرنا میرا مقصد نہیں کہ یہ خارج از موضوع ہیں۔ اس ذہنی بے چینی کے آثار آج ہر ادب میں موجود ہیں کہ آپ کا ہر ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار بھی ایک ادیب ہے اور

انشائیہ بھی تحریر کی ایک ادبی صورت ہے۔ جدید ذہن اور زمانہ کے نقش ونگار انشائیہ کے کینوس پر کامیابی کے ساتھ اتارے جاسکتے ہیں۔

۱۱۔انشائیہ کی تعریف:

ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے۔ صنفی اور فنی لحاظ سے ''یہ ادب پارہ" ہمارے یہاں نو وارد ہے، اور اس لئے یہ محتاج تعارف ہے اور محتاج تعریف بھی۔ انگریزی تعریفوں میں مجھے جانسن کا فقرہ بہت موزوں اور جامع نظر آتا ہے۔ اس صنفِ ادب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

"IT IS A LOOSE SALLY OF MIND"

یعنی انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔ لفظ ترنگ انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی وہ خاص وصف جس میں تیزی اور جولانی ہے مگر حدت وسوز نہیں ہیں جس میں انتشار ہے، مگر بکواس نہیں۔ وہ وصف جو دل کے ساتھ دماغ کو بھی متاثر مطمئن کردیتی ہے۔

انشائیہ بالغ و پختہ ذہن کی ایک ترنگ ہے، آزاد و پُرنوا جیسے مقدس محفلِ سماع میں کسی اہل کیف کا ایک نعرۂ بے اختیار!۔ انشائیہ کے لطف ودل کشی کا اصل راز حکمت وحماقت کا اتصال ہے۔ یہ حیوانیت اور ملوکیت کا امتزاج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرشتے کبھی نہیں ہنستے، یہ مسکرانا بھی نہیں جانتے، مگر شیاطین ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں کہ یہ ان کی تابہ کاریوں کا پھل ہوتا ہے۔ انسان اس کے برخلاف ہنسنے کی لذت جانتا ہے۔ یہ ہنستا ہے اور دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ وہ اپنے آپ بھی ہنس لیتا ہے۔

انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی ہے۔ اس میں دل بیتی اور پرائی بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ یہ خوش خرام ذہنی لہروں کی پیدا وار ہے جو کبھی کبھی چلتی ہیں اور دبے پاؤں آتی ہیں۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا

ایک شرارہ ہوتا ہے جسے ہم ادب کی پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔انشائیہ نثر کی غزل ہے جوواردات قلب سے زیادہ محشر خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

انشائیہ کو ہم عام طور پر ایک پُرلطف اور جاذبِ توجہ تحریر سمجھتے ہیں اور اسے ایک دل چسپ ادبی مضمون قرار دیتے ہیں۔ادب مہذب ومتمدن انسان کی حسّی و ذہنی کاوشوں کا تحریری عکس ہے۔یہ بے شمار سرسبز و بے شکل نباتات کا سدابہار خطِ استوا نہیں۔ہم ادب کو نگارشارت کا جنگل نہیں کہہ سکتے۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تحریر معنوی حسن و دل کشی کے باوجود ادب میں اپنی کوئی جگہ نہیں بنا سکتی۔ادب زندہ اور صحت مند تحریریں اپنی مخصوص شکل وصورت اور وضع قطع رکھتی ہیں۔خیال کو محض تحریری جامہ میں ملبوس کر دینا نہ ادب ہے نہ قلم کاری۔قلم کاری جو آرٹ یا فن کی عظمت رکھتی ہے،محسوسات کی صورت گری ہے۔یہ ایسی صورت گری ہے جس میں مصوری کی نیرنگی،موسیقی کا ترنم اور رقص کا توازن ہوتا ہے۔انشائیہ تحریر کی ایک مخصوص صورت جس کی ادب میں ایک صنفی حیثیت ہے۔یہ قلم کاری کا ایک حسین اور دل کش نمونہ ہے۔

اردو زبان وادب کے اس دورِ زبوں حالی میں جب ہماری عزت وآبرو محض مشاعرے رہ گئے ہیں،۔یہ بڑی امید افزا علامت ہے کہ ہمارے اہلِ قلم اور اربابِ نقد انشائیہ کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔یہ خوشی کی بات ہے کہ آج کی نئی پود انشائیہ نگاری میں دل چسپی لے رہی ہے،یہ کھلی حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والوں کے لئے اس وقت اس صنفِ ادب میں نام اور مقام حاصل کرنے کے لئے اچھے اور احسن مواقع حاصل ہیں.

☆......ڈاکٹر انور سدید

انشائیہ اور عصری آگہی

بظاہر یہ بات تعجب انگیز نظر آتی ہے کہ مختلف اصنافِ ادب کے فروغ وارتقاء کا سلسلہ مخصوص ادوار اور زمانوں کے ساتھ متعلق ہوتا ہے تاہم اگر ادب کا تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نظر نہیں آتا کہ بعض اصناف مخصوص زمانے میں فروغ وترقی کی منزل طے کرتی ہیں۔ اردو غزل کی روایت قدیم اور بہت مضبوط ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے عروج دور میں غزل کا فروغ وارتقا رک سا گیا اور اس دور میں نظم کو زیادہ اہمیت ملی۔ ایک زمانے میں افسانے کی صنف صرف صورتِ واقعہ کے بیان تک محدود تھی لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں کہانی کا فریم ٹوٹ پھوٹ گیا اور علامتی اور تجریدی افسانے کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس پہلو کو مدنظر رکھیں تو یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ اچھا انشائیہ ہر زمانے میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہر چند انشائیہ آزاد ماحول کا تقاضا کرتا ہے اور پابندی ومحبوس فضا کو قبول نہیں کرتا۔ تاہم امر واقعہ یہ بھی ہے کہ انشائیہ صرف اس دور میں پنپ سکتا ہے جب ماحول اور حالات سے فرد ایک شدید بے اطمینانی کے احساس میں مبتلا ہو۔ ڈاکٹر جانسن نے سٹیل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''وہ غیر مطمئن عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے ایسے لکھتا رہا اور اس نے نثر میں غیر جارحانہ اور سرد رویئے کی عکاسی کر کے سیاست کی پیدا کردہ گرمی کو معتدل بنانے کی کاوش کی ہے''۔

اس زاویئے سے برصغیر کو اس کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھئے تو

آزادی سے پہلے کا زمانہ شدید سیاسی تحرک اور نعرہ بازی کا زمانہ نظر آتا ہے۔اس قسم کا ماحول انشائیہ نگاری کے لئے سازگار نہیں، آزادی کے بعد فرد نئے معاشرے کی تعمیر وتشکیل میں مصروف ہوگیا۔اس دور میں اس نے نہ صرف آسودگی کے ایک خودساختہ تصور کی پرورش کی بلکہ مستقبل کے بارے میں بعض ما فوق الحقیقت امیدوں کی افزائش بھی کی۔اسے ماحول سے بےاطمینانی کا احساس تو اس وقت ہوا جب اس کے خیالی مستقبل کے خواب چکنا چور ہوگئے اور سیاسی و معاشرتی مطلع ابر آلود ہوگیا۔شاید یہی وقت تھا جب انشائیہ کی تخلیق عمل میں آسکتی تھی۔ چنانچہ اسی دور میں اردو انشائیہ وجود میں آیا اور اس نے زندگی کی ناآسودگی کو کم کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ ہندوستان کے اطراف وجوانب فضا قدرے مختلف تھی۔ چنانچہ اردوزبان کے دوسرے مسکنوں میں انشائیہ کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔

انشائیہ اس لحاظ سے ایک غیر مقصدی صنفِ ادب ہے کہ یہ فرد کو نہ تو انقلاب کے منفی انداز کے عمل پر آمادہ کرتی ہے اور نہ اسے عرفان کی کسی منزل سے ہم کنار کرنے کی دعوی دار ہے۔لیکن انشائیہ چونکہ فرد کو حقیقت کے ایک نئے مدار سے آشنا کرتا اور اس کو بہجت کی ایک نئی کیفیت سے متعارف کراتا ہے، اس لئے یہ اپنی ایک افادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔انشائیہ اندھیرے کے جگنو کی طرح ہے جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بنتا۔انشائیہ میں تھوڑی سی دیر کے لئے اس معصوم بچے کی سطح پر لے آتا ہے جو سنگریزوں سے جھولی بھر کر اتنا خوش ہو جاتا ہے جتنا کہ ایک شہنشاہ جواہرات کے ڈھیر پر کھڑے ہوکر بھی خوش نہیں ہوتا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ انشائیہ کو ایک صنفِ ادب کے طور پر کسی مقصد کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکا۔یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کو ان ممالک میں زیادہ فروغ ملا ہے جہاں ادب کو مقصد کا غلام نہیں بنایا جاتا اور بعض ایسے ممالک میں جہاں ادب کو نظریاتی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے

وہاں انشائیہ کی کونپل پھوٹ نہیں سکی۔ یوں دیکھیں تو ترقی پسند ادبا کے ہاں انشائیہ کو قبول کرنے کا میلان بھی نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ میں اپنے عہد کی آہٹ موجود نہیں ہوتی۔ ایمی دی گارماں کے مطابق:۔

> ''فن کار اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے''۔

چنانچہ انشائیہ میں بھی ادیب انکشافِ ذات کرتا ہے تو وہ اپنے زمانے کو نظر انداز نہیں کرتا۔ انشائیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں عصری آگہی کے آثار تخلیق کی سطح کے ساتھ چپکے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ یہ ایک مخصوص عمل سے گزرنے اور منقلب ہونے کے بعد ہی قاری کے سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ میں عصری آگہی معروضی نہیں بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو بھی ایک نئی نوع کے تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اس خوشبو کی مانند ہے جو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے لیکن جسے چھونا ممکن نہیں۔

انشائیہ کے جنم میں اس حقیقت کا عمل دخل زیادہ ہے کہ جب مونتین نے اپنی عصری آگہی اور ذاتی تجربے کو زمانے کے سامنے آزادہ خیالی سے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو غیر منضبط تحریروں سے انشائیہ وجود میں آگیا۔ مونتین فطری طور پر داخلیت پسند تھا، اسے زندگی کی بیشتر دنیاوی آسائشیں میسر تھیں۔ اس کا عہد فطری تموج کا عہد تھا، زندگی اور مابعد الطبعیات کی جنونی جستجو نے ہر خاص و عام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، سماجی سطح پر شدید بداطمینانی موجود تھی۔ اس دور میں مونتین نے ایسی تحریریں پیش کی جن میں نہ صرف مونتین خود موجود تھا بلکہ ان تحریروں میں اس دور کا فرانس بھی سانس لے رہا تھا۔

بلاشبہ مونتین نے زیادہ تر اپنی ذات کو منکشف کیا لیکن اس عمل میں اس نے اپنے زمانے سے اغماض نہیں برتا۔ چنانچہ مونتین کے نثر پاروں سے اس کی سوانح

عمری تو مرتب نہیں ہوسکتی لیکن ان سے فرانس کی تہذیبی زندگی کے نقوش اور اس عہد کی سرگرمیوں کا احوال مرتب کیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مونتین نے متعدد تجربات سے ایک کلی حقیقت کا استنباط کیا اور وہ روح عصر جسے فرانس کے فکری انتشار میں سمیٹنا مشکل تھا اس کے افکار پریشاں میں یوں سمٹ آئی کہ پورا فرانس اس آئینے میں اپنی فطرت کا مشاہدہ کرنے لگا۔ چنانچہ مونتین کی اس خدمت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے فرد کو عصری حقیقت کا ایک نیا اور انوکھا روپ دکھانے کی کاوش کی۔ بیکن نے اپنے عہد کے متصادم میلانات اور برسر پیکار تصورات کو عصری آگہی کی نئی تعبیر سے ایک مثبت جہت دینے کی کاوش کی اور فرد کو ممنوعات کے اژدحام سے نکال کر فطری سطح پر زندگی گزارنے کی دعوت دی۔ انشائیہ کی یہ ابتدا بے حد معنی خیز تھی تاہم اسے عصری آگہی سے براہ راست متعلق کرنے میں ایڈیسن اور سٹیل نے زیادہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ انشائیہ نگار چونکہ اخبارات کے ساتھ وابستہ تھے اس لئے ان دونوں نے انشائیہ کو تہذیبی اصلاح کا وسیلہ بنانے کی کاوش کی۔ چنانچہ ایڈیسن نے انشائیہ کو ایسی مقراض قرار دیا ہے جس سے باغ کی روشوں کی شاخ تراشی کی جاتی ہے۔

انشائیہ میں عصری آگہی اپنے تصور کو جامد صورت میں پیش نہیں کرتی بلکہ اس کا مدار بھی ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ کبھی انشائیہ نگار اپنی ذات کے ایک نکتے کے انکشاف سے زمانے کو گرفت میں لے لیتا ہے اور کبھی زمانہ کائنات کے زینے سے ذات کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز یا ترش ردعمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لئے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا دریچہ کھول دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر انشائیہ معاشرے کے اعمال وافعال کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ہر لرزش کو مہکے ہوئے پھول کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور یوں انشائیہ نگار کی لوحِ دل سے جو نقش بھی ابھرتا

ہے اس میں زمانے کی روح موجود ہوتی ہے۔

اردو کے بیشتر انشائیہ نگاروں نے بھی لمحے کی چاپ کو بگوش ہوش سننے اور عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کاوش کی ہے، مثال کے طور پر انشائیہ ''چوری سے یاری تک'' از وزیر آغا میں انشائیہ نگار نے چوری کے پیشے پر انشائی نظر ڈالی اور نہ صرف تاریخ و تہذیب کی بعض معروف کروٹوں کو سمیٹ لیا بلکہ مویشیوں کی چوری سے لے کر ثقافت کی نقالی تک سرقے کے بہت سے زاویوں کی طرف خوش طبعی سے اشارہ بھی کر دیا۔ کامیابی حاصل کرنا ایک صحت مند عمل ہے، لیکن موجودہ دور میں کامیابی کا ناجائز حصول ایک عصری حقیقت بن چکا ہے۔ انشائیہ'' کامیابی'' از اکبر حمیدی میں انشائیہ نگار اس عصری حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن جراحت پیدا کئے بغیر قاری کی زمام فکر ایک نئی اور صحت مند ڈگر پر ڈال دیتا ہے۔ انشائیہ'' تمبا کو نوشی'' از جمیل آذر میں انشائیہ نگار کا مقصد اس قبیح عادت کی ضرر رسانیوں کی طرف توجہ دلانا نہیں لیکن اس حوالے سے عصر حاضر میں پلنے والی انائے کاذب اور تکبر بے جا کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ انشائیہ'' جال'' از سلیم آغا قزلباش میں غیر ملکی امداد سے پیدا ہونے والی ذہنی غلامی کی طرف بالواسطہ اشارے ملتے ہیں۔ انشائیہ'' کرسی'' از سلیم آغا میں انشائیہ نگار نے عصری آویزش اور سماجی کشمکش کا ایک زاویہ کرسیوں کی جنگ میں دیکھا ہے۔ وہ اس موضوع پر ایک حساس ادیب اور آسودہ انسان کی نظر ڈالتا ہے اور پست مقاصد میں ملوث ہوئے بغیر بلند تر مقاصد کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں کے اجمال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی و سماجی تموج، فکر و نظر کے طغیان اور تہذیبی و معاشرتی کروٹوں پر ایک حساس اور تجربہ کار ادیب کی نظر ڈالتا ہے اور عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے اور یہ تمام عمل کچھ اس طرح سے ظہور پذیر ہوتا ہے

کہ انشائیہ نگار زمانے کے مواج سمندر میں گہرا غوطہ لگانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی صورت میں کھولنے لگتا ہے تو انشائیہ نگار انہیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ چنانچہ میری نظر میں انشائیہ لکھنا محض اظہار ذات ہی نہیں بلکہ یہ ایک کریمانہ عمل بھی ہے۔

☆...... پروفیسر مشکور حسین یاد

انشائیہ بطور ایک اصطلاحِ ادب

مجھے اپنے اس مختصر سے مضمون میں یہ نہیں بتانا کہ انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے کب ظہور میں آیا۔ اسے کس نے عربی کے لفظ انشا سے انشائیہ کی صورت بخشی۔ محمد حسین آزاد یا مہدی افادی نے سب سے پہلے اپنی تحریر میں استعمال کیا یا ''ترنگ'' کا دیباچہ لکھتے وقت 1940 میں اختر اورینوی نے اسے خاص معنی میں برتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ 1957ء تک اردو میں اس لفظ نے انگریزی کے لفظ ''ایسّے'' کی جگہ استعمال ہونے کا رواج نہیں پایا تھا۔ انشائیہ کو ''ایسے'' کے لئے 59-1958 میں مختص کیا گیا۔ بہرحال انشائیہ کے لفظ کی اس طرح تحقیق کرنا میرا کام نہیں، یہ کسی محقق کے لئے چھوڑتا ہوں۔

میں تو صرف یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اردو والوں نے جو لفظ انشائیہ ''ایسّے'' کی جگہ استعمال کرنا شروع کیا ہے، اپنے معنی کے اعتبار سے 'ایسے' کے لفظ سے کہیں زیادہ مناسب اور موزوں ہے بلکہ سچ پوچھئے تو مناسب اور موزوں کے الفاظ بھی لفظ انشائیہ کی وسعت اور ہمہ گیری کو واضح نہیں کرتے۔ 'ایسے' کے معنی تو محض کوشش کرنے یا قدم اٹھانے کے ہیں اور یہ معنی کسی طرح بھی ان کے عمق اور افق کا احساس نہیں دلاتے جو لفظ انشائیہ کے معنی میں پوشیدہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ جب کوئی لفظ ایک اصطلاح کی صورت اختیار کرتا ہے تو اپنے معنی میں محدود ہو جاتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ لفظ ایک اصطلاح بن جانے کے

بعد بھی اپنے اصل معنی یعنی "لغوی معنی" سے اصطلاحی حوالے کے ساتھ بالکل قطع تعلق نہیں کر لیتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس کے لغوی معنی ہی کے باعث اس کے اصطلاحی معنی پر صحیح طور پر روشنی پڑتی ہے۔ اصطلاح تو محض اس لفظ کے ظاہر کو محدود کرتی ہے۔ لفظ کے باطن کی وسعت اور گہرائی جوں کی توں رہتی ہے، لہٰذا کسی لفظ کو اصطلاح بنانے سے پہلے اس کے اصل معنی کو پیشِ نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ اس بات کو دوسری طرح سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی لفظ کا بطور اصطلاح تجزیہ کرنا مقصود ہو تو ہمیں پہلے اس لفظ کے اصل معنی پر غور کرنا چاہئے تا کہ ہم یہ پتہ لگا سکیں کہ اس لفظ کو اصطلاح کا رتبہ دینے سے قبل کہاں تک دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ غزل کو لیجئے۔ سب جانتے ہیں یہ غزال سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی ہرن کی اس درد بھری آواز کے ہیں جو اس کے منہ سے اس وقت نکلتی ہے جب شکاری کتے اسے شکار کے لئے دبوچ لیتے ہیں۔ غزل کے ان لغوی معنی کو سامنے رکھ کر جب ہم غزل کے اصطلاحی معنی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس صنف سخن کے لئے یہ لفظ نہایت سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ غزل کے لغوی معنی میں غزل کے اصطلاحی معنی کی روح پوشیدہ ہے اور جس چیز کو ہم تغزل کہتے ہیں وہ اس لفظ کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ جیسے ہی غزل کا لفظ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو جہاں ہرن ایسا خوبصورت جانور صحرا کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتا دکھائی دیتا ہے، وہاں ہمیں اس کی گردن پر چھری چلتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ گویا ہمیں بیک وقت زندگی کی رعنائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور اس کے درد و کرب کی شدت کا بھی۔ بس یوں سمجھئے ہم غزل کے لفظ کو کیا دیکھتے ہیں، تغزل کے جملہ مفاہیم مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔

فرانسیسی ادیب مونتین کو ہم اس بات کی داد تو ضرور دیں گے کہ اس نے سب سے پہلے 1571 میں 'ایسے' کا لفظ ایک ادبی اصطلاح کے طور پر پوری دنیائے

ادب کو دیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بطور اصطلاح یہ لفظ اپنا مفہوم بطریق احسن ادا نہیں کرتا اور اس کی اولین وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس لفظ کے لغوی معنی اس وسعت اور گہرائی کے حامل نہیں ہیں جن کا تقاضا اس کے اصطلاحی معنی کرتے ہیں، لیکن یہاں ہم لفظ 'ایسّے' کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ موئتین نے ادب کے سرچشمہ کو محسوس تو کر لیا، لیکن وہ پوری طرح اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا احساس نہ کر سکا۔ اگر موئتین کو یہ بھی احساس ہو جاتا کہ جس طریق اظہار کو اس نے ایسے کا نام دیا ہے وہ محض ایک صنف ادب نہیں بلکہ ادب کے اظہار کا منبع و مصدر اور سرچشمہ ہے تو مجھے یقین ہے وہ اس کا نام ''ایسے'' ہرگز نہ رکھتا۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اور آپ جانتے بھی ہیں، 'ایسے' کے معنی کوشش یا اقدام کے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے یہ معنی انسان کے اس بے ساختہ فطری اور تخلیقی ادبی اظہار کی روانی کا ساتھ کہاں دے رہے ہیں جو اس طریقِ اظہار کی جان ہے، اس لئے میرا کہنا یہ ہے کہ لفظ انشائیہ فرانسیسی زبان کے لفظ 'ایسے' سے کہیں زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ انشائیہ میں تو تخلیقی کیفیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میرا مطلب ہے انشائیہ کا لفظ تو بنا ہی ''انشا'' سے ہے جس کے معنی تخلیق کرنے کے ہیں۔ دوسری طرف 'ایسے' کے لغوی معنی کوشش یا اقدام کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے یہاں اس خلاقانہ فطری بہاؤ کا دور دور تک بھی نشان نظر نہیں آتا، جس فطری بہاؤ کو ایک انشائیہ یا ایسے کی بنیادی خصوصیت کہا جاتا ہے۔ کوشش یا اقدام میں تو ارادہ کا دخل ہوتا ہے یعنی جب تک انسان ارادہ نہ کرے اس کے کسی عمل کو کوشش کا نام نہیں دیا جا سکتا اور جو کام اس سے از خود سرزد ہوتے ہیں وہ کوشش کے زمرے میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ ادھر ادب کے جس طریق اظہار کو 'ایسے' کہا جاتا ہے وہ ہر تخلیقی عمل کی طرح ارادہ سے زیادہ عمل کا متقاضی ہے، گویا کوشش میں جو تکلف شامل ہوتا ہے وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرے اس

کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ کسی کوشش کے بغیر وجود میں آجاتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ انشائیہ کو یا اس کی تخلیق کو کوشش کا نام دینا مناسب نہیں۔ اگر انشائیہ کو محض ایک کوشش کا درجہ دیتے ہیں (جیسا کہ ایسّے کے لفظ سے ظاہر ہے) تو ہمارے لئے اس کے تخلیقی عمل کی صحیح تعریف کرنا ممکن نہیں رہتا۔ تخلیقی عمل کے لئے بے تکلفی بے حد ضروری ہے اور کوشش خواہ کتنی بھی آزادی سے کی جائے اس میں تکلف کسی نہ کسی طور در آتا ہے۔ کہا جاتا ہے مونتین نے انکسار کے طور پر اپنی اس ادبی کاوش کو''ایسے'' کا نام دیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن یہاں میں پھر یہی گزارش کروں گا کہ اگر مونتین نے انکسار میں آ کر یہ نام رکھ لیا تھا تو انکسار کا تعلق محض انکسار کرنے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔ ایک ادبی اصطلاح کو وضع کرتے وقت اگر اس کو وضع کرنے والا فقط اپنی ذاتی چیز سمجھتا ہے اس حد تک تو ہم اس نام کو درست سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر یہ اصطلاح عام ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی کو پس منظر میں رکھ کر گفتگو کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں''ایسے'' کا لفظ فرانسیسی زبان میں عربی سے لیا گیا ہے۔ عربی میں''سعی'' کوشش کو کہتے ہیں اور اس میں''ل''لگا کر یعنی السعی کہہ کر اس کوشش کو خاص کوشش کے معنی دیئے گئے ہیں۔ گویا ''ایسے'' کے معنی خاص کوشش کے ہوئے۔ اس طرح غور کیا جائے تو کوشش کہہ کر اسے معنوی اعتبار سے عام کوشش سے جدا کر دیا گیا ہے اور یوں جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہوا ہے یہ کوشش سپاٹ اور بے کیف نہیں رہ جاتی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوشش کو خاص کہہ کر اس میں ادبی رنگ پیدا کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ کوشش عام کوشش نہیں ہے بلکہ ایک ادیب کی کوشش ہے۔ میں سمجھتا ہوں''ایسے'' کے لفظ کو بطور اصطلاح اپنانے کے حق میں جو سب سے بڑی بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہی ہے کہ

ادیب کی کوشش صرف فرانسیسی ادیب مونتین کی کوشش نہیں بلکہ تمام ادیبوں کی کوشش ہے اور یوں جہاں اس لفظ میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے وہاں انکسار کی شمولیت بھی محض کسی ایک ادیب کا انکسار کہلانے کی حد کو پھلانگ جاتی ہے۔ تخلیقی ادب کے لئے ادیب کا منکسر المزاج ہونا ازبس ضروری ہے۔ انکسار خصوصیت کے ساتھ ایک ادیب کا انکسار اس کی خلاقانہ صلاحیتوں کا ہی آئینہ دار نہیں ہوتا، اس کے تخلیقی امکانات کا بھی پتہ دیتا ہے۔ میں لفظ ''ایسے'' کے حق میں بطور اصطلاح اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس لفظ کی ان جملہ خوبیوں کے باوجود میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ انشائیہ کا لفظ ایسّے کے لفظ سے پھر بھی زیادہ واضح المطالب ہے اور کوشش کو خاص کوشش کہنے کے باوصف ہم اس میں سے انسانی ارادہ کو خارج نہیں کر سکتے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ انشائیہ کے لفظ میں جو ایک تخلیقی اضطرار کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ہمیں ''ایسّے'' کے لفظ میں پھر بھی نظر نہیں آتی۔ انشائیہ کا لفظ تو ہمیں براہِ راست تخلیقی اضطرار کا احساس دلاتا ہے اور بڑے بھرپور انداز میں دلاتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ میری ان چند معروضات کی روشنی میں لفظ انشائیہ پر بطور اصطلاحِ ادب غور فرمائیں گے تو یقیناً ہمارے اس اردو کے لفظ کو فرانسیسی اور انگریزی کے 'ایسے' کے لفظ سے بہتر پائیں گے۔

☆......کاچو اسفندیار خان

پیاز

کل ہی کی بات ہے کہ میری بیوی رسوئی میں زاروقطار رورہی تھی اور بڑے بڑے ٹسوے بہارہی تھی۔ دوڑ کر پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے کچھ برا کہا؟ یا میکے کی یاد آ گئی؟ بولی نہیں...دیکھتے نہیں.. پیاز کاٹ رہی ہوں۔ یہ پیاز دھنور کی ہے....بہت تیز ہے۔ سیدھے ہرتن بدن میں گھستا چلا جاتا ہے۔

اس بات پر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس فتنۂ روزگار اور موجب آزارِ مستورات یعنی پیاز پر ایک مضمون لکھ ڈالوں۔ اسکول میں ماسٹر جی کہا کرتے تھے کہ گائے پر مضمون لکھئے اور ہمیں مضمون لکھنا سکھاتے تھے۔

مثلاً گائے ایک پالتو جانور ہے۔ اس کے دو سینگ، دو کان اور ایک لمبی سی دم ہوتی ہے۔ گائے دودھ دیتی ہے جسے پی کر ہم مشٹنڈے ہو جاتے ہیں۔

اسی یادِ رفتہ سے شہ پا کر ہم نے پیاز پر مضمون لکھنے کے لئے اپنا وہ قلم اٹھایا جو ہماری شادی پر ہمارے سسرال والوں نے بطور 'تحفۃ النوشہ' دیا تھا۔

پیاز ایک گول مٹول ترکاری ہوتی ہے۔ اس کے پیندے پر بالوں کا ایک گچھا ہوتا ہے اور سر پر ایک لمبی زلف۔ یہ کیچوے کی طرح زیرِ زمین پلتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے بدن کی نمائش اس طرح کرتا ہے جس طرح نرم و نازک حسینائیں اپنے بدن کے کچھ حصوں کو طشت از بام کرتی ہیں۔ پیاز جوں جوں بڑا ہوتا ہے توں توں ایک کاغذی لباس زیبِ تن کرتا ہے۔ یہ اپنی ساری تندی اور تیزی کو اپنے بدن کے اندر اس طرح

چھپا کر رکھتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں لگتی ہے۔

دنیا کی تمام ترکاریوں میں پیاز کا مقام سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکل وصورت میں یہ گول مٹول ترکاری، صدیوں سے دنیا کی تمام عورتوں کو رُلاتی اور تڑپاتی رہی ہے۔ اس عذابِ جاں گسل کے باوجود، گھر میں پیاز کی موجودگی کو تونگری اور امیری کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور تمام عورتوں (کھانا بنانے والی عورتوں) کی آنکھوں کا تارا اور دلبر بے بدل بن کر اُن کے دلوں پر راج کرتا ہے اور ان کا انگ انگ پھڑکاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام سالنوں اور پکوانوں کو ایک بے مثال لذت سے ہم کنار کرتا ہے۔ ایک معمولی سا شلغم بھی پکائیں تو پیاز کی صحبت اُسے بھی بے انتہا لذیذ بنا دیتا ہے۔ اس لئے اسے رسوئی کی شان سمجھا جاتا ہے۔ اسے کچن سے دیش نکالا دینے سے آپ کا دسترخواں بے کیف و بے سرور بن جاتا ہے۔ یہ حیران کن پیاز ہمارے سالنوں کو تہہ در تہہ خوشبو، رنگ اور شکل بخشتا ہے۔ پیاز کی غیر موجودگی ہماری خوشیوں کو عنقا کر دیتا ہے اور غیر معمولی پکوانوں کو حوصلہ شکن حد تک بے مزہ بنا دیتا ہے اور ہمارا ڈنر افسوس ناک حد تک پھیکا اور بے کیف بن جاتا ہے۔ جبکہ اس کی موجودگی ایک معمولی سالن کو رنگینی اور تعجب خیزی بخشتی ہے۔ اس لئے پیاز آدم کی اولاد کے لئے قدرت کی طرف سے ایک انمول تحفہ ہے۔ اس کی ملنساری اور پائیداری قابل تعریف ہے۔

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ پیاز نے کب انسانوں سے دوستی کی ہے؟ کب انسانوں نے خصوصاً عورتوں نے پیاز کی بے پناہ خوبیوں کا ادراک کیا؟ البتہ بہت سارے ماہر آثار قدیمہ اور ماہر نباتات اور مورخوں کا ماننا ہے کہ شروع میں پیاز وسط ایشیا کے پہاڑوں میں اُگتا تھا۔ دوسرے تحقیق کاروں کا ماننا ہے کہ سب سے پہلے پیاز ایران اور موجودہ مغربی پاکستان کے علاقوں میں اُگایا جاتا تھا۔ بہر حال، یہ مانا جاتا

ہے کہ ہمارے آباو اجداد نے باضابطہ کھیتی باڑی شروع کرنے سے پہلے پیاز کھانا شروع کیا تھا اور اس وقت پڑھنا لکھنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اسلئے یہ معمولی نظر آنے والی ترکاری ماقبل تاریخ کے لوگوں کی غذا میں شامل ہوگئی تھی۔ لہٰذا جب سے اس کی کاشت تقریباً پانچ ہزار سال قبل شروع ہوئی تب سے یہ ہماری عورتوں کے دل و دماغ پر راج کرتا آیا ہے اور ہمارے کھانے کو لذت اور ذائقہ بخشنے کے ساتھ ساتھ ایک چاق وچوبند محافظ کی طرح ہماری صحت کا خیال رکھتا ہے۔

دنیا بھر میں پیاز کی سینکڑوں اقسام موجود ہیں اور ہر ایک کی خصوصیت مسلّم ہے۔ لیکن خطۂ ارض کشمیر میں ایک چھوٹا پیاز اُگایا جاتا ہے جس کو مقامی زبان میں 'پران' کہتے ہیں۔ یہ باقی پیازوں کی طرح گول نہیں بلکہ کھجور کی طرح بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ اگرچہ جسامت میں یہ پیاز ایک نوزائیدہ بچے کے اعضاء تناسل سے بڑا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی تندی اور تیزی دنیا کے تمام پیازوں کو مات دے سکتی ہے۔ یہ پکوانوں کو بے انتہا لذت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں شادی بیاہ کے موقعوں پر یہاں کے باورچی لوگ جن کو 'وازہ' کہتے ہیں، اس پیاز کے بغیر دعوت کا پکوان یعنی 'وازوان' بنانے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ پیاز یہاں کے مشہور 'وازوان' کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے۔ اس کے بغیر وازوان کا تصور ایک ناممکن الوجود خوش فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں کی ایک کہاوت مشہور ہے کہ پکھر پورہ کے وازے بڑی محنت سے وازوان پکاتے ہیں اور اگر زیادہ لذیز نہیں بنا تو اپنے ہاتھوں پر تھوکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پیاز بہت مہنگا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم مصریوں کے لئے پیاز ایک عبادت کی چیز تھی۔ .وہ پیاز کو ایک لافانی شے تصور کرتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ اپنے فرعونوں کو پیاز کے ساتھ دفناتے تھے تاکہ ان کو حیات جاوِداں حاصل ہوجائے۔ فی الحقیقت بادشاہ رامیسس

جب ایک سو ساٹھ قبل مسیح میں فوت ہوا تو اُس کی آنکھوں میں پیاز بھر کر دفنایا گیا۔اس کے بعد تو ہر مرنے والے کے بدن کے ہر سوراخ میں پیاز بھر بھر کر دفن کیا جاتا تھا۔

یونانی لوگ اپنے پہلوانوں اور کھلاڑیوں کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی خاطر ان کو بہت سارے پیاز کھلاتے تھے بلکہ ان کے بدن پر پیاز کا رس ملتے تھے۔قدیم بھارت میں بھی پیاز کو بطور دوا استعمال کرنے کا رواج تھا۔وہ پیاز کو ہاضمہ، جوڑوں اور دل وآنکھوں کے لئے مفید تصور کرتے تھے۔

روم کے باشندے بھی پیاز کو بہت مفید خیال کرتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ پیاز آنکھوں اور نیند کے لئے بہت کارگر ہے۔یہ منہ کے چھالے، دانت کے درد اور جلاب کو ٹھیک کرتا ہے۔

پیاز کے اوپر کا کاغذی لباس اس کو جراثیم سے بچاتا ہے اور اس کے اندر کا تند و تیز رس خود اس کو سڑنے سے بچاتا ہے۔پیاز باہر سے معمولی لگتا ہے۔لیکن اندر سے وہ بیماریوں سے لڑنے والا بہادر سپاہی ہے۔یہ ہمارے پیٹ میں دوست جراثیم کی تعداد کو بڑھاتا ہے۔اس طرح ہماری قوت مدافعت کو مضبوط کرتا ہے اور ہمیں کرونا سے لڑنے کی شکتی دیتا ہے۔

تو بھائیو! پیاز کی انہی خوبیوں کی وجہ سے یہ ہمارے ملک کی سب سے اہم ترین ترکاریوں میں شمار ہوتا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ بازار میں پیاز کی قلت اور اس کی قیمتوں میں اُچھال کی وجہ سے ماضی میں کئی حکومتیں گرتے گرتے بچی ہیں۔یہاں تک کہ کبھی کبھی تو ملک کے سب سے بڑے دشمن ملکوں سے پیاز درآمد کرنا پڑا ہے۔خود ہماری اس چھوٹی سی زندگی میں ہم نے بھی دشمن ملکوں سے پیاز درآمد کر کے حکمرانوں کو اپنا سنگھاسن بچاتے ہوئے دیکھا ہے۔بارڈر پر ایک دوسرے پر لاکھ گولے برسائیں، ہزار بار ایک دوسرے پر لاف وگزاف کی بارش برسائیں، الفاظ کی گولیوں سے لاشوں

کے پشتے لگائیں۔ پھر بھی یہ دلبر بے بدل اور عورتوں کی آنکھوں کا تارا بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ بارڈر کو کراس کرتا ہے اور ہماری رسوئیوں میں پہنچ کر آپسی دشمنی اور تلخی کو خوشیوں اور دوستی میں بدلنے کی سعیٔ مسلسل کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا پیاز۔۔۔ ؎

ہر عورت کا نورِ عین
ہر سالن کی آبرو
دنیا کی ہر تر کاری میں
ایک تو ہی دھنوان ہے پیازے
باقی سب کنگال

☆......کاچواسفندیارخان

ایک برہماچاریہ ڈیرے کی تلاش میں

چاند اور مریخ کو تسخیر کرنا تو بالکل سہل نظر آتا ہے۔لیکن اس شہرِ ناپُرساں میں ایک برہماچاریہ کو ڈیرہ ملنا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔یہ کوئی کہانی یا افسانہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ایک واقعہ ہے کہ ہم بھی کسی زمانے میں برہماچاری تھے اور کئی سلسلہ ہائے کوہ ودمن کو پھلانگتے ہوئے نوکری کے سلسلے میں گھر سے دور اس شہر دل پذیر میں آئے تھے اور ڈیرے کی تلاش میں مدتوں سرگرداں رہے۔ہمیں اپنی اس بادیہ پیمائی میں کس حد تک سرُخروئی ملی اور کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے،اسے ہم قارئین کو سناتے ہیں۔

اپنے گھر میں ہم بھی بہت چہیتے تھے۔آدھا درجن بھائی بہنوں کی موجودگی میں ہم اپنے والدین کی آنکھوں کا نور نہ سہی مگر چراغِ مُفلس کی طرح ٹمٹماتے ضرور تھے۔کبھی کسی نے ہمارے کردار کو،ہماری اُٹھن بیٹھن اور طور طریقوں کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔سبھی یہی سوچتے تھے کہ بے چارہ کنوارا ضرور ہے لیکن کسی شترِ بے مہار کی طرح دوڑ کر کسی کو دبوچ لینے اور منہ مارنے والا ہرگز نہیں۔ہمسائے کی لڑکیاں ہمیں جمن بھائی کہہ کر پکارتی تھیں اور ہم بھی اپنی بزرگی اور شرافت کا پاس ولحاظ رکھ کر اُن کے ساتھ نہایت شریفانہ انداز میں پیش آتے تھے۔لیکن جب اِن ماہ جمالوں کے شہر میں پہنچا تو نہ جانے کیوں ہر کوئی ہم کو ٹکر ٹکر کر اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔جیسے ہم اس دھرتی کی مخلوق نہیں بلکہ کسی آسمانی قوت نے سلسلہ کوہ قراقرم کے کرُہ

زمہریر سے لاکر یہاں ٹپکا دیا ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ہم نے اپنا سر چھپانے کے لئے ایک ڈیرے کی تلاش بڑے زور وشور اور شوق جنون عشق ومستی کے ساتھ شروع کر دی۔ کیونکہ کئی دن ہوٹل میں گزارنے کے بعد ہماری جیب کو اب حاجت رفو بھی نہیں رہی تھی۔

ایک گلی کو پار کر کے ایک عالی شان مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی نوک پلک کو درست کر کے اور بڑے انداز کج کلاہی کے ساتھ ہم نے صدر دروازے پر اُنگشت شہادت سے دستک دی۔ ایک...دو...تین یہاں تک کہ دس بیس دستکیں دیں۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر تو ہم نے بھی دستکوں کی بارش برسا دی۔ چٹکنی کھلنے کی آواز آئی....اور ہم بھی اپنی سانسوں کو روک کر آنے والے واقعات سے نبرد آزما ہونے کے لئے مستعد رہے۔ دروازہ کھلا... دروازہ کیا کھلا کہ قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی۔ بڑی بڑی نینوں والی ایک پری پیکر حسینہ دانتوں میں آنچل کا کونہ دبائے، کچھ شرماتی ہوئی اور کچھ لجاتی ہوئی، کھلتے کواڑوں کے پیچھے سے یوں نکلی جیسے کالے کالے بادلوں کی اوٹ سے چودھویں کا چاند۔ ہمارے ہوش وحواس ہمیں تن وتنہا چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے تھے۔ گلہ رُندھ گیا تھا۔ بس کم بخت آنکھیں تھیں کہ ایک بار بھی نہیں جھپکیں بلکہ اس دعوت حسن پر لبیک کہتے ہوئے اُس حسن نظارہ سوز، جمال دلفروز اور اب کیا بتاؤں کہ اُس مہر نیم روز کی حشر سامانیوں کی نذر ہو گئیں۔ دور سے ایک نقرئی آواز پردۂ سماعت کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''بتائے، آپ کو کیا چاہئے'' اور ہم نے سوچا جی چاہئے تو کچھ بھی نہیں بس یونہی تھوڑی دیر اور کھڑے رہئے تاکہ ہمارے رہے سہے ہوش وحواس بھی آپ کی دہلیز پر نچھاور ہو جائیں۔ پھر آواز آئی ''آپ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں'' سوچا کہہ دوں ''ارے آپ کے سوا اب کوئی اور.....'' پھر خیال آیا کہ

میں یہاں ڈیرے کی تلاش میں آیا ہوں۔ اپنی بکھری ہوئی شخصیت کو بصد جتن سمیٹ کر یوں گویا ہوا''جی...کیا آپ کے یہاں کوئی کمرہ خالی ہے مجھے ایک کمرہ کرایہ پر چاہیئے''۔ فرمانے لگی''ذرا ٹھہریئے، میں اندر سے پوچھ کر آتی ہوں''۔اور ہم نے انتظار کی یہ گھڑیاں اپنی نوک پلک درست کرنے میں لگا دیں۔کبھی مونچھوں کو سنوارتے رہے کبھی ٹائی درست کی اور کبھی بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔اتنے میں اپنی آدھی فٹ لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا ایک صاحب نکلا اور مجھ پر ایک طائرانہ مگر ناقدانہ نظر ڈال کر بولا''کیا آپ شادی شدہ ہیں''میں سمجھا نہیں اور ایک گونگے کی طرح اُن کا منہ بلکہ اُن کی داڑھی تکنے لگا۔اس نے کھنکار کر بولا''میرا مطلب ہے، کیا آپ کی اہلیہ بھی ساتھ ہیں''۔واہ رے شومیِ قسمت! چھبیس برس تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ڈگری کے لئے سر کھپاتے رہے، پھر نوکری اور روزگار کی تلاش میں اپنی رہی سہی اہلیت بھی کھو دی۔اب مجھ میں وہ اہلیت ہی کہاں رہی کہ اہلیہ رکھوں''۔ہم نے نفی میں سر ہلایا۔تو وہ بولے''بھائی صاحب، یہاں کمرہ خالی نہیں ہے''اور زور سے دروازے کو بند کرتے ہوئے چلے گئے اور ہم یہ سوچتے ہوئے اُس درِ رقیب سے واپس مڑے کہ اگر اُس کے پاس کمرہ خالی نہیں تھا تو میری گھریلو زندگی کے بارے میں یہ بے جا اینکوائری کس لئے؟ بیوی اور کمرہ.....یہ دو لفظ چیخ چیخ کر میرے ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے۔بیوی اور کمرہ.... چہ معنی دارد؟ شاید شہروں میں یہ دو چیزیں لازم وملزوم ہوتی ہوں گی۔ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناممکن!۔لیکن اپنے گاؤں میں تو ہم بیوی کے بغیر کمرے میں رہ سکتے تھے،سو سکتے تھے اور اپنی مرضی کا کام کر سکتے تھے۔لیکن شہروں میں شاید کمرہ اور بیوی دونوں ملا کر ہی کسی شخص کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ تصور کرتے ہوں گے اور شاید یہ دونوں لازم وملزوم اس لئے بھی ہوں گی کہ بیوی اُس خالی کمرے کی سپاٹ

چار دیواری میں حیات انسانی کا سب سے بہتر رنگ بھر سکیں ۔شاید اسی لئے شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے فرمایا تھا ؎

وجودِ زن سے ہے ہر گھر کے کمرجات میں رنگ

جسے کسی نافہم پبلی شر نے غلطی سے اس طرح چھاپا تھا ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اِنہی خیالات میں گم صم ہم ایک بار پھر شہر کے اُن بے دل و بے رونق راستوں پر چلتے رہے۔تھوڑی دور چل کر میں نے کسی دکان کے کواڑ میں لگے شیشے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ مایوسی اور غصہ کے ملے جلے جذبات کی وجہ سے مجھے اپنی صورت لنگور کی صورت سے بالکل ملتی جلتی دکھائی دینے لگی۔ بال بکھرے ہوئے ،ہونٹ سوکھے ہوئے،آنکھوں میں تلخیٔ دوراں اور سینے میں نشترِغم ڈیرہ کچو کے لگاتے ہوئے۔بال کیا تھے کہ چنار کی سوکھی شاخیں تھیں۔اس کس مپرسی کے عالم میں ہاتفِ غیب نے صدا دی'' ہمتِ مرداں، مدد خدا'' سوچا درست کہہ رہا ہے۔یہاں نہیں تو کہیں اور سہی۔خدا کے دربار میں کمی کیا ہے۔اس ذات پاک نے جب یہ ساری کائنات صرف سات دنوں میں تخلیق کی تھی تو اس وسیع وعریض دنیا میں میرے بختِ برگشتہ میں بھی ایک کرائے کا کمرہ تو ضرور لکھا ہوگا۔یہ سوچتے ہوئے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور سمندِ ناز پہ شوق کا ایک تازیانہ لگا۔بچی کھچی عقل اور لڑکھڑاتی ہوئی ہمت کو سمیٹ کر ہمارے قدم ایک بار پھر منزلِ نامعلوم کی طرف گامزن ہوئے۔

پھر کافی دیر تک ان تنگ وتاریک گلیوں میں گھومنے اور چکر لگانے کے بعد ایک اور مکان کے سامنے پہنچا جس کے دروازے کے اوپر'' ہٰذا مِن فضلِ ربّی' لکھا تھا۔اسے تائیدایزدی سمجھ کر اپنے ہاتھوں کو اُس نیلے آسمان کی طرف اُٹھایا اور کچھ لمحات

غیر یقینیت میں گزار کر اُس مکان کے صدر دروازے پر دق الباب کیا۔صاحب خانہ باہر نکلا۔سانولے چہرے پر موٹی اور تکڑی ناک ایک ہتھوڑے کے مانند آویزاں تھی۔ آنکھوں کی سفیدی شفق آلود شام کی طرح رنگین تھی۔اُن کی مخروطی شکل کی داڑھی کسی بربری بکری کی داڑھی کی طرح جھول رہی تھی۔سر کے بال اُن کی خوشحالی اور فارغ البالی کی نشاندہی کررہے تھے۔میں تعظیماً جھکا اور ایک فرشی سلام بجالایا۔صاحب خانہ نے اپنے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا۔میں نے حالات کو سازگار پا کر پوچھا۔

میں نے کہا : کیا آپ کے پاس کوئی کمرہ کرایہ پر دینے کیلئے خالی ہے؟

صاحبِ خانہ : کمرہ ہے۔کتنے کمرے چاہئے؟

میں : دو کمرے۔جی ہاں ایک بیٹھک اور ایک کچن ہوتو زیادہ بہتر ہے۔

صاحبِ خانہ : ملے گا۔کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

میں : جی، فی الحال تو نہیں۔

اس سوال سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔کیا وجہ ہے کہ ہر ایک میری شادی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ سو فیصدی خانہ بربادی ہے۔پھر کیوں ہر ایک میری خانہ بربادی پر تُلا ہوا ہے۔کتنے جلتے ہیں یہ لوگ میری آزادی اور لا ابالی پر، میری ظاہری خوش حالی پر اور میری فتنہ پرور جوانی پر۔شاید یہ لوگ مجھ کو کسی چھوکری کے پلو سے باندھ کر اُلّو بنانا چاہتے ہیں۔لیکن پھر بھی صبر و تحمل کے دامن کو رفو کر کے جواب دیا۔

میں : جی، میرا مطلب ہے کہ میری شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔حقیقت یہ

ہے کہ کہ غم روزگار کے سوااس دل ناصبور کے اندر کسی اور شے کو گھسنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی ہے۔۔یعنی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔اس معاملہ پر میں نے کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔اس بات پر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھور گھور کر دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

صاحبِ خانہ : آدمی عقل مند لگتے ہو کہ ابھی تک اس بحرِ ذخار میں غوطہ لگانے سے بچے ہو،جس بحرِ ذخار میں ہزاروں بڑے بڑے سورما بھی غرق ہوتے رہے ہیں اور قیامت تک اَن گنت اولادِ آدم غرق ہوتے رہیں گے۔چلو کچھ شرطوں پر آپ کو کمرہ دے سکتا ہوں،منظور ہے؟

دل تو چاہتا تھا کہ شرطوں کو جانے بغیر منظور ہے...منظور ہے کا نعرۂ مستانہ بلند کروں۔جس طرح منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا تھا۔لیکن پوچھا کہ کیا شرطیں ہیں تو صاحب خانہ نے اپنی شرطوں کو گننا شروع کیا۔

صاحبِ خانہ : شرط نمبر۱ :- یہ کہ دو کمروں کا کرایہ ایک سو پچاس روپیہ ماہوار۔لیٹرین اور باتھ روم باہر لان میں ہیں۔ایک کمرے کے کونے میں کچن بناؤ۔منظور ہے؟

میں : جی منظور ہے۔

صاحبِ خانہ : شرط نمبر۲ :کمروں میں بجلی کے دو ہی لیمپ جلیں گے،وہ بھی ساٹھ واٹ کے،کیونکہ یہاں بجلی تو عام طور پر ہوتی ہی نہیں ہے اور اگر آتی بھی ہے تو بھی موم بتی جلا کر اپنی بیوی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔لیکن پھر بھی بجلی کا کرایہ زبردستی لیا جاتا ہے۔منظور ہے؟

میں : جی منظور ہے۔

صاحبِ خانہ : شرط نمبر۳ :- شرافت سے رہنا ہوگا۔منظور ہے؟
میں : جی منظور ہے۔مگر قانون فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ کسی شخص کی شرافت اور رزالت کے گُن اُس کے چلے جانے کے بعد ہی معلوم ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ بابائے حزن والم حضرت میرتقی میر نے فرمایا ہے ؎

زندگی چشمِ جہاں میں خار تھی جن کے ولا
دوش پر لینے لگا جب آدمی بے دم ہوا

پھر بھی میں حتی الامکان کوشش کروں گا اور شرافت کا عبا اپنے سر سے سرکنے نہیں دوں گا۔'' دل میں سوچا اگر ناک میں دم نہ کردوں تو ماں کا دودھ مجھ پہ حرام ہوجائے۔ پھر میں نے کہا کہ میری بھی کچھ شرطیں ہیں۔ کہنے لگا وہ کیا ہیں؟
میں : پہلی شرط :- کہ کسی بھی صنفِ نازک کی قمیص، شلوار اور دوپٹہ میری کھڑکی کے سامنے نہ لٹکائے جائیں تا کہ انسان کے اندر سربہ مہر جذبات کو برانگیختہ کرنے کا سامان پیدا نہ ہو۔ کیا آپ اس کا ذمہ لے سکتے ہیں۔
صاحب خانہ : ٹھیک ہے انہیں لٹکانے کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہوگی۔
میں : میری دوسری شرط :- یہ کہ کوئی بھی صنفِ نازک میرے دروازہ یا کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کوئی گانا نہ گائے اور نہ ہی کھل کھلا کر ہنسے یا گنگنائے۔ مثلاً ''زندگی میں پیار کرنا سیکھ لو''۔ یا ''چل دریا میں ڈوب جائیں''۔
صاحب خانہ : منظور ہے کوشش یہی رہے گی کہ کوئی نہ ہنسے اور نہ گائے۔
میں نے کہا : میری تیسری شرط :- یہ کہ میں بانسری بجاتا ہوں۔ اس پر آپ کو یا کسی بھی اہل خانہ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔
یہ بات سنتے ہی صاحبِ خانہ آگ بگولا ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ جیسے کسی سانپ نے آدم زاد کو دیکھا ہے یا کسی چڑیا نے سانپ کو دیکھا ہو۔ میں

سہم گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر انتظارِ بارشِ ملامت کرنے لگا۔ اُن کی آنکھوں کی سُرخی، ہونٹوں کی تھرتھراہٹ اور سانسوں کے اُتار چڑھاؤ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ میری یہ شرط نامنظور ہوگئی ہے۔ پھر وہ گویا ہوا۔

صاحبِ خانہ : نہیں نہیں۔۔۔ یہ شرط مجھے منظور نہیں ہے۔ کیونکہ کہتے ہیں کہ اس نامراد بانسری کے بجانے سے گھر میں سانپ آجاتا ہے۔ ہاں...سانپ....!

وہ کریہہ المنظر رینگتا ہوا منحوس جانور جس نے خاتونِ اول حوّا کو ڈس کر آدم کو ورغلانے پر مجبور کیا تھا، اور اس زہر ہلاہل کے زیرِ اثر آدم نے باغ عدن میں موجود شجر ممنوعہ کی طرف دست درازی کرنے کی جسارت کی تھی، جس کے نتیجہ میں اُن دونوں کو جنت سے نکلوا کر دھرتی کے سینے پر پھینکوا دیا گیا تھا اور یہی حادثہ ابھی تک نسل انسانی کو دُکھ، درد، بھوک پیاس، محنت، مشقت، کشت وخون اور ہزار ہا اُلجھنوں میں اُلجھائے رکھنے کا سبب بنتا رہا ہے اور صورِ اسرافیل کے پھونکنے تک کا بنتا رہے گا۔ نہیں بھئی نہیں ۔۔۔ میں اپنے گھر کے اوپر اس کا سایہ بھی پڑنے نہیں دوں گا۔ اس لئے یہ شرط مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔

میں نے بادلِ ناخواستہ اپنی یہ شرط واپس لے لی۔ پھر کیا تھا صاحبِ خانہ کی ہر شرط پر لبیکَ یا صاحب خانہ لبیکَ یا صاحب خانہ کہتا ہوا میں اُس گھر کے اندر چلا گیا۔

☆......کاچو اسفندیار خان

فنِ نقادی

کہتے ہیں کہ براعظم ایشیا میں فنِ نقاشی کا باوا آدم ژنداوستا کا نژاد، ایران کے استاد 'بہزاد' کو مانا جاتا ہے۔ دروغ برگردن راوی، یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس نے ایک گھوڑے کی تصویر بنا کر کسی جگہ لٹکا کے رکھ دی تھی۔ تو اتنے میں ایک زندہ و جاوید گھوڑے نے اس کو اپنا رقیب روسیاہ سمجھ کر اس پر دولتیوں کی بارش برسا دی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فن کار جب اپنے وجود کا انگ انگ اپنے فن پر نچھاور کر دیتا ہے تو اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ اس عالم رنگ و بو میں فنِ نقادی کا باوا آدم مفتّن اول اور ہمارے رقیب روسیاہ ابلیس کو مانا جاتا ہے۔ تمام آسمانی صحیفوں کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے آفرینش کے وقت جب خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم اور دیگر جانداروں کو عالم لاوجود سے عالم وجود میں لانے کا حکم دیا تو ہر فرشتہ خدا کے تخلیق کردہ نمونوں کو دیکھ کر انگشت بہ دنداں رہ جاتا تھا۔ سبحان اللہ کے نعرے سے عالم لامکاں میں ہلچل مچ رہی تھی۔ اس دوران وہیں مفتّن اول، ابلیس بھی یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ہر تخلیق کردہ جانور کو وجودیت کے لق ودق میدان میں اتار کر پریڈ کروا رہا تھا۔ سب سے پہلے یلغوز گاؤ زمین کو میدان سے گزارا گیا۔ وہ خراماں خراماں میدان میں چل رہا تھا اور اس کی شکل وصورت کو دیکھ کر فرشتے عش عش کر رہے تھے۔ لیکن اسی دوران ابلیس بول اُٹھا، ''خداوندا! یہ کیا جانور بنوایا آپ نے؟ اتنی لمبی

اور پتلی دم مگر سینگ دیکھوا تنے چھوٹے جو اس کے جسم سے میل نہیں کھاتے ہیں۔فنی و جمالیاتی اقدار کے لحاظ سے یہ بالکل ناموزوں ہیں۔اس کے بعد اونٹ کو میدان میں لے آیا۔اس کے کل پرزوں کی بے کلی پر فرشتے حیران وششدر تھے اوراس کی بناوٹ میں مصلحت الٰہی کے رموز کو بھانپنے کی کوشش کررہے تھے۔لیکن ابلیس نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا کہ ''اے خدائے ذوالجلال!اتنی لمبی گردن اور پھراس پر طرفہ تماشہ یہ کہ اتنی لمبی ٹانگیں بنانے کا کیا مقصد؟ چلو یہ بھی مان لیا مگراس کے پیٹھ پر اُلٹی ٹوکری رکھنے کا کیا مطلب؟۔یہ تو ساختیاتی طور پر برمحل نہیں ہے۔''اس کے بعد ایک گدھے کو وہاں سے گزارا گیا۔وہ ایک عظیم فلاسفر کی طرح اپنے خیالوں میں گم صم جا رہا تھا۔اس مفتّن اول نے پھر تنقید کا تیر چھوڑا۔بولنے لگا کہ خداوندا!اتنی چھوٹی دم اور اتنے لمبے کان، یہ تو ہئیتی انسلاکات کے لحاظ سے بالکل غیر موزون تخلیق ہوا ہے۔اس میں کچھ موڈیفکیشن کے بغیر اسے عالم وجود میں مت بھیجئے گا۔اسی طرح سب جانوروں کو وہاں سے گزارا گیا اور آخر میں گائے وہاں سے گزاری گئی۔منکر خدا ابلیس کہاں چپ رہنے والا تھا۔بول اُٹھا۔اے رب ذوالجلال! اگر آپ گائے کو محسن انسانیت بنا کر بھیج رہے ہیں تو پھراس کی شکل میں ایک چھوٹی سی ترمیم ضرور کیجئے گا بلکہ اس کی دم کو اس کے ماتھے پر لگا دیجئے تا کہ اگر کوئی بے چارہ کسان اپنی گائے کو گھر سے کھیت تک لے جانا چاہے تو اُس کو رسی ڈھونڈنے کی زحمت نہ ہو بلکہ وہ دم کو پکڑ کر لے جا سکے۔سب سے آخر میں آدم کو میدان وجود سے گزارا گیا۔اپنی مادر زاد شکل و صورت میں آدم اپنی دو لمبی اور پتلی ٹانگوں پر خراماں خراماں چل رہا تھا اور اپنے دونوں بازوؤں کو آگے پیچھے ہلا رہا تھا۔اپنے گیسوؤں کو اپنے شانوں پر بکھیرے واقعی وہ حسن ازل کا شاہ کار لگتا تھا۔فرشتے ان کی چال ڈھال اور صورت لامثالی کو دیکھ کر انگشت بہ دنداں تھے۔مگر مفتن اول کو یہ بات بالکل ناگوار گزری اور وہ اپنی آواز کے والیوم کو

بڑھا کر کہنے لگا۔اے خالق دو جہاں! آپ کی تمام تخلیقات میں سے یہ سب سے عجیب اور انوکھا ہے اور یہ تمام حیوانوں سے عجیب تر حیوان ہے۔باقی جانوروں کی چار ٹانگیں اوراس کی صرف دو ٹانگیں۔اے رب العزت مجھے تو اس کی شکل وصورت سے لگتا ہے کہ یہ حیوان دو زنگ باقی تمام چار زنگوں پرسواری کرے گا اور وجودیت کی نئ بستی میں فساد پیدا کرے گا۔ساختیاتی طور پر آپ نے اس کا پیٹ اس کی آنکھوں کے سامنے رکھا ہے۔مجھے پورا یقین ہے کہ یہ جانور اپنی پیٹ پر سب کچھ قربان کرے گا اور اس میں ڈالنے کے لئے کچھ نہیں ملا تو یہ دوسروں کو مار کر اس کا ایندھن بنائے گا۔بہر حال تماشہ ختم ہوا اور ابلیس کو اپنی زبان درازی کی سزا ملی اور ہمیشہ کے لئے معتوب ہوا۔

تو میرے بھائیو! آپ نے دیکھا کہ فن نقادی سب سے پرانا فن ہے۔لیکن یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ نقاد کیسے بنتا ہے۔کہتے ہیں جو شخص کسی بھی فن میں ماہر نہیں ہو تو وہ نقاد بن جاتا ہے۔اسی فن کے ذریعہ اس کو اپنی محرومی کی چبھن کو کند کرنے کا ایک وسیلہ اور کیتھارسس ملتا ہے۔مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کوئی جوشی نامی ایک مشہور سماجی کارکن سے جب ایک مغربی اخباری نمائندے نے پوچھا کہ جناب آپ کے دیس میں سیاست داں کیسے بنتا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ ہمارے ملک میں بہترین دماغ والے لوگ ابتدائی مرحلے میں ہی انجینئر اور ڈاکٹر کے پیشے میں چلے جاتے ہیں۔اس کے بعد جو بچتا ہے وہ آئی۔اے۔ایس وغیرہ کر کے سرکاری ملازمت اختیار کرتے ہیں۔اس کے بعد جو بچتا ہے وہ بیوپاری کا پیشہ اپناتے ہیں۔آخر میں سماج میں وہی لوگ رہ جاتے ہیں جو کسی بھی پیشے کے لئے فٹ نہیں ہوتے ہیں تو وہی لوگ ہمارے سیاستداں بن جاتے ہیں۔کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ٹھیک اس طرح سماج کے کچھ فرد شعر وشاعری کرتے ہیں، کچھ کہانی لکھتے ہیں کچھ ناول لکھتے ہیں۔لیکن

لکھنے والوں میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو نہ تو شاعری کرسکتا ہے نہ کہانی یا افسانہ لکھ سکتا ہے اور نہ ناول لکھ سکتا ہے تو بادی النظر میں وہی طبقہ نقاد بن جاتا ہے اور ادبی تنقید کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے اور اپنی فرسودہ اور زنگ آلودہ انسلاکاتی و اسلوبیاتی تلواروں سے بہت سارے ادب پاروں کو بڑی بے دردی سے تہہ تیغ کرتا رہتا ہے اور خم ٹھونک کر کہتا ہے کہ صرف ابہام ہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس سے شعر کو آفاقی بنایا جاسکتا ہے اور جو شعر انسان کے سرحد ادراک کو چھولے وہ آفاقی شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔

لیکن میرے بھائیو! آپ لوگوں نے سوچا ہوگا کہ نقاد بننا اتنا آسان ہے۔نہیں، بالکل آسان نہیں ہے جناب۔جس طرح ایک ترکھان جس کو کشمیری میں چھان اور لداخی میں شِنگ کھن کہتے ہیں، بننے کے لئے آپ کے پاس کچھ مخصوص ہتھیاروں اور اوزاروں کا ہونا لازمی ہے جن کے بغیر آپ کا ترکھان بننے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکتا ہے۔ لیجئے چند کا نام لکھ دیتا ہوں۔مثلاً لکڑی کاٹنے کے لئے ایک آری جو لوہے کی ایک تلوار ہوتی ہے جس کی ایک دھار پر چوہے کے دانتوں کی طرح دانت نکالے ہوتے ہیں۔ چوراسا جو لکڑی کو کھودنے اور اس میں سوراخ بنانے کے کام آتا ہے۔ پھر رندا جس سے لکڑی کی اوبڑ کھابڑ سطح کو چھیل کر ہموار بنا کر ایک پری پیکر حسینہ کی گالوں کی طرح چکنا بنایا جاتا ہے۔ اگر لکڑی کو زیادہ چھیلنا ہو یا اس کے حجم کو کم کرنا ہو تو ایک تیشہ بھی درکار ہوتا ہے۔ ہاں وہی تیشہ جس سے حضرت فرہاد نے شیرین کے غم میں اپنے سر مبارک کو چھیلا تھا۔اس واقعہ نے لفظ تیشہ کو بہت عظیم لفظ بنا دیا تھا اور غالبؔ آشفتہ سر نے اسے اپنے ایک شعر میں استعمال کر کے اور بھی عظیم تر بنا دیا تھا۔؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

پھر لکڑی میں میخ ٹھونکنے کے لئے ایک ہتھوڑی بھی درکار ہے۔سب سے آخر میں ان تمام ہتھیاروں کو چلانے کا آپ کے پاس کما حقہ علم ہونا ضروری ہے۔تبھی آپ اس دشت کی سیاحی کے لئے نکل سکتے ہیں اور اپنے عیال کا پیٹ پال سکتے ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص بار بار اپنے موضوع سے بھٹک جاتا ہے۔ نہیں جناب ایسی بات نہیں ہے۔عربی میں ایک مقولہ ہے'الکلام یجرُ الکلام' یعنی بات سے بات نکلتی ہے۔اس بات سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر آپ نقاد بننا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی چند ضروری اوزار درکار رہوں گے جن کے بغیر آپ نقاد بننے کی سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے کہ ان ہتھیاروں اور اوزاروں میں چند سب سے اہم اوزار اور ہتھیار غالباً یہ ہیں مثلاً انسلاکاتی چاقو،معروضی نقطہ نظر کی آری ، محرکاتِ عمل کا تیشہ، نامیاتی عملِ تطہیر کا حلول، ایک تختہ مشق، روغنِ ساختیات، جدید و ما بعد جدید کی اسلوبیاتی تجسیم کاری ، بصری، سمعی، شامی، لمسی اور لذتی پیکروں کا رندا اور آخر میں ابہام والمبہام کا چبوترہ۔

ان تمام آلات سے لیس ہو کر ایک نقاد کسی فن پارے کی تنقید اور تجزیے میں لگ جاتا ہے جس طرح فنِ نقاشی کے لئے ایک تختہ مشق درکار ہوتی ہے اسی طرح فنِ نقادی کے لئے بھی ایک تختۂ مشق کا ہونا لازم ہوتا ہے جس کے اوپر کسی فن پارہ یا تخلیق کو رکھ کر اس کی کھال اتاری جاتی ہے۔مثال کے طور پر جب نقاد کسی مشہور شاعر کی غزل کے چند اشعار کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو سب سے پہلے وہ ان اشعار کو روغن ساختیات و پس ساختیات میں بھگو کر انہیں نرم کر دیتا ہے۔اس کے بعد ان کو تختہ مشق پر رکھ کر انسلاکاتی چاقو سے ان کی کھال اتار دیتا ہے۔پھر معروضی نقطہ نظر کی آری سے ان کے ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں۔اس کے بعد ان ٹکڑوں کی بہ نظر غائر جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔پھر ان ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑ دیا جاتا ہے اور ان پر بصری، سمعی، شامی، لمسی اور

لذتی پیکروں کا رندا چلایا جاتا ہے۔ اس عمل سے فارغ ہو کر نقاد ان کو نامیاتی عمل تطہیر کے حلول میں ڈال کر ان میں رہی سہی معنی و مفہوم کی بیخ کنی کرتا ہے اور سب سے آخر میں اس فن پارہ یا تخلیق کے ہیولے کو ابہام والمبہام کے چبوترے پر لا کر ایستادہ کر دیتا ہے تا کہ قارئین انہیں دیکھ کر ایک حیوان صامت کی طرح اپنے دہن مبارک کو وا کر کے ایک گونگے کی طرح ان مسخ شدہ فن پاروں کو گھورتے رہیں اور ان کی سمجھ میں خاک آ جائے۔ اس طرح نقاد اپنے فن کی نمائش کرتا ہے اور اس پر اتراتا ہے۔

چونکہ شاعری کو جز وِ پیغمبری مانا جاتا ہے اس لئے فن نقادی کو جز و ابلیسی مانا جانا معروضی طور پر حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ پس اس طرح میراثِ پیغمبری کی عزت، میراث ابلیسی کے ہاتھوں لٹی جاتی ہے اور بری طرح لٹی جاتی ہے اور یہ سلسلہ تب تک جاری و ساری رہے گا جب تک اس گول مٹول دھرتی کی گردش میں کوئی بڑا خلل پیدا ہو کر ایک شترِ بے مہار کی طرح اس فضائے بیکراں میں قلانچیں بھر بھر کر غائب نہ ہو جائے اور جب تک اس خورشیدِ جہاں تاب کی روشنی اور تپش ختم ہو کر آسمان میں ایک پکے ہوئے کدو کی طرح لٹکتی نہ رہ جائے۔ تب تک پیشہ ابلیسی زندہ رہے گا اور ادب پاروں کا حلیہ نا قابل شناخت حد تک مسخ ہوتا رہے گا۔

●●●

☆......پروفیسر منصور احمد منصورؔ

بُل فائٹ

عنوان دیکھ کر آپ چونک گئے ہوں، کیونکہ آپ نے صرف فلموں میں بُل فائٹ کا منظر دیکھا ہوگا۔ بیلوں کی مقابلہ آرائی کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ تاریخ میں بھی اس کا تذکرہ نہیں۔ جنگوں سے متعلق دستاویزات میں اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ اخباروں میں نہ اس کی تصویریں چھپی اور نہ ہی تبصرے شائع ہوئے۔ پارلیمنٹ میں بھی اس پر کوئی بحث و ہنگامہ آرائی نہیں ہوئی۔ بیلوں کی لڑائی پر کسی لیڈر نے مرن برت بھی نہیں رکھا۔۔ بالی ووڑ نے فلم نہیں بنائی، اس لئے آپ بیلوں کی مقابلہ آرائی کو میری گپ سمجھ رہے ہوں گے۔ اصل ماجرا سنانے سے پہلے آپ کی توجہ عجائب خانہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عجائب خانہ کی ہر بات انوکھی اور نرالی ہے۔ ایسی ہی ایک نرالی بات اس وقت دیکھنے میں آئی جب ہمارے یہاں پہلی بار اونٹ نمودار ہوا۔ عجائب خانہ کے مکین اسے عربی اونٹ سمجھ کر جوق در جوق سڑکوں پر نکل آئے۔ اونٹ کے پیچھے صف باندھے کھڑے ہو گئے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائیں گونج اٹھیں۔ پھر کیا ہوا، اونٹ یہاں کے ذہن وشعور پر پوری طرح سوار ہوا۔ عرب میں ہو یا راجستھان میں یا دیگر صحرائی علاقوں میں لوگ، اونٹ پر سوار ہوتے ہیں لیکن یہاں اونٹ ہی سوار ہوا۔ چونکہ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی، یہ اندازہ کرنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے کہ اونٹ کون سی کروٹ بیٹھے گا۔ بہر حال، اونٹ کو سوار ہونا تھا، سو ہو گیا۔ اس کی کل بگڑتے اور کروٹ پر کروٹ بدلتے

دیکھ کر اہل عجائب خانہ اسے اونٹ کے روحانی کرب سے تعبیر کرتے رہے۔اس لئے اونٹ کی ہر کروٹ پر مرحبا و آفریں کی صدائیں دیتے رہے۔اونٹ جو ذہن وشعور پر سوار ہوا تھا ایک دن اچانک کرسی پر براجمان ہوا۔چار ٹانگیں تو پہلے سے تھیں۔کرسی کی مزید چار ٹانگیں پا کر آٹھ ٹانگوں والے اونٹ کو قرار آ گیا لیکن اونٹ کی کون سی کل سیدھی ہے،اس لئے یہ قرار عارضی ثابت ہوا۔اونٹ اٹنگا تھا،لمبوترا تھا اس لئے اس کی لمبی ٹانگوں اور کرسی کی قدرے چھوٹی ٹانگوں میں توازن و تناسب قائم نہیں ہو سکا۔ چنانچہ حسبِ عادت جب اونٹ کروٹیں بدلنے لگا تو کرسی پر توازن قائم نہ رکھنے کے سبب دھڑام سے گر پڑا اور اپنی ہی ٹانگیں توڑ بیٹھا۔اونٹ کی بات ضمناً یاد آئی، کہنے کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اونٹ ذہن وشعور پر کچھ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ عجائب خانہ کے مکینوں کو اس کے بغیر چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا،سونا جاگنا اور کروٹ بدلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔اس لئے اس کی جگہ بیل نے لی۔واضح رہے کہ عرب میں بیل نہیں ہوتے (خدا کرے اندازہ درست ہو) اس لئے اونٹ کی غیر موجودگی سے پیدا شدہ خلا کو بیل سے پُر کیا گیا۔بیل تو پھر بھی بیل ہے۔بعض لوگوں (عاشقوں) کو محبوب کی گلی کا کتا بھی پیارا ہوتا ہے۔ہم نے خود ان گہنگار آنکھوں سے ایسے کتنے عاشقوں کو دیکھا جو حسرت دید لئے ساری عمر محبوب کی گلی کے کتے کو گلے لگائے بیٹھے رہے۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ (بعض نے اسے اپنی آنکھ کا سرمہ بنایا) حالانکہ کتے نے اپنی عادت کے عین مطابق کئی بار ان لوگوں کو کاٹا بھی۔روٹی کا ٹکڑا ملنے پر غیر آقاؤں کے اشارے پر وقت بے وقت بھونکتا رہا۔اتنا ہی نہیں اس نے امیدوں پر پیشاب بھی پھیر دیا (بے چارا کوئی آدمی تھوڑے ہی تھا کہ پانی پھیرتا) اور پیشاب پھیرنے کے لئے ہمیشہ عجائب خانہ کی دیواروں کا سہارا لیا۔ پیشاب کرنے کے لئے کتے کو ایک ٹانگ اٹھا کر دیوار یا کھمبے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ٹانگ اٹھائے بغیر اس کا پیشاب نہیں

نکلتا (آدمی کوتو بیٹھے بیٹھے پیشاب نکلتا ہے) چونکہ محبوب کی گلی کا کتا تھا اس لئے بعض عاشق فرطِ محبت سے کتے کے آگے کھمبے کی طرح کھڑے رہتے تھے (تا کہ کتا آرام سے پیشاب کر سکے)۔اوہو۔۔۔!۔یہ ہم کہاں بھٹکنے لگے۔۔۔بات ہو رہی تھی بیل کی۔ پتہ نہیں یہ اونٹ اور کتا کہاں سے درآئے۔ حالانکہ ہم نے کئی بار زور سے ''دُر'' (دھت) کی آواز نکالی (اس نقار خانے میں آپ کو یہ آواز سنائی نہیں دی) لیکن ''دُر'' کہنے کے باوجود کتا زبان لٹکائے اور دم ہلاتے ہوئے اندر آیا۔اسے شاید کھمبے یا دیوار کی تلاش ہے۔ خیرا سے جانے دیجئے ہم بیلوں کا ماجرا اب بتا ہی دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے صبر کا امتحان لینا ٹھیک نہیں (ویسے صبر کے امتحان میں ہم ہمیشہ اول نمبر پر رہے البتہ دیگر امتحانوں میں برابر فیل ہوتے رہے) اس لئے آپ کے صبر کا مزید امتحان لینا،صبر کی توہین ہوگی۔

توعزیزو! ماجرا کچھ اس طرح ہے۔فلاں ابن فلاں سے مروی ہے کہ عجائب خانہ پر ایسا وقت بھی گزرا جب سخت گرمیوں کے باوجود سیاسی سرگرمیاں نقطہ انجماد کو چھونے لگیں۔اس کے نتیجے میں سیاست کاروں کے دانت کٹ کٹ بجنے لگے۔ (حالانکہ موسم گرمیوں کا تھا) لیکن ڈھول باجے نہیں بجتے تھے۔''بچہ نغمہ'' اور ''باندۂ پا تھر'' سب اپنی کشش کھو چکے تھے۔عجائب خانہ کے مکین در و دروازے بند کر کے رات دن اونگھ رہے تھے۔راوی کا کہنا ہے کہ وہ زمانہ بس یادِ ماضی بن کر رہ گیا تھا جب خلقتِ عجائب خانہ سڑکوں پر اُمڈ آتی تھی۔ڈھول، باجے اور شہنائیاں بجتی تھیں۔رہبر عجائب خانہ کے سٹیج پر جلوہ نما ہونے تک شعرائے کرام جھوم جھوم کر اپنے شیر (بہ وزن شعر) کو چومتے تھے۔نثر نگار لیڈر کے قد شریف کے مطابق تین تین میٹر لمبے سپاس نامے گوش گزار کرتے تھے۔گلوکار ''کشمیری راگ'' (یہاں کا مقامی راگ، جو سنتے ہی آدمی کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے) چھیڑتے تھے،فضائیں وجد آفریں محسوس

ہوتی تھیں۔لیکن اچانک یہ ساری رونقیں جاتی رہیں۔نہ وہ تم رہے، نہ وہ ہم رہے، جو رہی سو بے رونقی رہی۔ راوی کا بیان ہے کہ رونقیں اس لئے ختم ہوئیں کیونکہ بار بار پہاڑ کھودنے سے چوہا ہی نکلتا رہا اونٹ تو نکلنے سے رہا۔ (یادرہے کہ اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں)۔ پتہ نہیں چوہا کسی کو کیوں نہیں بھایا۔ چوہے میں بھی کون سی خرابی تھی سوائے اس کے کہ طاعون پھیلاتا ہے۔ وہ تو یوں بھی یہاں پھیلتا رہا ہے اور اس وقت بھی پھیلا جب پہاڑ کھودنے سے ابھی چوہا بھی نہیں نکلا تھا۔ اس بے رونقی کو دیکھ کر دمادم مست عاشقوں کو ایک دن بھنگ میں رنگ ڈالنے کی سوجھی (بات خلافِ محاورہ ضرور ہے لیکن راوی کا یہی بیان ہے) آگے راوی کا جو بیان نقل کیا جاتا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بات جو بظاہر خلافِ محارہ نظر آتی ہے، خلافِ واقعہ قطعاً نہیں ہے۔ بھنگ سے دمادم مست عاشقوں نے یہ ترکیب نکالی کہ رہبر عجائب خانہ کے جلسے میں خلقت عجائب خانہ کو جمع کرنے کے لئے اعلان کروایا کہ جلسہ گاہ میں ''بل فائٹ'' ہوگی۔ یہ اعلان سن کر جلسہ گاہ میں حشرات الارضِ عجائب خانہ سیلاب کی طرح اُمڈ آئے۔ ایک نیا جوش پیدا ہوا کہ دیکھیں ''بل فائٹ'' میں کون سا بیل جیتے گا۔ چنانچہ فربہ بیلوں کی جوڑی لائی گئی ان کے گلے میں پھول مالائیں پہنائی گئیں اور ڈھول کی تھاپ پر دونوں کو لڑایا گیا۔ راوی کا کہنا ہے کہ مقابلہ برابر کا رہا۔ دونوں بیل سینگیں لڑاتے ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکیلتے رہے۔ ایک طرف نعروں کا شور، دوسری طرف ڈھول بجانے کی آواز اور اس شور وشغب میں بیلوں کا لڑنا، کیا نظارہ تھا۔ اسے چشم فلک بھی نہیں بھول سکتی۔ دونوں بیلوں کے جسم پسینے میں شرابور تھے۔ پھول مالائیں خاک میں مل چکی تھیں اور جگہ جگہ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ (یہاں پر راوی کا بیان مکمل ہوتا ہے)۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اب اونٹ اور محبوب کی گلی کے کتے کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں بیل بھی ذہن وشعور پر سوار ہوا۔ اگرچہ

دونوں بیلوں کے سینگ ٹوٹ چکے تھے لیکن اکڑ نہیں گئی۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ بیلوں کی اس محاذ آرائی کو مزید دلچسپ بنانے اور اسے وسعت دینے کی خاطر کچھ بیلوں کو بھی میدان میں لایا گیا تا کہ دوبدو مقابلہ کی بجائے تکونی مقابلہ ہو جائے۔ اب یہ Triangular مقابلہ کہلاتا ہے۔ مقابلے میں شریک بعض بیلوں کے ابھی سینگ نکلنا بھی باقی ہیں۔ منہ میں دودھ کے دانت ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے۔ واللہ خیر الراحمین۔ اب مجھے اور راوی کو رخصت دیجئے۔ آگے کا حال آپ بہ چشم خود ملاحظہ فرمایئے۔

☆...... پروفیسر منصور احمد منصورؔ

آموں کے باغ سے سبز باغ تک

میں نے آم کے باغ تو نہیں دیکھے ہیں لیکن آم ضرور کھائے ہیں۔ کیونکہ آم وزرا، امرا اور بادشاہوں کا پسندیدہ پھل رہا ہے۔ حالانکہ آم بذاتِ خود پھلوں کا بادشاہ ہے۔ دنیاوی بادشاہ رہے نہ ان کی بادشاہتیں، اگرچہ اس وقت بھی بفضلِ تعالیٰ دو تین بادشاہ موجود ہیں لیکن ان کی بادشاہت کو بھی پائیداری حاصل نہیں۔ اُن کی بنیادیں بھی ہل رہی ہیں۔ صرف آم کی بادشاہت کو دوام حاصل ہے۔ آم کل بھی پھلوں کا بادشاہ تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ ہمیں آم اس کی بادشاہت کی وجہ سے پسند نہیں۔ یہ اس لئے بھی ہماری پسند نہیں کہ آم بھی کھائیں اور گٹھلیوں کے دام بھی پائیں۔ میری پسند کی وجہ کچھ اور ہے۔ اگر آپ وجہ نہیں پوچھتے تو بہتر تھا کیونکہ وہ جاننے پر آپ ناک بھوں ضرور چڑھائیں گے اور میری تحریر کو ہالی وڈ کے مناظر سے بھی زیادہ مخربِ اخلاق قرار دیں گے۔ آپ جو رائے چاہیں قائم کرلیں، ہم آپ سے کوئی چیز چھپاتے نہیں۔ اس لئے آم کی پسندیدگی کی وجہ بھی بتا ہی دیتے ہیں۔ ہمارے لئے آم چوما چاٹی کا متبادل ذریعہ ہے۔ (ہمارے نزدیک یہ قطعاً مضرِ صحت اور مضرِ اخلاق نہیں)۔ اس لئے میں آموں کی مختلف قسموں میں صرف چوسنے والے آم پسند کرتا ہوں۔ آم چوسنے کے دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو اس سے مردانگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے، وہ یوں کہ جب تک نہ یہ ہوا نکالے ہوئے غبارے کی مانند ہو جائے، تب تک برابر چوستے رہیں۔ دوسرا ضمنی فائدہ یہ ہے کہ آم چوسنے سے آدمی ہماری طرح شیریں بیان

ہو جاتا ہے۔آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ہمارے لیڈروں کی باتوں میں جو مٹھاس پائی جاتی ہے وہ آم چوسنے کی مرہونِ منت ہے۔ یہ صاحبان دن رات آم چوستے رہتے ہیں جب آموں کا موسم نہ ہوتو پھر عوام کو چوستے ہیں اور ہماری طرح اتنا چوستے ہیں کہ عوام بھی ہوا نکالے ہوئے غباروں کی طرح سڑکوں پر،شہر کے نکڑوں پر،کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر بکھرے پڑے نظر آتے ہیں۔امرا اور وزرا چوس کر انہیں جب پھینکتے ہیں،تو افسر شاہی کی مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں اور وہ بھی چوس چوس کر دل کی بھڑاس نکالتی ہیں اور عوام کی رہی سہی کسر نکال لیتی ہیں۔

دیکھئے،ہم غالبؔ کی طرح مغل بچے نہیں کہ جس نازنین پر مریں،اسے مار کر ہی رکھ دیں۔البتہ کشمیری بچے ضرور ہیں۔آم اور عوام پر مرتے ہیں اور دونوں کو خوب چوس کر ہی رکھتے ہیں۔ایک دن میں چوسنے کے عمل سے فارغ ہوا تو اچانک میری نظر عجائب خانہ میں محفوظ اپنے شجرۂ نسب پر پڑی۔اسے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارے پرکھوں کا بھی چوسنے کا یہی انداز رہا ہے،جو صدیوں سے ہمیں چوستے رہے۔ جونک کی طرح ہمارے جسموں کے ساتھ چمٹ گئے۔ظاہر ہے کہ ہماری نفسیات پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔اس لئے چوسنے کی یہ لت ہمیں اپنے لیڈروں کے سبب پڑی ہے۔ ہمارے اندر اتنی قوت نہیں تھی کہ انہیں چوس لیں۔اس لئے ردِ عمل کے طور پر ہم نرم و ملائم آم چوسنے لگے۔ادھر جب سے کھوکھلی مذہبیت کے علم بردار کھوکھلے علما نے ہماری عقل کو چاٹنا اور چوسنا شروع کر دیا ہم نے آم چوسنے کے عمل میں اور زیادہ سرگرمی دکھانی شروع کی تا کہ اپنی ''مردانگی'' کا بھرم بھی قائم رہے۔(یہ اور بات ہے کہ اس عمل میں کئی میر و وزیر خجل وخوار ہوئے)۔

آموں کے ساتھ ہماری دل بستگی اور وابستگی کا راز اب آپ پر پوری طرح آشکار ہو چکا۔ہم کوئی بات چھپاتے نہیں (سوائے اپنی بات کے) اس لئے پوری

بات بتانے میں حرج ہی کیا ہے۔ جب ہماری جوانی کے دن تھے، جوانی کی راتیں تھیں تو اُن دنوں جب آم کے باغوں اور آم کے بوروں کے بارے میں سنتے تھے تو دل مچل مچل جاتا تھا۔ رہ رہ کر دل میں یہ حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش ہمارے یہاں بھی آموں کے باغ ہوتے، آم کے بوروں کی خوشبوؤں کا ڈھیرا ہوتا، چمپئی اُجالا ہوتا اور ان رومان پرور لمحات میں باغوں میں ہم ہوتے، تُم ہوتے، وہ ہوتے تو کیا ہوتا......

...... جھولا ڈالتے ....لمبی لمبی پینگیں لیتے ....اور پھر شادابی اور سرمستی اور رعنائی کی رِم جھِم میں بھیگ بھیگ جاتے۔ ہائے کس کس مزے سے ہم بھی زندگی کرتے۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے، چاند کے ڈوبنے تک جھولے میں جھولتے۔ کہیں کوئل کوکتی، کہیں چکور ناچتا۔ سارا عالم رقصاں رقصاں نظر آتا۔ ہمارے دل میں حسرت کی یہ آگ اس وقت اور زیادہ بھڑک اُٹھتی جب یہ سنا کہ آم کو پکا بھی لگتا ہے یعنی جب پک جاتا ہے تو ڈال ڈال اور شاخ شاخ سے ٹپکنے لگتا ہے۔ یہ سن کر ہمیشہ منہ سے رال ٹپکتی۔ بہر حال دل کی حسرت دل میں ہی رہی البتہ ''حسرتِ دید'' کے ان لمحات میں اچانک یہ الہام ہوا کہ آم ہماری ہی نسل سے تعلق رکھتا ہے یہ اصلاً کشمیری نثراد ہے۔ اس کے آبا و اجداد کا تعلق اپنے عجائب خانہ سے ہے۔ اپنے شجرہ نسب کو دوبارہ بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ آم یہاں سے ہجرت کر کے بیرون عجائب خانہ مقیم ہوا۔ شجرہ نسب میں درج مذکورہ بیان پر ذرا سا غور کرنے سے اسے امر واقعہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں رہا۔ اپنے اور آم کے درمیان اتنی مماثلت اور مشابہت نظر آئی کہ اگر لکھنا چاہیں تو کاغذ ختم ہوں گے، سیاہی ختم ہوگی لیکن ہماری بات ختم نہیں ہوگی اس لئے مختصراً ہی عرض کرتے ہیں کہ آم اور ہم میں ایک بڑی مماثلت تو یہی ہے کہ دونوں چوسے جاتے ہیں۔

باپ رے............ہم کہاں بھٹک گئے۔ بات رس بھرے آموں سے شروع ہو کر کون سی بے رس باتوں میں اٹک گئی۔ ہم بات کر رہے تھے کہ آم چوسنے سے ہمیں

یک گونہ لذت حاصل ہوتی ہے لیکن درمیان میں بے لذت باتیں بغیر دستک دیئے در آئیں۔ آموں سے متعلق بات کرتے ہوئے ہم تاڑ گئے تھے کہ بے لذت اور بے رنگ باتیں کھڑی کھڑی ہمارا منہ تک رہی ہیں۔ ہم سے ان کی نظریں چار ہوئیں تو ہم نے نظریں پھیر لیں تا کہ اِن میں اگر شرم و حیا کی رمق موجود ہو تو خود بہ خود بے التفاتی اور بے رخی دیکھ کر دروازے سے ہی اُلٹے پاؤں واپس چلی جائیں گی۔ لیکن یہ تو ہم سے بھی زیادہ بے شرم نکلیں اور یہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ آدھمکیں، وقت، موقعہ اور مناسبت کا خیال کئے بغیر۔ خیر ان کی بے شرمی پر ہم اتنا زیادہ چیں بہ جبیں کیوں ہو جائیں۔۔ کیونکہ ''شرم'' جب ایک بار جائے پھر صرف ''بے شرمی'' ہی رِہ جاتی ہے۔

عزیزو! اصل قصہ یہ تھا کہ آم کے باغوں کے متعلق عہد جوانی (جو ہم نے رو رو کے کاٹا) میں جب بڑی افسانوی اور رومانوی باتیں سنتے تھے تو دل میں حسرت (بس حسرت ہی حسرت ہے عزیزو) پیدا ہوتی تھی کہ کاش ہمارے یہاں آموں کے باغ ہوتے، آم کے بوروں کی خوشبو ہوتی۔ پھر ہم دنیا والوں سے مخاطب ہوتے کہ ''آم کھائے پال کا، خربوزہ کھائے ڈال کا، پانی پیئے تال کا۔'' ہائے کس کس مزے سے زندگی کرتے۔ سجن ہوتے، سِکھیاں ہوتیں، شاخ شاخ لٹکتے ہوئے آم ہوتے، ہم ہوتے تم ہوتے، جھولا ڈالتے۔ پینگیں لیتے (اور شاید بڑھاتے بھی)۔ کیا کیا نہیں کرتے۔ عہد جوانی گیا اور پیری آ گئی (جس میں آدمی آنکھیں موند لیتا ہے) خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پیری میں آنکھیں موندنے سے پہلے قدرت نے ہماری حسرتِ دیرینہ بھی پوری کر دی۔ آم کے باغوں سے محرومی کی تلافی یوں ہوئی کہ یہاں ''سبز باغ'' اُگائے گئے اور نتیجہ ہر طرف سبز باغوں کی بہار پر بہار ہے۔ رب دی قسم! اس پیری میں بھی یہ سبز باغ ہمیں بھا گئے۔ باقی سبھی باغ بھول گئے۔ نشاط و شالیمار کا کیا پوچھتے ہو، ہم آم کے باغ بھی بھول گئے۔ اب ہم ہیں اور سبز باغ ہیں تا حد نظر، رفیقو......! ●●

☆...... پروفیسر منصور احمد منصور

کٹا کٹ، لٹالٹ است ہرسو

آج کل عجائب خانہ کا موسم ،موسم کٹا کٹ اور لٹا لٹ ہے بظاہر یہ سال کا پانچواں موسم ہے۔ چار موسم بہار، گرما، خزان اور سرما کے ہوتے ہیں۔ پانچواں موسم کوئی نہیں اسلئے ''موسم کٹا کٹ اور لٹالٹ'' بھی سال کا کوئی پانچواں یا نیا موسم نہیں بلکہ بہار اور خزاں ہی کا دوسرا نام ہے۔خزاں میں دھان ہلکی اور گھاس کی کٹائی ہوتی ہے اسلئے ''موسم کٹا کٹ'' ہے۔ بہار میں پھول کھلتے ہیں جو دل موہ لیتے ہیں اور لوگ بہار پر دل لٹاتے ہیں اسلئے موسم لٹالٹ کہلاتا ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عجائب خانہ میں وہی پرانے موسم ہیں۔موسموں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ حالانکہ یہاں سیاسی جماعتوں اور قائدین کے موقف میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ترجیحات بدل گئیں منزل اور راستے تبدیل ہوئے لیکن اس سے موسم پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ جو موسم کل تھا، وہی آج بھی ہے یعنی۔

کٹا کٹ لٹالٹ است ہرسو

موسم جیسا بھی ہے موسم ہے اور ہر موسم کا رنگ جدا جدا ہوتا ہے۔اس لئے ہمیں موسم کے ساتھ تعرض نہیں کرنا چاہے۔ پھر ہم نے موسم کی بات کیوں چھیڑ دی۔ آپ سے کیا چھپانا۔صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ ہمیں چھیڑنے اور چھیڑ خوانی کی عادت بچپن سے پڑی ہے۔اس لئے بڑھاپے میں بھی ''چھیڑ چھاڑ'' کی عادت سے باز نہیں رہ سکتے۔بڑھاپا یوں بھی جوانی سے زیادہ کافر ہوتا ہے۔ بڑھاپے کا عشق بھی

زبان زدعام ہے۔اس لئے میری چھیڑ چھاڑ کی عادت بڑھاپے میں بھی نہ گئی۔چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔اس چھیڑ چھاڑ کا محرک یہ ہے کہ آج برسوں بعد بچھڑا یارسرِ راہ ملا تو بے ساختہ زبان سے نکلا۔۔۔۔"دل تم پر کب کا لٹا چکے ہیں صنم"۔۔۔ (چھیڑنا مقصود نہیں تھا) ہمارے اظہارِ عشق پر اک ادائے ناز سے انہوں نے فرمایا!

جھوٹ۔تم نے دل لٹایا نہیں۔۔۔ہاں ہم نے دل ضرور لوٹا تھا۔ یہ بات میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی کہ میں نے لٹایا نہیں لوٹا گیا ہوں۔ برسوں گزرنے کے بعد دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ بیتے ہوئے لمحے، بیتی ہوئی رتیں سب یاد آنے لگیں اور ساتھ ہی خیال بھی آیا۔۔۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ لٹنے اور لٹانے میں کیا فرق ہے۔ جب میں لوٹا گیا تو کیا اس لٹنے میں میرے ارادے، میری خواہش اور میری چاہت کا کوئی دخل نہیں تھا۔کیا یہ واقعی صنم ہی تھا جس نے مجھے لوٹا تھا، مذکورہ سوال پر غور کرنے سے یہ عقدہ کھلا کہ لٹنے اور لٹانے دونوں میں کوئی فرق نہیں الا یہ کہ لٹنے میں ذاتی ارادے کو دخل نہیں بلکہ لٹنا سراسر ذاتی اور اختیاری عمل ہے۔آپ دل لٹائیں، جان لٹائیں،عمر بھر کی کمائی لٹائیں تو شوق سے لٹایئے۔ یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے لیکن لٹنا غیر اختیاری عمل ہے۔کوئی لٹیرا آیا اور گھر لے گیا تو گویا دونوں میں جو فرق وہ صرف جبر و اختیار کا ہے۔

ایک بار مولا علیؑ سے استفسار کیا گیا کہ جبر وقدر کی حقیقت کیا ہے۔انہوں نے فرمایا کہ آپ ایک پاؤں پر بھی کھڑا رہ سکتے ہیں، دونوں پاؤں ایک ساتھ اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتے یہی جبر وقدر ہے۔ یہ دونوں آپس میں اس طرح باہم شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ لٹنے لٹانے کا ہے۔ یہ بھی ایک ہی تصویر کے دورخ ہیں لیکن عجائب خانہ میں انھیں نہ صرف الگ کر کے دیکھا جاتا ہے بلکہ ان الفاظ کے سنتے ہی خوف آنے لگتا ہے۔ بدن میں

تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے اور دانت کٹ کٹ بجنے لگتے ہیں حالانکہ اردو کے سرمایۂ
الفاظ میں یہی دو لفظ بڑے ہی رس دار، مزے دار اور سدا بہار ہیں۔ لٹنا لٹانا کوئی
وحشت کی بات نہیں۔ دل والوں کی بات ہے۔ مزہ تو وہی جانے جولٹا تا ہے، اس کی
لذت وہی جانے جولٹتا ہے۔ ہم تم کیا جانتے ہیں، خاک جانتے ہیں۔ ہم تو نہ لٹتے اور
نہ ہی لٹاتے ہیں۔ بس بچا بچا کر رکھتے ہیں۔ جسم و جاں ہو، بچائے رکھتے ہیں۔ مال و
زر ہوتو سوسو ہاتھوں سے سنبھالے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اپنے حکیم الامت نے کہا تھا۔

تو بچا بچا کر نہ رکھا اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہوتو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

لیکن دو ملاؤں میں مرغی ہمیشہ حرام رہی۔ ادھر حکیم الامت نے شکستہ ہونے
کی بات کہی، ادھر فیضؔ صاحب نے یہ راگ الا اپنا شروع کیا کہ

یہ ساغر ، شیشے ، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں ، لہو رلواتے ہیں

یہ متضاد باتیں سن کر عجائب خانہ میں تمام باتیں متضاد ہی ہیں۔ ہمیں تردد ہوا
کہ بچا کر رکھیں، سالم و ثابت رکھیں یا شکستگی پر عمل پیرا ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لٹنے
اور لٹانے کی لذت سے محروم رہ گئے۔ کہاں وہ لوگ، جنہوں نے شوق وصل میں اپنی
زندگیاں لٹا دیں۔ ہر لذت اور ہر عیش و عشرت کولٹا دیا۔ اپنی آخرت کے لئے اپنی دنیا
لٹا دی۔ آنے والے کل کے لئے آج لٹا دیا۔ ہم تو بس تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے۔
لوگوں نے یہاں تک کہا کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ
دامن نچوڑ دیں تو شیطان سر پہ خاک ملے گا۔ لیکن ہم پھر بھی اپنے دامن داغدار پر

اتراتے ہیں۔ کیونکہ ہم سے شیطان بھی مات کھا گیا اور وہ بھی الامان والحفیظ کا ورد کرنے لگا۔ بات ہورہی تھی کہ ہم نقطۂ نگاہ بدل جانے کے نتیجے میں لٹنے اور لٹانے کی لذت سے محروم رہ گئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہاں کی رت بدل گئی۔ کوئی لٹ گیا، کوئی لوٹا گیا اور ہر طرف شور اٹھا۔

صدائے توپ و بندوق است ہر سو

کٹا کٹ، لٹا لٹ است ہر سو

بس پھر کیا تھا، لفظ لٹنا اور لٹانا اپنے معنی، مفہوم اور انسلاکات سے دور جا پڑے۔ ان لفظوں سے وحشت ہونے لگی۔ لوگ تھر تھر کانپنے لگے اور پسینے چھوٹنے لگے۔ علامہ اقبال کی پیشانی پر جب عرق انفعال کے قطرے نمودار ہوئے تو شانِ کریمی نے موتی سمجھ کر چن لئے لیکن ہماری پیشانی سے نکلتے ہوئے پسینے کے قطرے سراسر خجالت، ذلت اور رسوائی کی نشانی ہیں۔ کیونکہ لفظ اور ان کے معنی بدل گئے۔ نظر اور نظریئے بدل گئے۔ موقف اور حکمتِ عملی بدلتی رہی۔ لفظ بھی اس تبدل و تغیر سے کہاں بچ پاتے۔ کہاں وہ زمانہ جب کسی پہنچے ہوئے شاعر کے بارے میں لوگ سر اٹھا کر کہتے تھے...... ''صاحب وہ تو مشاعرہ لوٹ گئے''۔ کوئی مشاعرے لوٹتا تھا۔ کوئی مزے لوٹتا تھا۔ کوئی دل پھینک یار کی گلی میں دل لٹاتا تھا، جاں لٹاتا تھا۔ اپنے عجائب خانہ میں یہ سندر اور کومل الفاظ اپنی ساری جاذبیت اور کشش کھو چکے۔ لٹنے لٹانے کی بات سنتے ہی سانپ سونگھ جاتا ہے۔ چہرہ اترنے لگتا ہے حبس اور گھٹن کے ساتھ منہ پر ہوائیں اڑنے لگتی ہیں (حالانکہ عجائب خانہ میں ہوائیں بھی بند ہیں)

عجائب خانہ میں لوگ لٹتے بھی ہیں اور لوٹے بھی جارہے ہیں۔ دو دو نہیں چار چار ہاتھوں سے۔ کچھ لوگ اس پر شور مچاتے ہیں کہ لیٹرے لوٹ کر چلے گئے۔ اس سے پہلے بھی لٹتے رہے۔ ضمیر لٹتا رہا، دانائی و بینائی لٹتی رہی، حقوق لٹتے رہے۔

ہمارے خون پسینے کی کمائی پر ہاتھ صاف ہوتے رہے لیکن اس پر کسی نے شور نہیں مچایا کہ ضمیر لوٹا گیا ہے، دانش لٹ گی (سوائے علامہ اقبالؔ کے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ والوں کی دانش لٹ گئی)۔ یہاں اس بات پر کسی نے شور نہیں اٹھایا کہ دھونس، دباؤ، دھاندلی، لالچ اور ترغیب وتحریص کے ذریعہ یاں عقل لوٹی جارہی ہے۔ پتہ نہیں اب کیوں یہ شور اٹھا کہ

کٹا کٹ، لٹالٹ است ہر سو

☆......دیپک بدکی

سونٹے

میرے لیے چھڑی سے سونٹے تک کا سفر بہت ہی دردناک رہا ہے۔ آج بھی جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو سارے بدن میں جھرجھریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہت کم خوش نصیب انسان ہوتے ہیں جنھیں بچپن میں چھڑی سے واسطہ نہیں پڑتا۔ البتہ کئی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کمسنی میں ہی چھڑی کے مختلف اقسام جیسے ڈنڈے اورسونٹے سے خوگر ہو جاتے ہیں۔ یہ چھڑی کی ارتقائی منزلیں ہیں، فرق صرف موٹائی اور قطر کا ہوتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب چھڑی سے کام نہیں چلتا ہے تو ڈنڈے سے کام لیا جاتا ہے اور پھر جب وہ بھی بے کار ثابت ہوتا ہے تو سونٹے سے بدن پر نقش ونگار کیے جاتے ہیں۔ کئی بچے جوان تینوں مرحلوں سے بخوبی گزر جاتے ہیں عام طور پر کچھ وقت سلاخوں کے پیچھے گزارتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی رہنما بن جاتے ہیں اور کچھ سیاست دانوں کے لیے کام کرنے والے گرگے۔ ایسے لوگوں کا مستقبل حد سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ چھڑی سے میری ملاقات بچپن میں ہوئی تھی۔ رات کو جب میرے پتا جی تھکے ماندے کام سے لوٹ کر گھر آتے تو ماتا جی یا گھر کے دوسرے بزرگ میرے خلاف کان بھر لیتے جس کے بعد ان کا غیظ وغضب دیکھنے لائق ہوتا۔ دراصل وہ اس وقت آرام اور سکون کی تلاش میں ہوتے تھے مگر اس کے بدلے انھیں یہ سب باتیں سننا پڑتیں اس لیے وہ اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام رہ جاتے۔ پتا جی

مجھ سے جواب طلبی کیے بغیر کہیں سے کوئی چھڑی ڈھونڈ کر لاتے اور میرے بدن پر نقش و نگار کرتے ۔ بات چاہے کچھ بھی ہوتی ، ان کی چھڑی کا رقص تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ چھڑی زیادہ موٹی نہیں ہوتی تھی مگر اس میں بید کی سی لچک ہوتی اور جب بدن پر پڑتی تو چنگاریاں پیدا کرتی۔ میں اچھلتا، کودتا، چلاّتا، قلابازیاں کھاتا اور روتے روتے آسماں سر پر اٹھالیتا مگر کیا مجال پتا جی پر کوئی اثر ہو جاتا۔ اکثر و بیشتر والدہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتی:

''آج دن بھر اس بندے نے گھر میں قدم بھی نہ رکھا، صبح کا نکلا ہے اور ابھی آپ کے آنے سے پہلے گھر میں داخل ہوا ہے۔ کھانے کی فکر نہ پڑھنے لکھنے کی فکر، اس کو تو صبح سے شام تک صرف کرکٹ کھیلنے کا چسکا لگا رہتا ہے۔ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔''

اب بھلا بتایئے کہ پتا جی تو کام پر صبح کے نکل جاتے تھے ، دن بھر محنت مزدوری کر کے پسینے میں شرابور رات کو لوٹ آتے ، یہ سب کچھ سننے سے تلملا نہ جاتے تو پھر کیا کرتے ۔ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سپنے سنجوئے تھے انھوں نے ۔ آدمی سوچتا ہے کہ گھر بار کے لیے دن بھر کام کرتا ہوں، لوگوں کا بُرا بھلا سنتا ہوں، سوچتا ہوں کہ گھر پہنچوں گا تو وہاں آرام ملے گا، بیوی گرم گرم کھانا پروسے گی، بچے خوشی خوشی ارد گرد جمع ہوں گے اور اپنے دن بھر کے کام کا بیورا دیں گے ۔ مگر یہاں تو الٹی ہی گنگا بہتی تھی ۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہی نہیں ہوتا کہ میرے خلاف شکایتوں کا انبار لگ جاتا ۔ آج دن بھر گھر میں قدم نہیں رکھا۔ پڑوسی کے بیٹے بنٹی سے جھگڑا کیا اور اس کو چوٹ لگائی ۔ آنگن میں کرکٹ کھیلتے کھیلتے پڑوسیوں کے دو شیشے توڑ دیے ۔ یہ سب سن کر پتا جی کو کہاں چین آ جاتا، آؤ دیکھتے نہ تاؤ۔ کہیں سے چھڑی برآمد کرتے اور مجھے تب تک پیٹتے رہتے جب تک ماتا جی کھانا نہ پروستی ۔ ممکن ہے کہ ماتا جی کو دل میں درد کی کہیں کوئی ٹیس اٹھتی ہو مگر باہر سے ایسا منہ بنا لیتی جیسے خوش ہو رہی تھیں ۔ بڑی بہن تو اشاروں اشاروں میں کہتی کہ دیکھا مجھ کو تنگ کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ اور میں درد کا

مارا، روتے روتے بے حال ہوجاتا، کھانا کھانے سے انکار کردیتا اور پھر نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ جاتی اور بھوکا ہی سوجاتا۔

البتہ ماں رات بھر سو نہیں پاتی تھی، صبح سویرے ہی میرے لیے لذیذ ناشتہ بنا کر سامنے رکھ دیتی جس کو میں جلدی سے زہر مار کر لیتا اور کل رات کا واقع یکسر بھول جاتا۔ پتا جی چھڑی کو پھر اپنی جگہ پر رکھ لیتے اور اگلے اپی سوڈ کا انتظار کرتے۔ بچپن کی اس بے سبب پٹائی کی وجہ سے میں نہ تو کرکٹ پر فوکس کر سکا گو مجھے اس میں خاصی دلچسپی تھی اور نہ پڑھائی کے معاملے میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کر سکا کیونکہ پڑھائی میں میری کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ان دنوں کرکٹ میں زیادہ پیسہ نہیں ملتا تھا اس لیے والدین بچوں کو کرکٹ کھیلنے میں فضول وقت ضائع کرنے سے روکتے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کرکٹر سیلی برٹی بن جائیں گے، ان کے پاس دو تین سو کروڑ کے گھر ہوں گے اور ان کے گیراج میں ایک سے بڑھ کر ایک بیسیوں موٹر سائیکلیں قطار میں کھڑی ہوں گی۔ ان دنوں تو کرکٹر ہونا ایک شاپ تھا، کسی کو کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی تو اس کے لیے مناسب سرمایہ میسر نہ ہوتا۔

خیر پتا جی کی چھڑی اور ماتا جی کی چغلی نے مجھے کرکٹر بننے سے باز رکھا اور اس طرح ہندوستان کو ایک اور سچن تیندولکر یا دھونی ملنے سے رہا۔

اسکول میں ہر استاد کے پاس ایک چھڑی ہوتی تھی جس سے وہ کلاس کو چپ کراتا تھا۔ صرف ایک ڈرِل ماسٹر تھا جس کے پاس ایک مخصوص قسم کی چھڑی ہوتی تھی جس کو وہ 'کین' کہتا تھا۔ وہ ڈرِل، مارچ پاسٹ اور بینڈ کا ماہر تھا۔ این سی سی کی پریڈ بھی کراتا تھا۔ پڑھانا وڑھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کین اور کیپٹن کی رینک اس کو این سی سی کی بدولت ملے تھے۔ کین زیادہ لمبا نہیں تھا، ایک میٹر سے کم ہی تھا،

ایک سرے پر موٹھ تھی جو دھات کی بنی ہوئی تھی اور ہمیشہ چمکتی رہتی تھی۔اسی کو پکڑ کر وہ بچوں پر اپنا رعب جماتا تھا۔ایک روز ہماری کلاس تفریح کے لیے نزدیکی پہاڑی مقام پر چلی گئی۔ایک طالب علم نے اپنے ساتھ سگریٹ کا پیکٹ لایا تھا۔شکل وصورت سے وہ بہت ہی شریف معلوم ہوتا تھا اس لیے مجھے اس کا یہ فعل دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ہم جماعت ہونے کی وجہ سے میں نے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی۔لنچ کرنے کے بعد ہم چار طالب علم گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئے اور ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے رہے۔سمجھ میں نہیں آیا کہ کس نے ہمیں ایسا کرتے ہوئے دیکھا اور ہماری مخبری کی۔ پھر کیا تھا۔دوسرے روز دعائیہ مجلس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے سگریٹ نوشی کے بُرے نتائج پر لمبا چوڑا لیکچر دیا۔تقریر ختم ہونے کے بعد ڈرل ماسٹر نے ان چاروں طالب علموں کے نام لیے جنھوں نے ایک روز پہلے ایکسکرشن کے دوران سگریٹ نوشی کی تھی۔سبھی کو سامنے کھڑا کر دیا گیا اور پھر کین سے خوب پٹائی کی گئی۔ڈرل ماسٹر اپنے کین کو 'عقل نما' کہتا تھا۔اس کا ماننا تھا کہ کین کی مار کھا کر بچے کی عقل آجاتی ہے اور وہ اچھے اور برے کام میں تمیز کرنا سیکھ جاتا ہے۔مار کھا کر میرے جسم خاص کر بانہوں اور کمر پر نیل پڑ گئے۔تاہم اسکول میں جو ہوا سو ہوا، میرے ایک کزن نے، جو اسی اسکول میں مجھ سے دو کلاس جونیئر تھا، یہ خبر گھر تک پہنچا دی اور وہاں پتا جی کے ڈنڈے نے باقی ماندہ کام کیا۔غرض تین چار دن میں کراہتا رہا اور گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔ اسکول جانا تو ممکن ہی نہ تھا، وہاں دوستوں کو کیسے منہ دکھاتا۔خیر آہستہ آہستہ زخم مندمل ہوگئے اور ایک ہفتے کے بعد میں پھر سے اسکول جانے لگا۔'عقل نما' میری عقل سدھارنے میں ناکام رہا اور اس واقعے کے بعد سگریٹ نوشی میری عادت بن گئی۔

چھڑی کیسے جوان ہوگئی اور ڈنڈا بن گئی، اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔صرف اتنا یاد ہے کہ میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا۔گھر میں

سبھی برہم بیٹھے تھے۔ پتا جی غصے کے مارے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ انھوں نے نہ جانے کہاں سے ایک موٹا سا ڈنڈا لایا اور مجھے اس سے مارنے لگے۔ زندگی میں پہلی بار اتنے موٹے ڈنڈے کی مار کھا رہا تھا۔ بہت رویا، چلّایا اور چیخا مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔ روتے روتے ہی پتا جی سے سوال کر بیٹھا۔

''آپ کیوں مجھے اس ڈنڈے سے مار رہے ہیں؟''

''یہ عقل نما ہے۔ تم جیسے شریر بچوں کو ہوش میں لانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی بدولت تم آگے محنت کرو گے اور مستقبل میں اچھے نمبر لاؤ گے۔ تمھیں اس کی اشد ضرورت ہے۔''

''اوہ پاپا۔ میرے بدن پر کیا گزری ہے اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آپ بھی تو میٹرک میں تھرڈ ڈویژن لے کر پاس ہوئے تھے۔ آپ کے پتا جی نے بھی تو مایوس ہو کر آپ کی پٹائی کی ہو گی مگر کیا حاصل ہوا؟ سال بھر کالج گئے اور پھر پڑھائی چھوڑ کر نوکری کرنے لگے۔ شکر کیجیے کہ ماما جی کی سفارش سے پرائیویٹ بنک میں نوکری ملی تھی ورنہ....! آپ کے کیس میں تو یہ عقل نما بھی فیل ہوا تھا۔''

''بیٹے اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ اب کمپیٹیشن کا زمانہ ہے۔ نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ تھرڈ ڈویژن والوں کو کالج میں ایڈمشن ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تم نے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میری تمنّا تھی کہ تم پڑھ لکھ کر ایک بہت بڑے افسر بن جاؤ گے۔ سماج میں عزت پاؤ گے اور ہماری مالی حالت سدھر جائے گی۔ مگر تم مٹر گشتی کرتے رہے، میرے ارمانوں کا کبھی خیال نہیں کیا اور بار بار سمجھانے کے باوجود تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔''

''پتا جی، یہی حال آپ کے پتا جی کا بھی ہوا ہوگا۔ انھوں نے آپ کے بارے میں نہ جانے کتنے خواب پالے ہوں گے۔ سوچا ہوگا کہ لڑکا بڑا ہو کر خاندان کا

نام روشن کرے گا۔مگر آپ میٹرک کے آگے چل ہی نہ پائے۔جب آپ نے اپنے پتا جی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تو پھر مجھ سے ایسی امیدیں کیوں لگا رکھی ہیں؟ اپنی قابلیت کے مطابق مجھ سے جتنی محنت ہو پاتی ہے اتنی کرتا ہوں، نہ جانے کیوں ممتحنین کو میرے جوابات پسند نہیں آتے؟''

جواب سن کر پتا جی کے ڈنڈے پر فالج گر گیا اور اس نے تھرکنا بند کر دیا۔وہ دن اور آج کا دن میرے بدن پر پتا جی کا ڈنڈا کبھی نہیں پڑا۔مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد میں ڈنڈے سے آزاد ہو گیا۔بالکل نہیں۔کالج میں ایک دن فلم دیکھنے کا موڈ بنا اور میں کلاس چھوڑ کر سینما گھر پہنچ گیا۔احمری چوک میں واقع سب سے پرانے سینما ہال میں دلیپ کمار کی فلم چل رہی تھی۔لوگ دیوانے ہو رہے تھے حالانکہ فلم کو لگے ہوئے پورے چھ ہفتے گزر چکے تھے لیکن بھیڑ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔خیر میں بھی لائن میں کھڑا ہو گیا مگر دل مان نہیں رہا تھا کہ ٹکٹ مل جائے گی۔قطار میں جو لوگ کھڑے تھے وہ دھکا پیلی کر رہے تھے جس سے قطار کئی بار منحنی ہو جاتی۔پھر ایک ریلا آجاتا اور کچھ لوگ قطار سے باہر ہو جاتے اور انھیں واپس اپنی جگہ نہیں مل پاتی تھی۔ سینما ہال میں چند پولیس والے تعینات تھے مگر وہ محض تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ہر طرف شور شرابا ہو رہا تھا۔اسی شور کے درمیان کانوں میں کالا بازاریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔بالکونی دس، ڈریس سرکل سات.....ڈریس سرکل سات، بالکونی دس....! دل میں خیال آتا کہ ان ہی سے ٹکٹ خرید لوں اور ہال کے اندر چلا جاؤں مگر حوصلہ کہہ رہا تھا کہ کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے، اگر نہیں ملے گی تو پھر بلیک میں خرید لیں گے۔سینما ہال کے مالک نے ان قطاروں کو قابو میں رکھنے کا کام ایک تند خو آدمی کو سونپ دیا تھا جس کا نام تھا جبّار شہدا۔کسرتی بدن، رنگ سیاہ مائل، چیچک زدہ چہرہ، اور گھنی مونچھیں جو اس کے چہرے کو اور بھی خوفناک بناتی تھیں۔وہ اکیلے ہی مختلف قطاروں میں نظم وضبط

پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔کسی نے مجھے بتایا کہ جبّار شہدا بہت عرصہ پہلے بلیکر ہوا کرتا تھا، پھر اس نے کچھ نوجوانوں کو اس کام کے لیے مامور کرلیا اور خود ترقی پا کر ان کا سرغنہ بن بیٹھا۔سینما گھر کے سبھی ٹکٹ بیچنے والوں سے اس کی ساز باز تھی ۔اس کے لیے تیس فیصد ٹکٹیں پہلے ہی سے مختص ہوتیں جن کو جبّار اپنے حواریوں میں بانٹتا تھا۔ ان پر کمائے ہوئے نفع میں سے وہ اپنا حصہ الگ نکال کر شاگردوں میں تقسیم کرلیتا تھا۔ جب سے کالا بازاری کی آمدنی یقینی بن گئی،سینما گھر کے مالکان نے اسے سینما ہال کی بھیڑ کو قابو میں رکھنے کے لیے تعینات کیا اور اس کے لیے معقول معاوضہ بھی دینے لگے۔اس روز جب وہ ہماری قطار کے پاس پہنچا،اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک ریلا سا آ گیا اور لائن سانپ کی طرح بل کھانے لگی ۔ پیچھے سے دھکا پیل کی وجہ سے درمیان میں کھڑے شریف اور کمزور لوگ قطار سے باہر پھینک دیے گئے اور قطار میں انھیں اب کوئی جگہ نہیں دے رہا تھا۔میرے لیے تو یہ نیا تجربہ تھا۔کہاں تو میں نے سوچا تھا کہ پانچ چھ منٹ کے بعد میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جاؤں گا اور کہاں تو میں لائن سے باہر ہوگیا اور واپس لائن میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا مگر لائن میں کھڑے لوگ احتجاجاً شور مچانے لگے اور مجھے بیچ میں گھسنے سے روکنے لگے۔اسی شور و غل میں میری کمر پر جبّار شہدا کے دو تین سونٹے پڑ گئے اور میں لڑھکتا ہوا زمین پر گر گیا۔بھیڑ میں کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔سبھی اپنا مقام برقرار رکھنے کی تاک میں تھے۔ کچھ وقفے کے بعد پولیس کے دو سپاہی آئے اور انھوں نے مجھے فرش پر کراہتے ہوئے دیکھ کر مجھ پر ترس کھایا، مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا اور سامنے ایک دوا فروش کی دکان پر میرے زخموں پر مرہم لگوائی۔دکان دار نے میرے لیے دودھ کا ایک گلاس منگوایا اور مجھے پینے کو دیا۔پھر اس نے مجھ پر رحم کھا کر گھر بھیج دیا۔انجام کار میں کالج سے بھی گیا اور فلم سے بھی۔
ملازمت کے بعد بھی سونٹوں سے میرا ناتا برقرار رہا۔میری تقرری ایک

سکول میں بحیثیت استاد کے ہوئی۔ چند سال تو یوں ہی گزر گئے، پھر لوپیڈ ایمپلائیز یونین نے فیصلہ کرلیا کہ تنخواہ بڑھانے کے لیے احتجاج کیا جائے۔ کچھ مدت کے لیے تو جلسے جلوس نکلتے رہے لیکن سرکار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہم نے بھی اپنی مہم تیز تر کردی۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ سنٹرل گورنمنٹ ملازمین کی طرح ہی ہماری تنخواہیں بڑھا دی جائیں مگر ریاستی سرکار نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ آخر کار ہم نے احمری چوک پر دھرنا دی اور اس شاہراہ پر سارا ٹریفک روک لیا۔ پہلے تو سرکار نے زیادہ کچھ دھیان نہ دیا مگر جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو ڈی ایم نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دیا۔ بانس کے سونٹے، جنھیں پولیس لاٹھیاں کہتی ہے، بہت بھاری ہوتے ہیں اور شدید ضرب پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے سڑک پر ہی سٹیج بنایا تھا اس لیے ایک ایک کر کے ہمارے رہنما لیکچر دے رہے تھے اور آگے کی کارروائی کے بارے میں ہمیں مطلع کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں نہ جانے کہاں سے پولیس کا ایک جتھا، ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے ہوئے، ہماری طرف بڑھا اور تابڑ توڑ لاٹھی چارج کرنے لگا۔ کچھ لاٹھیاں میرے جسم پر بھی پڑیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لاٹھیاں ٹانگوں یا جسم کے نچلے حصے پر ماری جاتیں مگر ایسے موقعے پر کون احتیاط برتتا ہے۔ جس کسی نے مجھ پر لاٹھیاں ماریں، ایک دو سیدھے میرے سر پر آلگیں اور میرے سر سے خون بہنے لگا۔ ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ مجھے کس نے اٹھایا اور کب ہسپتال پہنچا دیا جہاں میرے سر پر ٹانکے لگائے گئے اور پھر مرہم پٹی کر لی گئی۔ ہسپتال سے کئی روز کے بعد چھٹی مل گئی۔ دریں اثنا گھر والوں کو پتہ چل گیا سو وہ تیمارداری کے لیے ہسپتال پہنچ گئے۔

ہوش آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سونٹے انسان کا مہد سے لحد تک پیچھا نہیں چھوڑتے اور ان سے کہیں نہ کہیں پر ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ البتہ ان کی ہیئت بدل جاتی ہیں۔ کبھی چھڑی، کبھی کین، کبھی ڈنڈا، کبھی سونٹا اور کبھی لاٹھی....! ●●

☆......دیپک بدکی

صوتی آلودگی

شور مچانا ہم سب کا پیدائشی حق ہے۔

ہے نا عجیب سی بات۔شور وغل سے پیدا ہورہی آلودگی پر انگلی اٹھانا کہاں کی عقلمندی ہے...!اور وہ بھی سوشل میڈیا پر...!

شور...! صوتی کثافت ....!ذہنی آلودگی .....! انسانی اعصاب پر اثر کرنے والی مضر آوازیں ....! یہ سب اصطلاحات مغربی معاشرے سے متعلق ہوں تو ہوں، یہاں مشرق میں کون ان کی پرواہ کرتا ہے۔

صوتی کثافت سب سے زیادہ پھیلی ہوئی آلودگیوں میں سے ایک ہے .....بنی نوع انسان کے لیے تکلیف دہ....نہ صرف ماحولیاتی خسارہ بلکہ جسمانی اور دماغی صحت کے لیے بھی ضرر رساں۔بے چینی، کھچاؤ، اور برہمی کی ایک بہت ناگوار علّت۔ مشینی اور ٹیکنالوجکل دور کی سوغات....!

کچھ روز پہلے بالی وُڈ کے ایک گائک نے ٹُویٹر پر مسجدوں سے صبح سویرے بلند ہورہی اذان پر پابندی لگانے کی درخواست کی۔ مجھے اس کی اس حماقت پر ہنسی آئی۔ مجھے یاد آیا کہ آٹو رکشا، پسنجر گاڑی، پان کی دکان، شادی بیاہ کی تقریب یا پھر بھجن کیرتن کے دوران خود اس گائک کے گانے اتنی زور سے بجتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔

لوگ صبح سویرے لاوڈ اسپیکروں پر اذان کی آواز سن کر جاگتے ہیں...ان کا

دن شروع ہوتا ہے۔ راسخ العقیدہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مسجدوں کی جانب نکل پڑتے ہیں یا پھر اپنے ہی گھر میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مگر دوسری جانب کچھ لوگوں کے آرام میں خلل پڑتا ہے جو دیر رات تک ناچ گانوں کی محفلوں میں دھما چوکڑی مچا کر آسمان سر پر اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ دور دور تک کسی کو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ اگر وہ پروگرام ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہو تو کروڑوں لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے چہیتے گلوکار کو سننے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور رات بھر نہ خود سوتے ہیں نہ ہی اپنی فیملی کو سونے دیتے ہیں۔ یہ بات الگ کہ طلبہ کی تعلیم میں خلل پڑتی ہے اور غریب مزدور پیشہ لوگوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کسی آٹو یا بس میں سفر کیجیے تو ان گائیکوں کے گانے اونچی آواز میں سن کر کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ آپ ڈرائیور کو کہہ سکیں کہ بھائی آواز دھیمی کر لو۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ گلوکار صبح جلدی کیسے اٹھ سکتے ہیں۔ ایک تو دیر رات سے گھر لوٹتے ہیں اور واپس آ کر بہت دیر تک آنکھیں نیند کے لیے ترستی ہیں، تب کہیں جا کر صبح دم آنکھ لگی تو لگی ورنہ بغیر نیند کے رات گزر جاتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ان لاوڈ اسپیکروں کا شور برداشت کر سکیں۔

میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ آخر بانگِ نماز ہی کیوں؟ کلبوں کا مسلسل شور و غل، ریل گاڑیوں کی چھک چھک اور مسلسل سیٹیاں، موٹر، لاری، بسوں اور سکوٹروں کے انجنوں اور بھونپوؤں کی آوازیں، ہوائی جہازوں کی اڑانیں..... ہر طرف تو شور ہی شور سنائی دیتا ہے۔ گھروں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، سینما ہالوں میں، تفریح گاہوں میں، ڈانس ہالوں میں، جنتر منتر پر، ٹیلی ویژن پر، ریڈیو پر...ایسی کونسی جگہ ہے جہاں شور نہیں ہوتا...! کیا اس شور و غل سے آدمی کی نشو و نما پر مہیب اثر نہیں پڑتا؟ شاید اس طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی اگر بالی وُڈ کے معروف گائک نے ٹوئٹر پر اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر کے استعمال کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہوتی۔ ورنہ ہندوستانی قوم ایک

ایسی قوم ہے جو ہوا، پانی اور ماحول کی کثافتوں سے سمجھوتا کرنے میں یکتا ہے۔ اس قوم پر کچھ بھی ٹھونسیے... امریکا سے رد کیے گئے زہر اگلتے تانبے کے سمیلٹر اس دھرتی پر لگائیے، دھواں چھوڑتی ہوئی دقیانوسی گاڑیاں استعمال کیجیے، کاربن مونو کسائڈ اگلتی فیکٹریاں نصب کیجیے، چمڑے کے کارخانوں سے نکلتی غلاظت گنگا اور جمنا میں بہا دیجیے یا پھر گھروں کے اوپر نقصان دہ شعاع ریز ٹاور نصب کیجیے.... کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ تو انسانی نشو و نما کی علامتیں ہیں۔

خیر کوئی بحث طلب نکتہ چاہیے اس قوم کے اثر و رسوخ والے بے کار لوگوں کے لیے..... ایسے موضوعات کو لے کر وہ روزانہ ٹی وی چینلوں پر بال کی کھال اتارتے ہیں جن سے انھیں کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی، پھر ملی ہوئی رقم شراب پینے میں اڑاتے ہیں۔ اب تو یہ تازہ موضوع مل گیا ہے کہ کیا مسجدوں میں اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر ہونے چاہئیں یا نہیں؟ اس روز سے اس موضوع پر ٹیلی ویژن پر اتنی بحثیں ہوئیں کہ اس کے شور میں کچھ اور سنائی نہیں دیتا۔ ٹیلی ویژن پر ہر فن مولا بحث کرنے والے، عبقری، مولوی، پنڈت اور لبرل سب اپنی اپنی ہانکنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے پوچھو بھئی تم اکیلے کیوں کار میں سفر کر کے آئے، پبلک ٹرانسپورٹ سے کیوں نہیں آئے، آخر دہلی میں تو سب سے زیادہ فضائی آلودگی انہی کاروں اور گاڑیوں کی وجہ سے ہے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اتنا تو سب کو علم ہے کہ ان بحث و مباحث سے کہیں کچھ فیصلہ نہیں ہوتا۔ البتہ کئی لوگوں کی نماز قضا ہوتی ہے کیونکہ اس وقت وہ یہاں بحث کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں نے جس کالونی میں فلیٹ لیا ہے وہاں سال بھر کوئی نہ کوئی تماشا ہوتا ہی رہتا ہے۔ دو بار نوراتر کی پوجا، دیوالی کے پٹاخے الگ، پھر سندر کانڈ اور نہ جانے کون کون سے کانڈ، ایک رات کسی فلیٹ میں جگ راتا ہو رہا ہے اور دوسری رات کسی

دوسرے فلیٹ میں ۔ رات بھر گانے والے چیخ چیخ کر بھگوان کو تلاشنے میں لگے رہتے ہیں۔دراصل بھگوان کو کم اور اپنا روزگار تلاشنے میں زیادہ جٹے رہتے ہیں۔اُدھر کچھ علاقوں میں قوالیوں کی محفلیں رات بھر جمتی ہیں اور پھر رام لیلا کے ناٹک تو ہماری پرمپرا ہی ہے۔کہیں کوئی نجات کا طریقہ نظر نہیں آتا ۔اودھ میں تو طوائفیں بھی ان محفلوں کی زینت بن جاتیں ہیں۔چلو روزگار کا وسیلہ تو بن جاتا ہے۔مگر بچوں کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ صبح سویرے جنھیں اسکول یا دفتر جانا ہوتا ہے ان کے بارے میں کوئی سوچتا ہی نہیں۔دیوالی کے پٹاخوں کو دیکھ کر باقی مذاہب کے لوگوں کی آرزوئیں بھی جاگ اٹھی ہیں ، انھوں نے بھی عید، گورو پورب ، مہاویر جینتی ، اور بدھ پورنیما کے دن پٹاخے پھوڑنے کا قصد کر لیا ہے۔میرا کمرہ ساونڈ پروف نہیں ہے۔رات بھر بھجن کیرتن کی آوازیں چلی آتی ہیں جو سونے نہیں دیتیں۔پر احتجاج کرنے کی طاقت کس میں ہے۔ جو بولے اس کا برا حال۔سب خاموش۔کئی بار پولیس میں جا کر رپورٹ لکھوائی، پولیس آئی اور ساتھ ہی بنے کمپلیکس میں ہو رہے شور وغل کو دیکھا،ان کو ہدایت دے کر چل دیے۔نہ شور وغل بند ہوا اور نہ پولیس نے کوئی کارروائی کی۔

اذان کا رواج تو کب سے چلا آرہا ہے ۔مسجدوں کے میناروں سے عقیدت مندوں کو بلانے کی پرمپرا تو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے البتہ لاوڈا سپیکر کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔لاوڈ اسپیکر تو انیسویں صدی کی ایجاد ہے ۔اس سے پہلے تو مؤزن اپنی آواز پر ہی بھروسہ کرتا تھا۔اب تو دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔مسجدوں ہی میں کیوں، ہر اس عبادت گاہ میں لاوڈاسپیکر نصب کیے گئے ہیں جہاں ایشور نے پناہ لی ہے۔دنیا کے شور وغل کے بیچ ہر کوئی اپنی آواز اس تک پہنچانا چاہتا ہے۔ان کا اصول ہے کہ جب لوہا لوہے کو کاٹ سکتا ہے تو شور شور کی تسخیر کیوں نہیں کر سکتا؟

بالی وُڈ کے مہان گایک کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس میں رخنہ ڈالنے کے

لیے سینہ بہ سپر ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سوشل میڈیا کے عادی لوگ دو خیموں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو گلوکار کے حق میں ہیں اور دوسرے وہ جو گلوکار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا اور گالیاں دینا تو معمول بن چکا ہے۔ موڈرن تہذیب کی دین جو ہے۔

میں خود اس موضوع پر فکر مند ہوں۔ آخر کب تک ہم شتر مرغ بنے پھرتے رہیں گے۔ کچھ راستہ تو نکالنا پڑے گا۔ شور وغل کے مختلف ذرائع کا تجزیہ تو کرنا پڑے گا۔ ایک اذان کا شور ہی تو نہیں جو ہمارے ماحول کو آلودہ کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہیں۔ مگر کون کسے سمجھائے؟ میرے من میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ ملک میں اگر لاوڈ اسپیکروں پر اذان دینے پر پابندی لگ جائے گی تو کیا شور وغل ختم ہو جائے گا؟

سوچنا پڑے گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ کہیں ہم اپنے ماحول کو اتنا غیر محفوظ تو نہیں بنا رہے ہیں کہ ہمارا حال بھی ڈائنوسورس کی طرح ہو گا اور ہم اپنے ہی محبس ماحول میں قید ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گے۔

☆......دیپک بُدکی

بیگانے کی شادی میں عبداللہ دیوانہ

کئی روز سے امبانی شادی کا چرچا ہر گھر، ہر شہر میں ہو رہا ہے۔ صبح و شام ٹیلی ویژن پر اسی حوالے سے ویڈیو دکھائے جا رہے ہیں اور اخباروں و ان کے ضمیموں میں اس شادی کی تصویریں شائع ہو رہی ہیں۔ مشہور ہستیاں جیسے باب ڈڑلے، شاہ رخ خان، امیتابھ بچن، اکشے کمار، رنبیر کپور، ٹانی بلیئر، جان سینا، نک جوناس، پرینکا چوپڑہ، کِم کارداشیان، انانیا پانڈے وغیرہ نئے نئے خوبصورت ڈیزائنر لباسوں میں نظر آ رہے ہیں۔ آخر کیوں نہ آئیں، ایسی شادی جس میں پانچ ہزار کروڑ سے بھی زیادہ خرچ ہو گئے آج تک دنیا میں دیکھی نہ سنی۔

خیر جو بھی ہو، میں اس شادی میں شریک ہونے کے لائق ہی نہ تھا پھر کیسے شریک ہوتا، بس تصویریں دیکھ کر ہی جی بہلاتا رہا۔ البتہ تقریباً پچاس برس پہلے ایک ایسی ہی شادی میں، جو میرے معیار کے لحاظ سے بہت اونچی تھی حالانکہ مذکورہ شادی کے معیار کی گرد کو بھی نہ چھو پاتی، مجھے شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ شادی میرے ایک امیر دوست کی بہن کی تھی جس کا گھر ماڈل ٹاؤن دہلی میں واقع تھا۔ اس کا خاندانی بزنس تھا، پینٹ بناتے تھے اور برانڈ کافی مشہور تھا۔ پینٹ بنانے کے علاوہ عمارت سے متعلق کچھ ضمنی چیزیں بنانے کی بھی دو فیکٹریاں دہرہ دون میں تھیں۔ چاندنی چوک میں ایک بہت بڑی دکان تھی جہاں وہ اپنا پینٹ اور دیگر اشیا بیچتے تھے۔ کروڑوں کا کاروبار تھا جو آج کے حساب سے ہزاروں کروڑوں کے برابر ہوگا۔

نوتیج سنگھ سے میری ملاقات اتفاقاً اپنے ایک رشتے دار کے یہاں ہوئی تھی جو خود بھی بہت امیر تھا۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔ وہی رشتے دار دو تین برس بعد سردیوں میں دہلی میں قیام کرنے آیا تھا جب میں دہلی میں نوکری کرتا تھا۔ ایک روز میں بطور مدارات اسے ملنے چلا گیا کہ وہاں دوبارہ نوتیج سنگھ سے ملاقات ہوئی اور بعد میں ہماری ملاقاتیں کناٹ پلیس میں کبھی کبھار ہوتی رہیں۔ وہ مجھے ٹیلی فون پر ملنے کے لیے کہتا اور میں دفتر سے نکل کر بس میں کناٹ پلیس پہنچ جاتا جہاں وہ اور میں کئی گھنٹے چائے نوش فرماتے اور بحث ومباحث میں الجھ جاتے۔ کاروباری آدمی ہونے کے باوجود وہ علمیت کا خزانہ تھا۔ اس نے علم شماریات میں پوسٹ گریجویشن کیا تھا اور پھر فلسفے کی جانب راغب ہوا تھا۔ اُن دنوں میرے پسندیدہ رائٹر برٹرینڈ رسل کی تین جلدوں پر مشتمل سوانح عمری کا مطالعہ کررہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان زندگی کی مختلف جہات پر فکر انگیز بحثیں ہوتی تھیں۔

وہ میری دوسری پوسٹنگ تھی۔ ایک سال کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کی چنڈی گڑھ برانچ میں تعینات رہا، پھر ۱۹۷۲ء میں دہلی کی اشوکا ہوٹل برانچ میں تبادلہ ہوا۔ بنیادی ماہانہ تنخواہ ایک سو چالیس تھی اور کل ملا کر گھر لے جانے کے لیے دوسو پچاس روپے مل جاتے تھے، جس میں سے ساٹھ روپے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا، بیس روپے کام والی بائی لے جاتی تھی اور باقی ماندہ یا تو ضروریات زندگی پر خرچ ہوتا تھا یا پھر بسوں میں سفر کرنے پر۔ اکیلا تھا اس لیے نباہ کرلیتا تھا۔ کمرے میں ایک فولڈنگ بیڈ، تین شیلف کا ایک میز اور ایک کرسی تھی۔ کچن کا سارا سامان جیسے اسٹوو، پریشر کُکر، اسٹیل پلیٹ و گلاس کا ایک ایک جوڑا، تین چینی کے کپ، کڑچھی، چمچ، پلاسٹک مگ اور مصالحے کے ڈبے اسی میز میں سما جاتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک پلاسٹک کی بالٹی تھی جس کو صبح سویرے وقتِ مقررہ پر بھرنا پڑتا تھا کیونکہ پینے کے پانی کا

راشن بندھا ہوا تھا۔ باقی ٹائم کھارا پانی مہیا ہوتا تھا جس سے نہانے اور کپڑے دھونے کا کام لیا جاتا تھا۔ کپڑے بھی گنے چنے ہی تھے، زیر جامہ کپڑوں کے علاوہ دو پینٹ اور دو قمیصیں تھیں۔ کبھی کبھار کچھ رقم بچ جاتی تو کتابیں خریدنے میں صرف ہو جاتی حالانکہ میری عادت تھی کہ میں برٹش اور امریکن لائبریری سے عام طور پر کتابیں ادھار لے آتا۔ جرمانے سے بچنے کے لیے انھیں عین وقت سے پہلے واپس کرنا پڑتا تھا اور اسی بہانے تن دہی سے ان کا مطالعہ کرنا ضروری تھا۔ غرض زندگی بڑے مزے سے گزر جاتی تھی۔ غربت میں جینے کا سلیقہ ہو تو زندگی بوجھ نہیں لگتی۔ آج کے ایک لاکھ کے مقابلے میں اس وقت کے دوسو پچاس سے زیادہ سیری محسوس ہوتی تھی۔

ایک روز نوتیج سنگھ نے مجھے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے لیے مدعو کیا اور ہاتھ میں ایک خوبصورت کارڈ تھما دیا۔ میں ناں تو کر نہ سکا البتہ گھر جا کر تردّد میں پڑ گیا۔ شادی میں شریک ہونے کے لیے میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں تھے۔ ایک سوٹ یا کم سے کم ایک کوٹ تو ہونا ہی چاہیے تھا تاکہ اس کے نیچے قمیض اور پینٹ سے کام چلایا جاتا۔ دیر رات تک سوچتا رہا مگر کوئی حل سوجھ نہیں رہا تھا۔

دوسرے روز آفس پہنچا۔ آفس کیا تھا، اشوکا ہوٹل دہلی میں دستکاریوں کا ایک سرکاری شوروم تھا جہاں میں ماہانہ دوسو پچاس روپے تنخواہ پانے والا منیجر تھا۔ نام بڑا درشن تھوڑے! شوروم کی بغل میں ہینڈلوم ہاؤس کا شوروم تھا جہاں ہوٹل میں مقیم پردیسی خریداروں کے لیے مختلف قسم کے کپڑے اور عمدہ سے عمدہ پوشاک بکری کے لیے سجائے گئے تھے۔ منیجر پنجابی تھا جس کی تنخواہ ایک ہزار کے قریب تھی۔ میری اس کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ مشورہ لینے کے لیے میں اس کے پاس چلا گیا۔ ''یار یوگندر، ایک مسئلہ آن پڑا ہے۔ تمھاری صلاح چاہیے۔''

''کہو بھائی کیا بات ہے؟ بہت مایوس نظر آ رہے ہو۔''

''یار بات ہی ایسی ہے۔کل ماڈل ٹاؤن میں میرے ایک دوست کی بہن کی شادی ہورہی ہے۔اس نے نیوتا دیا ہے۔مگر میرے پاس پہننے کے لیے صرف قمیض اور پینٹ ہیں جو میں روزانہ پہنتا ہوں۔سمجھ نہیں آرہا ہے کیا کروں؟ جانا تو ضروری ہے مگر سوچتا ہوں کہ نہ جاؤں۔''

''بس اتنی چھوٹی سی بات...! میں سمجھا کوئی بہت بڑی پرابلم ہے۔''اس نے قہقہہ مارا۔

''یار، تمھیں تو ہنسی سوجھ رہی ہے۔یہاں میرا خون خشک ہورہا ہے۔''

''دیپک، وہ سامنے شوکیس میں کئی کوٹ لٹک رہے ہیں، جو اچھا لگے، وہ اٹھالو اور پہن کر چلے جاؤ۔''

''بھائی، کیوں مذاق کرر ہے ہو؟''

''ایسی حالت میں کوئی مذاق کیوں کرے گا؟ لے جاؤ اور پرسوں واپس کر لینا۔''

میں بوجھل قدموں سے شوکیس کی جانب چل پڑا اور وہاں ہینگروں پر ٹنگے ہوئے کوٹ دیکھنے لگا۔ایک سے بڑھ کر ایک چمکتے دمکتے ریشمی کوٹ تھے جن پر غضب کی پرنٹنگ ہوئی تھی۔میں کن انکھیوں سے ان کی قیمت دیکھتا رہا، کوئی تین ہزار سے کم کا نہ تھا۔غرض یہ کہ میرے ایک سال کی تنخواہ...! میرے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔آخرش ہمت کرکے ایک کوٹ اٹھالیا اور پہن کر دیکھا کہ فِٹ آرہا ہے یا نہیں۔پھر احتیاط سے ہینگر سمیت ہاتھ میں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا۔اس کے بعد اپنے شوروم میں پڑے ایک ٹرائی پوڈ میز، جس کی قیمت صرف اٹھارہ روپے تھی، کی پالش کروائی، ٹانگیں ٹاپ سے الگ کروائیں اور انھیں فولڈ کرکے دونوں کا ایک گفٹ پیک بنوالیا۔پھر کوٹ کو ایک بڑے سے لفافے میں ڈال کر گھر چلا گیا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ ایک اور پرابلم کھڑی ہوگئی اور وہ تھی جوتوں کی۔ میری عادت تھی کہ اپنے جوتوں کی کبھی پالش نہیں کرتا تھا جب تک وہ پھٹ نہ جاتے اوران کی جگہ پھر دوسرے جوتے آجاتے۔ ان پر نظر پڑی تو مایوس ہوگیا۔ دوایک جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بازار سے جوتے خرید لیتا تو کم سے کم ایک ڈیڑھ سوروپے کی چپت لگ جاتی۔ اس لیے ہاتھ میں اٹھا کر انھیں پاس ہی ایک موچی سے مرمت اور پالش کرواکے لے آیا۔ واپس آکر گھر پر شام کا بے صبری سے انتظار کرتا رہا۔

شام کے چھ بجے میں نے سامنے اسکوٹر اسٹینڈ سے آٹو رکشہ لے لیا اور ہاتھ میں ایک بڑا سا تحفہ لیے ماڈل ٹاون کی طرف چل پڑا۔ ابھی رکشے میں بیٹھنے کی دیر تھی کہ کہیں سے تر..تر...تر... کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ میں سہم گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ شاید آٹو رکشہ میں کہیں کوئی لوہے کی نوک باہر نکلی ہوگی جس میں میرا کوٹ پھنس گیا ہوگا۔ کیا کرتا....؟ آٹو رکشہ میں چیک کرنے کے لیے جگہ تو تھی نہیں۔ نیچے اتر کر دیکھتا تو پھر واپس بیٹھنا پڑتا اور شاید دوسری بار ایسا ہی واقعہ پیش آتا۔ اس لیے دل مسوس کر خاموش بیٹھا رہا۔ ہاں جہاں تک ممکن ہوسکا وہاں تک اپنا ہاتھ کوٹ پر پھیر لیا کہ کہیں کوئی سراغ مل جائے مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ دل دھک دھک کرر ہا تھا۔ نہ اگلتے بن رہی تھی اور نہ نگلتے۔ قریب ایک گھنٹے کے بعد میں ماڈل ٹاؤن پہنچا اور تحفہ ہاتھ میں اٹھا کر ریسیپشن ہال میں داخل ہوا۔

گیٹ کے پاس ہی نوتیج سنگھ ملا، میں نے تحفے کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا، وہ حیران رہ گیا کہ اتنا بڑا تحفہ؟ کہنے لگا۔ ''ویلکم دیپک، اس کی کیا ضرورت تھی۔'' پھر اس نے تحفے کو ایک سائیڈ میں رکھ دیا جہاں اور بھی بہت سارے قیمتی تحفوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں ایک بیرا مشروبات کی ٹرے اٹھا کر میرے پاس آیا اور میں نے بغیر دھیان دیے ایک گلاس اٹھالیا۔ ہال میں کئی اسٹال لگے ہوئے تھے جن پر مختلف قسم

کے شروعاتی پکوان مل رہے تھے اور پھر ایک جانب ڈِنر کا مین کورس سجایا گیا تھا۔ دور ایک کونے میں ایک غزل گائیکہ اپنی غزلوں سے ماحول کو دلفریب بنانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اکثر لوگ اسٹالز کے سامنے بھیڑ لگانے اور پکوان کھانے میں مشغول تھے، ان کو غزلوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں دل شکستہ اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا، چاہتا تھا کہ مین کورس کے سامنے لائن لگ جائے تو میں بھی لائن میں کھڑا ہو کر جلدی سے فارغ ہو جاؤں اور اس کے ترت بعد واپس گھر چلا جاؤں۔ دل میں طرح طرح کے ڈراونے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ اگر کوٹ کہیں بھی پھٹ گیا ہوگا تو میں یوگندر کو کون سا منہ دکھاؤں گا؟ پھر کوٹ کی قیمت کی بھرپائی کیسے کروں گا؟ اتنا سارا روپیہ تو میں دس سال بھی نہیں بچا پاؤں گا۔ انہی خیالوں میں گم میری نظر کھانے کی میز کی طرف اٹھی، وہاں لائن لگنی شروع ہو چکی تھی، سو میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لائن میں کھڑا ہو گیا اور اپنی پلیٹ بھر لی۔ گوشت خوروں کے لیے مٹن اور چکن کے کئی اقسام تھے جبکہ دوسری جانب صرف ویجیٹیرین لوگوں کے لیے پنیر اور کچھ سبزیاں رکھی گئیں تھیں۔ کھانا مجھے بالکل پھیکا سا لگ رہا تھا۔ نہ مزہ تھا اور نہ ہی ذائقہ۔ بقول شاعر؎

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

میرے دل میں جو بے چینی تھی وہ مجھے کچھ بھی انجوائے کرنے نہیں دے رہی تھی۔ خیر کچھ دیر کے بعد میں نے پلیٹ رکھ دی اور پھر میزبان سے رخصت لے کر گھر کی طرف آٹو رکشہ میں روانہ ہو گیا۔ اس بار تو میں نے بیٹھنے سے پہلے آٹو کی پوری طرح جانچ کر لی اور پھر کوٹ سمیٹ کر اندر بیٹھ گیا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ سانپ نکل گیا لکیر پیٹا کرو۔ مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آ رہی تھی۔ بہر کیف جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب تو کچھ بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔

گھر پہنچتے ہی جو کام میں نے سب سے پہلے کیا وہ تھا کوٹ اُتارنا اور اس کو ہر زاویے سے پرکھنا کہ کہیں پھٹ تو نہیں گیا ہے۔ مجھے تو مسکنے یا چاک ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تاہم پھر بھی دل میں وسوسہ برقرار رہا اور تب تک رہا جب تک میں دوسرے روز کوٹ لے کر یوگندر کے پاس نہ پہنچا۔ اس کو نم آنکھوں سے ساری بپتا سنائی اور اس کے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔

یوگندر زور سے ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ''دیپک، بس اتنی سی بات پر تم پریشان ہو۔ بھلا کون سا آسمان ٹوٹ جاتا اگر کوٹ پھٹ بھی جاتا؟ کوٹ کو واپس شوکیس میں لٹکا دو اور تم اس واہمے سے باہر نکل آؤ۔'' اس نے نہ تو کوٹ کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ کہاں پھٹ گیا ہے؟

شرمندگی سے میرا سرنگوں ہو رہا تھا۔ کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ شکریہ کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔ اس نے میری حالت دیکھ کر چائے منگوائی اور پھر ہم دونوں نے چائے نوش فرمائی۔ آخر کار میں نے خود کو سنبھالا اور یوگندر کو شکریہ کہہ کر واپس اپنے شوروم میں آ گیا۔ دل پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ کوٹ کہیں سے پھٹا نہ تھا۔ ''پھر وہ آواز کہاں سے آئی تھی؟ بالکل کپڑا پھٹنے کی آواز تھی۔ پینٹ میں کہیں کوئی چاک نظر نہیں آیا۔'' میں انہی سوچوں میں دن بھر الجھ کر رہ گیا۔

وہ دن اور آج کا دن! میں نے کبھی کسی سے کوئی چیز اُدھار نہیں مانگی، کپڑوں کی تو بات ہی نہیں۔ کم کھایا، کم پہنا مگر اپنی حد سے باہر جانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آج بھی سوچتا ہوں کہ اگر سچ مچ وہ کوٹ پھٹ گیا ہوتا تو میرا کیا حال ہوا ہوتا؟

☆......عطامحمد میر

کاٹھ کا دروازہ

اُن دِنوں شہراور دیہات کی اپنی الگ الگ پہچان تھی۔ نہ گاؤں نے شہر کے حدود میں گھُس کر اپنا فطری حُسن کھو دیا تھا؟ اور نہ شہر نے دیہات کی جانب پھیلنے کی حماقت کی تھی۔ یوں دونوں کا چہرہ سلامت تھا۔ دیہات بناؤ سنگھار سے کوسوں دور تھے اور شہر، بس شہر تھے۔ کھیتوں کی ایک خوبصورت حدِ فاصِل نے اُن کو ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا تھا۔ اُن کے بیچ کی مسافت کو پیدل طے کرتے ہوئے کوئی دیہاتی سڑک کنارے کسی جگہ چنار کے سایہ تلے کچھ دیر سُستانے کے بعد پھر منزل کی اور اطمینان و سکون کے ساتھ چلد یتا۔ ہوائیں بھی گرد آلودہ نہیں تھیں؟ کیونکہ راستوں کو ہریالی اور انواع واقسام کی روئیدگی اور پھول آور جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہر جگہ درختوں کا سایہ تھا اس وجہ سے سفر بھی باعث تکان نہ تھا۔ لوگوں کے پاس تھوڑے پیسے تھے۔ جب جیب بھاری نہ ہو تو اِنسان کہیں بھی بے فکر سو جاتا ہے، بے فکر اِنسان کی اپنی ایک الگ سلطنت ہوتی ہے۔ جب تجوری مال وزر سے بھری ہو تو اِنسان کبھی نہیں سوتا، وہ چوکیدار بن جاتا ہے، بے خوابی اُن کا مقدر بن جاتی ہے۔ لوگوں کے پاس تھوڑی کتابیں تھیں جن میں تحریر کئے ہوئے جُملے اپنے معنی و مفہوم میں کوزے میں سمندر بند کئے ہوئے تھے۔ دیواریں اُونچی نہیں تھیں، اُن میں سنگ وآہن کا استعمال زیادہ نہیں تھا۔ کہیں انگور کی بیل اور کہیں پھول بردار جھاڑیوں نے اُنہیں ڈھانپ کر رکھا تھا۔ لوگ مٹیالے رنگ کے تھے، بالکل گوشت و پوست والے اولادِ آدم۔ وہ اکثر کہتے تھے

کہ آدم آب و خاک سے گوندھی ہوئی ایک مخلوق ہے۔ اپنی اسی خمیر کی نسبت سے مٹی کے ظروف سلیقے سے اپنے گھروں کے اندر استعمال کرنے کے فن میں ماہر تھے۔ پاس ہی بستی میں کسی ٹیلے پر کوئی کُمہار اُنہیں اپنے گھومتے ہوئے چاک پر صبح سے شام تک گُنگُناتے ہوئے بناتا رہتا تھا۔ دھوپ میں بیٹھ کر ظروف فروخت کرتا تھا۔ اندر باہر ہر جگہ مٹی تھی، جو زرخیز بھی تھی اور خوشبودار بھی۔ لوگ مٹی کے برتنوں میں ہی کھانا کھاتے اور ساگ وسبزی بھی انہی میں رکھتے۔ پھر شُکر بھی کرتے تھے۔ ثمر بار راہ ورسم میں بندھے ہوئے ان لوگوں کے مکانوں کے اردگرد ثمر دار اشجار کی اُونچی دیواریں تھیں۔ صحن والے دروازے تو بس کاٹھ کے بنے ہوئے تھے۔ یہ اکثر بید اور سفیدے کے ڈنڈوں کو عموداً اور اُفقاً گھاس کی بنی ہوئی رسی سے باندھ کر بنائے جاتے تھے۔ یہ دروازے قفل و زنجیر سے نا آشنا تھے۔ دروازے کے جھروکوں سے نزدیک سے گزرنے والی گلی میں پیدل چلنے والا ہر شخص خوب پہچانا جاتا تھا۔ وہ بھی اپنی نظریں نیچے کرتا ہوا خراماں خراماں چلا جاتا تھا۔ ہمسایوں اور بستی والوں کے بچے ایسے شریر اور شرارتی نہیں تھے کہ کاٹھ کا دروازہ توڑ کر اندر آتے۔ وہ تنہائی اور نا آشنائی کے احساس سے اتنے دور تھے جتنی املی مٹھاس سے، اور آگ ٹھنڈک سے۔ وہ ایک دوسرے کے آنگن میں بِلا جھجک داخل ہو کر زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر نہ جانے گھنٹوں کیا کیا کھیل کھیلتے۔ بھوک کا وہاں نام ونشان نہ تھا کیونکہ وہاں ہر جانب درختوں کی ٹہنیاں ہر موسم میں پھلوں سے لدی ہوئی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی بچے دو تین اینٹوں کو جوڑ کر چولھا بناتے اور تھوڑی سی آگ جلا کر جھوٹ موٹ میں ہی کچھ پکاتے۔ اس طرح لگتا تھا کہ فطرت اور اُن کی جبلت اُنہیں کھیل کھیل میں گھر گرہستی اور سماجی رشتوں اور زندگی کے تانے بانے کا سبق پڑھا رہی ہے۔ گلی میں سے گزرنے والا مسافر بلا جھجک کاٹھ کا دروازہ آسانی سے کھول کر مسکنوں کے درمیان واقع مشترکہ صحن کے بیچ میں اُو کھلی سے

ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ خوردونوش کی چیزیں اُسے بن مانگے مل جاتیں تھیں۔ شکم سیر ہو کے چلا جاتا۔ بچے اُسے اور اُس کی پوٹلی کو پیار سے گھورتے رہتے۔ مسافر آسمان کی طرف دیکھ کر اُنہیں دعائیں دیتا ہوا اپنی راہ لیتا۔

میری ماں کاٹھ کا دروازہ بڑی آسانی سے کھول دیتی اور پاس پڑوس کی عورتوں کے یہاں دیر تک بے تکلف باتیں کرتیں۔ گھنٹوں بعد خوش وخرم اور ہشاش بشاش واپس لوٹتی۔ کبھی انگور کا گچھا، انار کے عوض لے آتیں، کبھی ستو کے عوض کھیرا اور کدو۔ اس طرح سب بچے وہاں مکئی، اخروٹ، سیب اور بادام خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ وہاں دعائیں بھی قریب تھیں اور مُسکراہٹیں بھی اور پھل پھول بھی، کیونکہ بیچ میں بس تھا تو ایک کاٹھ کا دروازہ۔ ہر مینڈ، ہر شخص کی مینڈ تھی۔

پھر پتہ نہیں گرم وخشک میدانوں اور بے آب وگیاہ پہاڑوں کی ہوائیں کیسے اور کس طرح ان معصوم اور مٹیالی رنگ والی بستیوں میں داخل ہوئیں اور چکر باد کا روپ دھار لیا۔ شہر نے گاؤں میں اور گاؤں نے شہر کے اندر بے جا مداخلت شروع کی۔ اس دھکم پیل میں کھیتوں کی حد فاصل معدوم ہوئی اور ہریالی بھی نابود ہوئی۔ مسافتیں سُکڑ گئیں اور ہوائیں خاک آلودہ ہوگئیں۔ لوگوں کے ہاتھ کھر دُرے ہوگئے بالکل زنگ آلودہ لوہے کی طرح۔ صحیح معنوں میں لوہا اپنی اصل خصلت کے ساتھ اب اُن کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس کی ایک ہی ضرب سے ہاتھی کی بھی موت ہوجاتی تھی۔ شیر بھی اس لوہے کو دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔ لوہا بھی کیا بلا ہے یہ اپنا لوہا منواتا ہے۔ کاٹھ کا دروازہ تو اس لوہے کی سلاخ کے سامنے کاہ جیسا تھا۔ گرم ہواؤں، لوہے کی گن گرج اور دھکم پیل نے مکینوں کو اپنے مکانوں کے اردگرد کی دیواروں کو اُونچا اور پختہ کرنے کا سبق پڑھایا۔ دل ودماغ اور سوچ وفکر میں لوہے کی بُو سما گئی۔ لوہے نے لوہے کے بنے ہوئے سکوں سے اُن کی جیب بھر دی۔ بسیار خوری توند کی شکل میں ظاہر ہونے لگی۔

لوگ مٹیالے نہ رہے، تانبا جیسے ہوگئے ، بے مُروت اور طوطا چشم۔ دروازہ بھی اب لوہے کا ہونا چاہئے تا کہ لوہے والے اندر بے دھڑک داخل نہ ہوں کیونکہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔لوہا لوہے کے ٹکر کا ہے۔ میں نے بھی ایک دن دیکھا دیکھی میں کاٹھ کا دروازہ اُکھیڑ دیا۔خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میرا چہرا گُلنار رہوا جب آہنی دروازے، اُونچی پختہ دیوار اور اپنے مضبوط بازوؤں کو میں نے فخر سے دیکھا۔ میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔اب میں مٹیالے ماحول سے بالکل بھاگ کر آہنی حصار والی بستی میں آ گیا تھا۔اس سفر کے دوران مجھے ماں کے ہاتھوں کی جھُریوں اور اُس کے مضمحل ہوتے ہوئے قویٰ کو دیکھنے کا خیال بھی نہ رہا۔ اُس کے چہرے پر اُبھرنے والی بڑھاپے کی سلوٹوں ، ڈھلتی عمر کی شکنوں اور کج قدمی کی جانب میرا دھیان ہی نہ رہا۔ وقت بڑا بے رحم ہے، وقت اندھا کر دیتا ہے۔ یہ چپکے چپکے اور دھیرے دھیرے ہمیں چوس لیتا ہے۔ یہ کسی کی ماں پر بھی رحم نہیں کھاتا۔ یہ ہمارے جذبات کو بھی گاجر مولی کی طرح چباتا ہے۔شاید میں بھی وقت جیسا بے مروت تھا جو یہ سمجھا ہی نہیں کہ وزنی آہنی دروازہ کھولنے میں میری ماں کے ضعیف و کمزور ہاتھوں کو بہت مشقت کرنا پڑتی ہے۔ رفتہ رفتہ آہنی دروازہ کھولنا اُس کے بس سے باہر ہوگیا۔ وہ اب گھر میں قید ہوکر رہ گئی، مایوس اور مضمحل قیدی کی طرح رہنے لگی۔اب کوئی خدا کے نام پر بھیک مانگنے والا بھی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ یوں میرے گھر کا آنگن دعاؤں سے بھی محروم ہوا۔ گنگناہٹ بھی پتہ نہیں کہاں در ماندہ ہوئی اور گپ شپ بھی نہ جانے کس قریہ کی طرف کوچ کر گئی۔ پُراسرار خاموشی نے اندر باہر ڈھیرا ڈالا۔ ہمسائیوں کے بچے اپنی اپنی دیواروں کے سایہ میں ہی سانس لیتے ہوئے بالغ ہوئے۔نزدیک ہونے کے باوجود شناسائی اُنہیں چھوکر بھی نہ گذری، جب مشترکہ صحن ہی نہ رہا تو زمین پر لکیریں کون کھینچتا اور کون کس سے کھیلتا۔میل جول کا اصل سبق کہاں سے سیکھتا۔اب بستی کے بچے بستی کی گلی

میں ایک دوسرے کو دیکھتے نہیں تھے، بلکہ ایسے گھورتے تھے جیسے کہ اُنہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ تنہائی نے اُنہیں شریر بنا دیا۔ منہ پھٹ بھی، تندخو بھی، بے اعتنا بھی۔

میری ماں بس حسرت و یاس اور خاموشی سے آہنی دروازے کو دیکھتی رہتی۔ یہ شاید اُس کی کمزور قویٰ، مٹیالے ماضی کے راہ و رسم اور سماجی میل جول کا جیسے ایک کھلا مذاق تھا۔ میں اپنے زورِ بازو کے زعم میں کبھی کبھی ماں کو ٹوکتا کہ اب تو ایسے ہی دروازوں کی ضرورت ہے کیونکہ یہ وقت اور ہواؤں اور ماحول کے مزاج کے عین مطابق ہے، اور اگر ہم ایسا دروازہ نہیں بنائیں گے تو پیچھے رہ جائینگے اور پیچھے رہنے والے اِس شہر میں کُچلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی اندر ہی اندر شاید لوہے کے دروازے کی بے مُروتی، کٹھور پن اور اپنے ضعیف ہاتھوں کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہی ہوتی۔ کچھ بھی نہیں کہتی بس میری آنکھوں میں جھانکتی رہتی، جن کو ہواؤں نے اُسی طرح گرد آلودہ کیا تھا جس طرح برستی بارش نے لوہے کے دروازے کو زنگ آلودہ کر دیا تھا۔

پھر منظر بدل گیا۔ نئی خوفناک، کالی کلوٹی، تُند مزاج اور بے مُروت ہواؤں نے مکانوں کو ایسے گھیر لیا جیسے کوئی سمندری چکر باد ہو۔ یہ اور ہی قسم کی مسموم ہوا تھی جس کے تھپیڑوں کے سامنے آہنی دروازے بھی بے بس اور ناکارہ دِکھنے لگے۔ لوگوں کا ان پر اعتبار ہی نہ رہا۔ مکینوں کی آنکھیں اب کانچ، ربڑ اور پلاسٹک سے مانوس ہونی شروع ہوئیں۔ ڈھلتی عمر کے باعث میری آنکھوں کی چمک بھی مدھم ہو رہی تھی۔ راستوں نے مجھے تھکا دیا تھا اور ایک دن تھک ہار کر اپنے ہاتھوں پر اُبھرنے والی بڑھاپے کی علامت جُھریوں کو حسرت سے اُسی طرح دیکھنے لگا جس طرح میری ماں لوہے کے دروازے کو دیکھتی تھی۔ وقت کے پاس کتنا زنگ ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وقت پیاسا ہے، یہ ہر رنگ پی جاتا ہے اور زنگ اُگل دیتا ہے۔

پھر ایک دن میرے بچوں نے آ ہنی دروازے کو اُسی طرح اُ کھاڑ پھینکا جس طرح میں نے کبھی کاٹھ کا دروازہ اُ کھاڑ پھینکا تھا۔ اب وہاں نیا دروازہ نصب ہوا۔ ہلکا پھُلکا اور رنگین ۔نظروں کو خیرہ کرنے والا یہ دروازہ ہندسوں کی مدد سے کھُلتا تھا۔ اُس کی اپنی ایک الگ چابی تھی ۔ چابی کی بھی ایک الگ نکتوں والی مخصوص زبان تھی۔ اُس زبان کے گرائمر سے صرف میرے بچے واقف تھے۔ صرف ونحو سے عاری یہ زبان سمجھنا میرے کمزور ذہن کے لئے اُتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی ضعیف العمر شخص کیلئے لوہے کا بھاری بھرکم دروازہ کھولنا۔

ریموٹ کنٹرول کے بے حس، بے مُروت اور مبہوت ہندسے میری عقل اور احساس مُروت کا جیسے مذاق اُڑا رہے تھے۔ میں نے خود کو ایسا قیدی محسوس کیا جس کو جیسے قید میں کُچلا گیا ہو۔ ہندسوں کو اگرچہ میں بالکل پہچان سکتا تھا کہ میں نے اُنہیں اپنے بچپن میں پہاڑہ کا گردان کرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ مجھے ازبر یاد بھی تھے۔ مگر یہ ہندسے کسی اور ہی خمیر سے بنائے گئے تھے۔ نہ مرئی اور نہ غیر مرئی۔ نہ ٹھوس اور نہ مایہ۔ یہ نئے ہندسے شریر بچوں جیسے تھے جو سب کو تو دیکھتے ہیں مگر کسی کو پہچانتے نہیں۔

راستوں پر رُکاوٹوں کے باعث ایک شام میں گھر ذرا دیر سے پہنچا۔ مکان کا باہری دروازہ بند تھا۔ ہندسوں کی مدد سے کُھلنے والے دروازے کے پاس بہت دیر تک بے بس کھڑا رہ کر اُسے اندر ہی اندر نفرت سے دیکھنے لگا۔ میری مثال اُس شخص کی سی ہوئی جس کو آشیانہ بنانے کی پاداش میں سرِشام آشیانے سے ہی بیدخل کیا گیا ہو۔ میں تھا اور ساکت طوطا چشم دروازہ۔ میں نے چاہا کہ دروازہ کو اکھیڑ دوں اور بے دھڑک اندر داخل ہو جاؤں، مگر میرے بچوں نے مجھے جھٹک کر کہا کہ ''یہ دروازہ ہواؤں، موسموں اور اوقات کے عین مطابق ہے۔ اگر ہم ایسا دروازہ یہاں نہ لگائیں گے تو پیچھے رہ جائینگے اور پیچھے رہنے والے اس شہر میں کُچلے جاتے ہیں'' میں بس اُن کی

آنکھوں میں خاموش جھانکتا رہا۔جن میں وقت نے کوئی اور ہی رنگ انڈیل دیا تھا۔ میں اندر ہی اندر ریموٹ کنٹرول والے دروازے کے بارے میں وہی کچھ سوچتا رہا جو شاید میری ماں اُن دِنوں لوہے کے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر سوچا کرتی تھی۔

☆......عطامحمد میر

دُم چھلا

ایک فطرت شناس مفکر چارلس ڈارون کا کہنا ہے کہ ''انسان اپنی نشو نما یا ارتقا کے اولین ادوار میں بندر اور بن مانس جیسا ہی دُم دار حیوان تھا۔ پھر اُس نے دو زانو بیٹھنا سیکھا۔ ذرا متمدن ہوا اور سلیقہ مندی کی طرف گامزن ہوا۔ کسی ایجاد کے باعث اور اُس پر بیٹھنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُس کی دُم گِھس گئی اور بالآخر معدوم ہوئی۔ دُم شاید اضافی عضوِ بدن اور کام کی چیز نہیں تھی، زندگی کے کسی مقام پر کھو گئی۔ کھونے کا احساس بھی نہ ہوا کیونکہ منہ میں زبان جو تھی۔ وہ حرف وصوت سے واقف ہوئی اور اس بے دُم حیوان نے فر فر بولنا سیکھا''۔

کیا واقعی یہی آج کے انسان کی اولین کہانی ہے، مجھے اس سے نہ اتفاق ہے اور نہ اختلاف، مگر مفکر کے مطابق جس جانور کی دم سلیقہ سے بیٹھتے بیٹھتے گِھس کر اُس سے جدا ہو گئی، اس کو ہم آج ایک خوبصورت، عقل منداور تیز گام مخلوق کی شکل میں قریہ قریہ اور شہر شہر دیکھتے ہیں۔ اگر چہ اُن کے آس پاس دُم دار چوپائے آج بھی ہر جگہ گھاس چرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں انہیں بس دیکھتا رہتا ہوں۔ اُن کی دُم مجھے اکثر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیا خوبصورت چیز تھی جو ہم نے یوں ہی گنوادی۔ مجھے اُن پر نہ صرف رشک آتا ہے بلکہ بعض دفعہ اُنہیں چومنا بھی چاہتا ہوں۔ کیا وہ میری کھوئی ہوئی دُم کے امین ہیں، میں نہیں جانتا، مگر وہ گنگ ہیں اور کیا ہی خوبصورت ہیں۔ زبان کے اُلٹ پھیر سے ناواقف ہیں، یا یوں سمجھو کہ وہ زبان دراز نہیں۔

حالانکہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ دُم دار تو ہیں مگر دُم چھلے نہیں۔ اپنی دُم ہلا کر وہ کبھی کبھی اس کی ضرب سے اُن مکھیوں کو بھگاتی ہیں جو اُن کے جسم پر اُن طفیلی کیڑوں کی طرح بیٹھتی ہیں جو اُن کا لہو چوستے ہیں۔ وہ نہ بادشاہ ہیں، نہ وزیر، نہ چاپلوس، نہ خود فریبی، نہ کاسہ بردار، نہ خود ستا اور نہ دوغلے۔ پتہ نہیں وہ کس قسم کی رعایا ہے۔ وہ ہر قانون، ہر رنگ اور ہر حال کو من وعن قبول کرتے ہیں، اگر چہ اس دوران یک رُخی اشاروں اور کچھ مخصوص حرکات وسکنات سے اپنی وفاداری، سلیقہ مندی اور پسند وناپسند کا بھی ہلکا سا خاموش اظہار کرتے ہیں۔ یہ اُن کا ازلی رویہ ہے، بناوٹی نہیں۔ اضافی تو ہرگز نہیں، کیونکہ اُن کے پاس اب بھی دُم موجود ہے۔ مجھے اُس دن سے ڈر لگتا ہے جس دن وہ ٹیک لگا کر بیٹھیں گے اور دُم سے محروم ہوں گے۔ یہ اس لئے بھی کہ وہ پھر ایسے نہیں رہیں گے۔ دوغلے پن کا شکار ہو جائیں گے۔ اُن میں سے بعض دُم چھلے بن جائیں گے اور بعض طفیلی چاپلوس کیڑے۔ اس لئے مجھے اُن کی دُم جو کتنی ہی ٹیڑھی میڑھی کیوں نہ ہو، بڑی اچھی لگتی ہے۔ یہ اُن کے لئے ایک بڑا المیہ ہوگا اگر وہ کبھی اس سے محروم ہو جائیں گے۔ کتے کو کھلاؤ، پلاؤ تو وہ وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے اپنی دُم ہلاتا ہے۔ مالک کے سامنے اپنے کمر کو ذرا خمیدہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ چاپلوسی نہیں، یہ سچی وفاداری ہوتی ہے۔ ایک دَم یک رُخی۔ اس میں دکھاوا نہیں، تصنع نہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اُس کے پاس دُم ہے، وہ ایک دُم چھلا نہیں اور یہ کہ وہ فرفر نہیں بولتا ہے۔ وہ بس بھونکتا ہے اور صدیوں سے اُس کے بھونکنے کا ترنم ذرا بھی تبدیل نہ ہوا۔ سانپ ایک رینگتا ہوا جانور ہے۔ گائے بس ایک چوپایہ۔ گدھا بار بردار جانور ہے۔ گھوڑا سوار بردار حیوان۔ اُنہوں نے آج تک کچھ نہیں کھویا ہے اور نہ اس سے کچھ زیادہ پایا ہے۔ فطرت نے اُن پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُنہیں اپنی دُم سے محروم نہ کیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے وہ کس کس قسم کے خوفناک دُم چھلے بن چکے ہوتے۔ اُن کو کوئی

پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ اُن کے منہ میں گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں گنگ زبان الفاظ و معنی سے آشنا ہو کر نہ جانے کیا کیا گُل کھلاتی۔ پتہ نہیں زبان درازی اور دُم ہلانے کے عمل نے اُنہیں کس کس مخلوق میں تبدیل کیا ہوتا۔ کدو، بینگن، ٹماٹر، آلو، گھاس، رات، دن، اُلو، کبوتر، رنگ، پانی اور روشنی، دُم دار چوپائیوں کے لئے آج بھی وہی ہیں جو وہ اولین ادوار میں تھے۔ مگر دُم چھلوں یا یوں کہو شعوری چاپلوسوں کے لئے اُن کا رنگ و آہنگ، خدوخال اور کمیت و کیفیت وقت کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔

اگلے وقتوں میں بادشاہوں کے یہاں وزیر ہوا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سلیقے سے بیٹھنا اور بولنا سیکھا تھا۔ الفاظ و معنی کی دُم کاٹنے میں سند یافتہ تھے، اس وجہ سے ایک تو اُن کی دُم بالکل معدوم ہو گئی تھی، دوسرے یہ کہ زبان ذرا زیادہ پتلی ہو گئی تھی۔ بادشاہ عقل میں بندر اور بن مانس کی طرح دُم دار ہوتے تھے اور وزیر آج کے انسان کی طرح بے دُم مخلوق۔ اُلو تو اُلو ہے، دن کی روشنی میں اُڑنا اور پر پھڑ پھڑانا اُس کی فطرت نہیں۔ اندھیرا اُسے پسند ہے۔ اُس کی اپنی ایک شکل و صورت ہے جو بس خوب ہے۔ ایک بادشاہ کو وہ پسند تھے۔ بس اُس کے دُم چھلے وزیروں نے اُلو کو رات کا شہباز پرندہ قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ اُلو بڑا دور اندیش، درویش صفت اور پارسا پرندہ ہے، کم خور ہے، شرم کا مارا ہے، تنہا پسند ہے اور بے ضرر ہے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ شاہین کا سگا بھائی ہے۔ رات کے اندھیرے میں اُس سے ملاقات کے لئے چٹانوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اس طرح یہ فلکیاتی طائروں کے ایک خاندان کا فرد ہے۔ یہ اُس شخص کی اعلیٰ ظرفی ہے جو اُنہیں پسند کرتا ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر خوش ہوا اور یوں بادشاہ نے اُلو کو قومی پرندہ قرار دیا، پھر کیا تھا کہ بعض وزیروں نے اپنے بیٹوں کے لئے اُلو کا لقب پسند کیا، یوں دربار میں رسائی حاصل کی اور عہدہ دار ہوئے۔ دُم چھلوں نے ہاتھ صاف کئے اور شکم سیر ہوئے اور من پسند ایام گزارے۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا

ہوا کہ بادشاہ نے شیخ سعدی کی کوئی حکایت سُنی جس میں الُو کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ یہ ویران پسند پرندہ ہے اور خستہ مکانوں میں اس کا بسیرا ہوتا ہے۔ وزیروں نے فوراً بادشاہ کی پسند کے مطابق اُلو کو منحوس، تاریکی پسند اور لٹیرا پرندہ قرار دیا۔ ایک دُم چھلے نے کہا کہ اُلو خون پسند پرندہ ہے جو رات کو راہ بھٹکے طائر کی تکا بوٹی کرتا ہے۔ اس کی آواز شکست کی علامت ہے۔

چنگیز خان ایک سفاک اور جنگجو حکمران تھا۔ وہ قتل و غارت کا بڑا رسیا اور شیدائی تھا مگر وہ چیلوں سے بہت ڈرتا تھا کہ اُس کے وزیر تمن خان نے اُسے یوں ہی ایک دن کہا تھا کہ چیل موقع پرست پرندہ ہے اور شکار کی چیر پھاڑ میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ جھپٹا مارنے میں ماہر ہے۔ یہ انسانی گوشت بھی کھاتی ہے۔ آسمان میں اُس کی اُڑان بدشگونی کا مظہر ہوتی ہے، جو راج پاٹ کیلئے اچھی نہیں ہوتی۔ بس آخر دم تک چنگیز خان اُنہیں نفرت سے دیکھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں دیکھتے ہی مارنے کا حکم بھی دیا تھا۔ جب اُس کا بیٹا ہلاکو خان گدی پر بیٹھا تو چیلوں کے بارے میں اُس کا خیال بالکل بدل گیا، کیونکہ اُس نے اُنہیں بچپن سے ہی بس ایسے ہی دیکھا تھا۔ تمن خان جیسے دُم چھلے وزیروں نے چیل کی تعریف میں قصیدے پڑھے اور کہا کہ یہ تو بڑا بے ضرر اور عام سا پرندہ ہے جو کچھ وہ کھاتا ہے، جس کو وہ اگر نہ کھائے تو ملک میں بدبو پیدا ہوگی۔ اُن کے دور میں پھر چیل کے ساتھ ساتھ اُن کے قریبی رشتہ دار پرندے یعنی گِدھ، کوّے سرکار کی سرپرستی میں فربہ ہوئے۔

دریا کے اُس پار کئی مزدور مٹی کوٹ رہے تھے، شاید وہ کمہار تھے۔ چاک بنانے کے لئے مٹی گوندھ رہے تھے۔ ادھر دریا کے اس پار ایک دُم چھلا یا یوں سمجھو بے دُم چاپلوس حواری اپنے حاکم، جو گھوڑے پر سوار دریا کنارے سیر کر کے ہوا خوری کر رہا تھا، کپڑے جھاڑنے لگا۔ ''دیکھو کتنی گرد وہاں سے اُڑ کر یہاں آ رہی ہے اور

آپ کے کپڑے گندے کررہی ہے۔'' وہ وفاداری کے لہجے میں کہتا رہا، حالانکہ وہاں گرد کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اگر دریا بیچ میں نہ ہوتا تو حاکم حواری کے کہنے پر مزدوروں کا دانا پانی تک اس جُرم میں بند کروادیتا کہ وہ دریا کے اُس پار مٹی کوٹ کر اِس پار اس کے کپڑے گرد آلودہ کررہے تھے۔

پتہ نہیں کس بادشاہ کو کس بنیاد پر کدو سے نفرت ہوئی۔ دُم چھلے اُس کی پسند و ناپسند کی تاک میں تھے۔ اُنہوں نے ایک دم کدو کی تنقید و تضحیک میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ کسی نے کہا کہ کدو گول سڈول اور بے ڈھول شکل کی ترکاری ہونے کے باعث اس کے کھانے والے بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ کسی نے اس کو سانپ کی شبیہہ قرار دیا۔ ایک اور دُم چھلے نے کہا کہ اس کا بیج بھی ضرر رساں ہے، جو اس کو کھاتا ہے نسیاں کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ خوش ہوا، اُن کے منہ میں شکر ڈالنے کا حکم صادر کیا۔ پھر کیا تھا کہ ایک دُم چھلے نے زیادہ شکر کھانے کی دوڑ میں کدو کو نفرت انگیز ترکاری قرار دینے کیلئے ایک ضخیم کتاب ترتیب دینے کے لئے شاہی خزانے سے اپنے لئے ماہانہ مشاہرہ بھی مقرر کروایا۔ بعد میں سرکاری مورخ قرار پایا اور Poet laureate بھی۔

ہمسایہ ملک کے بادشاہ کو بینگن سے نفرت کیا ہوئی کہ اُس کے دم چھلوں نے دنیا کی ساری نفرتیں اور بُرائیاں بینگن کے نام کر دیں۔ ایک چرب زبان نے اس کو بیماریوں کی ماں قرار دیا۔ دوسرے نے کہا کہ حُکما کے مطابق وہ شخص اُسی رات کیوں نہ مر گیا جو دن کے وقت بینگن کے پودے کے پاس سے گزرا۔ ایک اور بینگن قد دُم چھلے نے بادشاہ کو اور زیادہ خوش کرنے کے لئے کہا کہ بادشاہ سلامت جو دن کے وقت بینگن دیکھتا ہے وہ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے۔ پس بادشاہ نے رعایا کو ڈراؤ نے خوابوں سے نجات دلانے کے لئے بینگن کی کاشت پر پابندی عائد کی اور اُن پر اپنا

احسان جتلایا۔ ایک مدت کے بعد مُلک کی شہزادی کو بینگن کھانے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اُس کی حرم سرا سہیلی نے اُس سے کہا کہ بینگن کھانے سے عقلمند بچے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ بینگن خود بینگنی سفید، زرد، لاجوری، ہلکے گلابی رنگ کے ہوتے ہیں۔ بس دُم چھلوں نے بینگن کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ کسی نے کہا کہ یہ پست قد پودے کی ترکاری ہے اور پست قد ہونا ہی عقل کی نشانی ہے۔ اتفاق سے بادشاہ بھی پست قامت ہی تھا، لہٰذا دُم چھلے اور زیادہ انعام واکرام سے نوازے گئے۔ کچھ طویل قد کے دُم چھلے وزیروں کو اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگی۔ وہ بھی دربار میں آتے تو جھکے جھکے چلتے تاکہ بینگن جیسے نظر آئیں۔ ایسے میں وہاں ایک بندر اور بن مانس نُما شخص بھی تھا، جس نے ابھی سلیقے سے بیٹھنا بھی سیکھا نہ تھا اور اس کی دُم ابھی تھوڑی باقی تھی۔ اس لئے وہ سرکار کی نوکری کا بھی ابھی حق دار نہ تھا۔ اُس نے ان دُم چھلوں سے پوچھا کہ آپ کبھی کدو و بینگن کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی ان کی تنقید و تضحیک۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم بینگن اور کدو کے ووٹ سے وزیر نہیں بنے بلکہ بینگن و کدو کو پسند اور ناپسند کرنے والے بادشاہ نے ہمیں یہ خلعت عطا کی ہے اور جب آپ کی دُم کٹ جائے گی اور دُم چھلے ہو جائیں گے تو آپ کو بھی بینگن و کدو وقت وقت پر ایسے ہی نظر آئیں گے۔

پنیر کا ٹکڑا سفید رنگ کا ہوتا ہے اور کوا کالے رنگ کا، مگر دُم چھلوں کے پاس ایسے بے شمار بے رنگ الفاظ ہوتے ہیں جس کے ذریعے وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ رنگ میں رنگ دینے کی مہارت رکھتے ہیں، بالکل اُس لومڑی کی طرح جس نے پنیر کا وہ ٹکڑا کھانا چاہا جو کالے رنگ کے کوے کے چونچ میں تھا۔ لومڑی نے کوے کو چمکیلا پرندہ کہہ کر پکارا۔ اُسے دنیا کا خوش الحان طائر کہا۔ کوا خوش ہوا، مُسکرایا اور پنیر کا ٹکڑا زمین پر گر گیا، جس کو لومڑی صفا چٹ کر کے چلی گئی۔ لومڑیاں کبھی کبھار ہی نظر آتی

ہیں مگر دوبارہ صفت دُم چھلے ہرنکڑ پر موجود رہتے ہیں۔ یہ دنیا کا بھیانک ترین طفیلی کیڑا ہے۔

کسی کتے کے دُم ہلانے سے دُنیا میں آج تک کوئی فتنہ وفساد بپا نہ ہوا اور نہ ہی کسی چوپایہ کی زبان تنازعات کی باعث بنی، جب کہ خون آشام تنازعات دُم چھلوں کی دین ہیں۔ مجھے کئی بار کُتا یاد آتا ہے۔ بے چارہ بس روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے اپنی دُم ہلاتا ہے۔ میں اکثر آسمان کی طرف ہزار ہا سال تک کُتے کی اس بے ضرر دُم کی سلامتی کے لئے دیکھتا ہوں۔ میں پاگل کتوں سے کبھی نہیں ڈرا بلکہ بے دُم کے دُم چھلوں سے بہت خوف کھاتا ہوں۔

چاپلوسی کے جملہ حقوق ہمیشہ کیلئے اپنے خاندان کے نام کرنے کی کوشش میں مُغل درباروں میں کام کرنے والے کئی غیر مُغل نسل کے وزیروں نے کُہساروں میں رہنی والی حسین لڑکیوں سے شادیاں کی، جب اُن کے یہاں خوبصورت بچے پیدا ہوں گے تو مُغل نسل کے بچے جیسے نظر آئیں گے، اور یوں وزیر بننے کے اہل قرار پائیں گے، اور چاپلوسی کا رزق کھا کر اور زیادہ فربہ ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ جارج برناڈ شا شکل وصورت میں قدرے کالے تھے۔ ایک خوبصورت چاپلوس انگریز لڑکی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز پیش کی کہ اس طرح جو بچہ پیدا ہوگا وہ جارج برناڈ شا کی طرح ذہین اور خود اس لڑکی کی طرح حسین بھی ہوگا، اور یہ ایک اچھا تجربہ ہوگا مگر جارج برناڈ شا نے کہا کہ اگر وہ بچہ میری طرح کالا اور تیری طرح بے وقوف پیدا ہوا، تو دنیا میں اُس کا کیا حال ہوگا۔ اس انجام سے دنیا کے تمام چاپلوس آج بھی اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

☆......عطا محمد میر

شہرِ ناپُرساں

تاریخ لکھنے والوں نے لکھا کہ'' وہ سبزی فروشوں، ماہی گیروں، مزدوروں اور کاشت کاروں کی بستی تھی۔ مشرق کی جانب سے شجر دار اور برف پوش پہاڑ اُن پر سایہ افگن تھے۔ مغرب کی جانب بھی کچھ سنگستانی ٹیلے تھے جن کو وہ'' پیر پہاڑ'' کے نام سے جانتے تھے۔ ان ٹیلوں کے کُھر درے دامن میں کچھ گُل فروش بھی رہا کرتے تھے۔ جھیل کنارے وہاں چوب فروشوں، شالبافوں اور نمدہ فروشوں کے بھی مسکن تھے۔ صبح شام کے وقت دودھ فروشوں، نانبائیوں اور شاخسازوں کی دکانات وہاں کے مکینوں کے لئے گپ شپ کی پسندیدہ جگہیں تھیں۔ وہ موسم گزیدہ تھے، اس لئے وہ اس کے بارے میں بہت زیادہ باتیں کیا کرتے تھے۔

اُن کی بستی کا سُست رو دریا اُن کی مانند تھا۔ اُس کے کنارے پاؤں پسارے بیٹھ کر وہ دن بھر کی مصروفیتوں، خبروں اور روزمرہ کے راہ و رسم کی باتوں کی کھال اُتارنے میں ایک گونہ مسرت پاتے۔ ان کی باتوں سے ایک دوسرے کی سمع خراشی بھی ہوتی، مگر غصہ بھی بہت جلد پانی کی طرح پی جاتے۔ وہ بڑے جذباتی تھے۔ پدرم سلطان بود کے زعم میں بڑی ڈینگیں مارتے تھے۔ وہ من موجی بھی تھے۔ خود فریبی کا شکار وہ لوگ باتوں باتوں میں پہاڑ کو رائی بناتے اور رائی کو پہاڑ۔ اپنی اس طرح کی ترنگ میں رات کو میٹھی نیند سو جاتے اور خوابوں اور خیالوں میں کھو جاتے۔ صبح سویرے جاگ اُٹھتے اور رات کے خوابوں کی تعبیر کے بارے میں نانبائی کی دکان پر چٹخارے

لے لے کر اُس وقت تک سرد و گرم باتیں کرتے رہتے جب تک کہ سورج پاس والے ٹیلے کے عقب سے طلوع نہیں ہو جاتا۔ وہ خوابوں کے رسیا تھے، مگر خوابوں کی تعبیر سے اُنہیں بڑا ڈر لگتا تھا۔ اس لئے وہ معبر کے پاس جانے سے پہلے کُتوں کو دو چار روٹیاں کھلاتے کہ یہ دافع البلیات عمل ہے۔ معبر بھی سینکڑوں روپیوں کے عوض اُنہیں من چاہی تعبیر بتاتا۔ وہ کچھ لوگوں کے لئے ہر حال میں معصوم لوگ تھے۔ اتنے معصوم کہ بید کے درخت سے وہ ناشپاتی پانا چاہتے تھے اور سفیدے کے درخت سے سایہ۔ انہیں اپنی مہمان نوازی پر بڑا ناز تھا۔ مہمان پروری میں بھی وہ دل کے غنی تھے کہ بہت دفعہ اُنہوں نے اپنے گھروں کی کنجیاں گرم علاقوں سے آئے ہوئے تفریح پسندوں کے حوالہ کیں۔ اسی طرح ایک مہمان کو بے دخل کرنے کے لئے دوسرے مہمان کو گھر بلاتے۔ جب کچھ نہ کر پاتے تو جھنجھلاہٹ میں اپنے روز و شب کو کوستے۔ پھبتیاں کسنا اُن کی فطرت میں تھا۔ پھبتیوں کی ایک پوری لُغت اُن کے پاس تھی۔ وہ دل جلے اور کیا کرتے، کسی حال میں خوش نہ تھے، حالانکہ قہقہوں کا وہاں شمار نہ تھا، مگر رونی صورت میں وہ یکتا تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ وہ بری نظر والا کون تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ بس آہ بھر کر تھوڑی دیر خاموش ہو جاتے۔ کوئی ان دیکھی قوت اُن کے لئے باعثِ مصیبت تھی۔ کسی ان دیکھے نجات دہندہ کے انتظار میں وہ روز و شب شُمار کرتے تھے۔ وہ نجات دہندہ کس ملک میں رہتا ہے اور کہاں سے آئے گا اُنہیں معلوم نہ تھا۔ ایک دن وہ چنار کے دشمن ہوئے اور چنار کو گرانے کے لئے ایک جم غفیر یک سوئی کے ساتھ اُس طرف چل دیا۔ چنار کے کچھ پتے کاٹ کر شور وغُل کرتے ہوئے واپس آئے۔ اس طرح وہ چل دیتے، پھر رُک جاتے، دل گھبراتا، پھر چل دیتے، وہ راستے کو کوستے، کبھی منزل کو۔'' مورخ کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے اُس بستی کو دیکھنے کا شوق چرایا۔ اشتیاق دید نے مجھے اُس جانب ایک لمبی تھکن بھری مسافت

طے کرنے کی ترغیب دی۔ بالآخر ایک دوپہر کو میں اُس بستی کی سرحد پر پہنچا، وہاں ایک سرسبز ٹیلہ تھا، جہاں ایک عمر رسیدہ شخص چنار کے درخت سے ٹیک لگائے جیسے میرے ہی آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ زیرِ لب ایسے مسکرایا جیسے وہ کسی ان جانے بوجھ سے ہلکان ہو رہا ہو۔ اُس کے ماتھے کی سلوٹوں، آنکھ کے ڈھیلے پپوٹوں، لمبی داڑھی اور جھریوں والے رخسار پر اُس کی عمر، متانت اور جہاں دیدگی کی تحریر اُسی طرح عیاں تھی جس طرح مورخ کی تحریر۔ وہ میرا مقصد سفر جان چکا تھا۔ میں کافی تھک چکا تھا، وہیں زمین پر بیٹھ کر اُس کی باتوں کو غور سے سننے لگا۔ اُس نے کہا کہ ''وہ لالہ وگُل کی زمین اب بینگن اور کدو کا شہر کہلاتی ہے۔ دُھوپ چھاؤں میں بینگن، کدو، گاجر، مولی و شلغم کے گیت گاتے گاتے وہاں کے مکین یہی سب ہو گئے ہیں۔ رنگ رنگ کی ترکاریوں کی طرح کوئی سبز ہے، کوئی سفید ہے، کوئی لاجوری اور کوئی زرد۔ کدو بھی وہاں ایک جیسے نہیں ہیں، کوئی گول سڈول ہے اور کوئی بس چھوٹی موٹی لاٹھی جیسا۔ کئی سر پھرے لوگوں نے کئی دفعہ کدو اور بینگن کا قصیدہ پڑھنے سے انکار کیا تو اُنہیں اپنے ہی کدو اور بینگن نے جلا وطن کیا اور جو وہاں رہے اُنہیں بغاوت کے الزام میں سلاد اور سالن بنایا گیا۔ آج بھی وہاں کے لوگوں کے جسم کا سارا پسینہ زمین میں جذب ہوتا ہے۔ اس طرح بینگن اور کدو تو اُگ آتے ہیں مگر خود اُن کی گردنیں سرکنڈے کی طرح پتلی ہو جاتی ہیں، وہاں دودھ، دہی، چربی، مکھن اور گھی کی کوئی کمی نہیں کہ وہ زمین بڑی زرخیز ہے مگر یہ سب کچھ وہی لوگ چٹ کر جاتے ہیں۔ روغنی غذا خوری کی وجہ سے ایسے لوگوں کی گردنیں موٹی ہو گئی ہیں۔ وہاں کا دستور ایسا ہے کہ جس کا جسم فربہ ہو، قد بھی دراز ہو، گردن موٹی ہو اور توند بھی آگے کو لٹکی ہوئی ہو۔ اُسی کے آگے حکمرانی کا باز اپنا سرخم کرتا ہے۔ عقل اور ہوشمندی کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں قانون کی مکمل حکمرانی ہے اور انصاف کے تقاضے ہر حال میں بڑی پھرتی سے پورے کئے جاتے ہیں۔ وہاں

ایک دفعہ مشرقی خطہ میں واقع ایک کھیت میں گھس کر اونٹ نے کپاس پر منہ مارا، پھر اُونٹ مینڈ پر بیٹھ کر جگالی کرنے لگا۔ انصاف کرنے میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ موٹی گردن والے حکمرانوں نے مغربی خطہ میں رہائش پذیر ایک نداف کو پابہ زنجیر کیا اور بیچ چوراہے پر اُس کی ناک کاٹی تاکہ دوسرے اونٹ اس سزا سے سبق سیکھیں۔ وہاں کے ایوانی لوگوں کی دریا دلی کا کوئی ثانی نہیں، وہ تو حاتم سے بڑھ کر ہیں کہ انہوں نے کتوں کی حالت زار اور آوارہ گردی پر رحم کھا کر اُن کے لئے کوہساروں کے دامن میں بڑے اچھے مکان بنوائے۔ اُن کی نس بندی کی گئی اور اُنہیں مرغے کھلائے گئے تاکہ لوگ اُن کی بد دعاؤں سے محفوظ رہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں بہت سے پتلی گردن والے کتوں کا فضلہ اُٹھاتے ہیں تاکہ شہر صاف و شفاف رہے۔ ایسے میں ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں پر جمی ہوئی خاک اُن کے جسموں کا حصہ بن جاتی ہے۔ انہیں خاک پوش رہنے کی افیوم کھلائی جاتی ہے۔ وہاں ایسے دانش مند لوگ رہتے ہیں جو آگ لگنے پر فوراً کنواں کھودنے کے احکامات صادر کرتے ہیں۔ سانپ بھی پالتے ہیں اور طبیب کو تریاق لانے کے لئے عراق روانہ کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ کس کس قسم کا گوشت کھاتے ہیں مگر اتنے پارسا ہیں کہ اناج کو جلا کر دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں۔ چرند پرند بھی پالتے ہیں اور نباتات و حیوانات پر کُلہاڑی بھی مارتے ہیں۔ جھک کر سلام کرتے ہیں۔ لوگوں کو جھکا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ دُکھ درد بانٹتے ہیں۔ اُن کی سب سے نرالی بات یہ ہے کہ دھوکہ کھانے میں اُنہیں مزا آتا ہے اور سب کچھ فوراً بھول جاتے ہیں۔ معاشیات کے اصولوں کو ایک طرف رکھ کر وہ کیا کیا نہ بیچتے ہیں اور کیا کیا نہ خریدتے ہیں۔ یہاں تک کہ گردے کھاتے ہیں، گردے بیچتے ہیں۔ دل و جگر تو وہاں چھینا جھپٹی کے کھیل میں گیند کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ چیل، گدھ اور کوے شاخوں پر یہ کھیل دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر قد میں ایک اونچا شخص انعامات تقسیم

کرتا ہے۔ زیادہ انعام اُس کو ملتا ہے جس نے اپنا ضمیر کئی بار بیچ کھایا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو بیچ کر خوب ہنستے ہیں اور یہ ایک اچھا یارانہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ زبردست رنگ ریز ہیں۔ ہر چیز پر رنگ چڑھاتے ہیں، اپنے گناہوں پر بھی، اپنے لیڈروں کے دروبام پر بھی۔ اپنے ضمیر کو تو وہ صبح وشام اسی رنگ میں ڈبوتے پھرتے ہیں۔ وہ ایک معمہ ہیں سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''۔ یہ کہہ کر عمر رسیدہ شخص خاموش ہوا کہ شام ہوگئی تھی۔ آسمان میں تارے جھلملانے لگے، میں نے شہر ناپُرساں کی کوئی کہانی سننی چاہی، اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر یوں کہانی شروع کی ''وہ بھی ایک تاروں بھری رات تھی، جب ایک پتلی گردن والا شخص دن بھر کدو بینگن کی کاشت کرتے کرتے اور جسم کا سارا پسینہ زمین میں وہاں جذب کرنے کے بعد گہری نیند سو گیا۔ اُس کے مکان کی دیواریں اُس کی گردن کی طرح پتلی و کمزور تھیں۔ چور نے نقب لگانے کی غرض سے اگر چہ مکان کی دیوار کا مطلوبہ حصہ ہی کاٹنا چاہا مگر دیوار ایک دم دھڑام سے گر گئی، یوں چور دیوار کے گرنے سے معمولی طور پہ مجروح ہوا۔ چور موٹی گردن والوں کے قبیل سے تھا اور یہ کہ وہ اُن کے کتوں کو کھلاتا پلاتا تھا۔ اس لئے شہر کا قانون فوراً حرکت میں آ گیا۔ کوتوال نے پتلی گردن والے شخص کو اس الزام میں گرفتار کیا کہ اُس نے جان بوجھ کر اپنے مکان کی دیوار اس قدر کمزور بنوائی تھی کہ چور مطلوبہ سوراخ بنانے میں ناکام ہوا اور دھوکہ میں دیوار کے گرنے سے زخمی ہوا۔ ساری ہمدردیاں چور کے نام درج ہوئیں۔ پتلی گردن والے شخص نے جان چھڑانے کی خاطر اُس گلکار کو مورود الزام ٹھہرایا جس نے مکان کی دیوار مضبوط بنانے میں تغافل سے کام لیا تھا۔ یوں موٹی گردن والوں نے بیان دیا کہ قانون اپنا کام خود کرے گا۔ اسی منطق کے مطابق گلکار گرفتار ہوا مگر اُس نے اُس مزدور کو پکڑوایا جو مکان کی تعمیر کے دوران گارا بنانے پر مامور تھا۔ اُس پر الزام لگایا گیا کہ اُس نے گارے میں مقدار سے کم پانی ڈالا تھا جس

سے اینٹیں دیوار میں اچھی طرح سے ٹک نہ سکیں۔مزدور بھی آفت کا پر کالا نکلا، اُس نے پانی کی عدم دستیابی کواس کی وجہ بتایا۔جب انصاف کے کٹہرے میں پانی کی کم یابی کی وجہ معلوم کی گئی تو پتہ چلا کہ مکان کی تعمیر سے ایک سال پہلے بہت سارے موٹی گردن والے ''شاباشی'' اور'' زندہ باد'' کی تقریب میں شرکت کرنے کی غرض سے اس قریہ سے گزر رہے تھے اور پانی کو راستوں پر چھڑکاؤ کیلئے اس غرض سے استعمال کیا جا رہا تھا کہ اُن کی لمبی قبائیں خاک آلودہ نہ ہوں۔پس اُس موٹی گردن والے شخص کو چور کو مضروب کرنے کے الزام میں پکڑا گیا جس نے راستوں پر پانی کے چھڑکاؤ کا فرمان جاری کیا تھا۔ یہ پھانسی کا سزاوار ٹھہرا''عمر رسیدہ شخص تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ میں نے آگے کی کہانی سُننے کی خواہش ظاہر کی۔ بوڑھے شخص نے میری آنکھوں میں شفقت بھری نظروں سے جھانک کر کہنا شروع کیا کہ اُس شہر میں پھانسی کے پھندے بنانے کا سارا کام خود موٹی گردن والوں نے ٹھیکے پہ لیا تھا۔اس لئے وہ ہمیشہ پھانسی کے پھندے پتلی گردن والوں کیلئے ہی بناتے تھے۔مگر اس بار مجرم پہلی دفعہ موٹی گردن والا تھا اور اس طرح پھانسی کا پھندا اُس کی گردن کے مطابق دستیاب نہیں تھا۔ پھانسی دینے والے تمام اہلکار سر جوڑ کر سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالاخر معاملہ دانش مندی سے سلجھایا گیا جب کدو شہر کے بینگن نُما حکمران نے فیصلہ دیا کہ روایات سے انحراف نہ کیا جائے۔موٹی گردن والے کو رہا کیا جائے اور اُس کے بدلے کسی پتلی گردن والے شخص کو پھانسی دے کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ مجرم کی تلاش اُس وقت ختم ہوئی جب اُسی شخص کو پکڑ کر پھانسی پہ لٹکایا گیا جس کے گھر میں چوری ہوئی تھی کیونکہ اپنے مکان کی مرمت کرتے کرتے اُس کی گردن اور زیادہ پتلی ہوگئی تھی اور پھانسی کا پھندا بالکل وہاں مناسب بیٹھتا تھا۔مجرم رہا ہوا اور مظلوم نے موت کا مزہ چکھ لیا۔

کہانی سنا کر عمر رسیدہ شخص سو گیا اور صبح ہوتے ہوئے وہ منظر سے معدوم ہوا اور مجھے لگا کہ جیسے اُس نے مجھے کہانی کا وارث بنایا اور خود کہیں دور نکل گیا۔

☆......خالد کرّار

تنقید کا جوڑ کر کیا تو نے ہم نشیں

صاحبو بلکہ بادشا ہو! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ تنقید کی لت ہمیں کتنی پرانی ہے۔ آئے روز ہماری تنقیدیں نئے نئے شگوفے بلکہ بوٹے کھلاتی ہی رہتی ہیں۔ جس روز ہم کسی کی تنقید نہ کریں ایسا لگتا ہے کہ ''جانے کسی چیز کی کمی ہے ابھی'' بلکہ بعض دفعہ تو تنقید نہ کر کے ہمیں قائم چورن تک کھانا پڑا۔ اس کے بعد معجون مقوی معدہ و بڑی آنت الگ۔ حتیٰ کہ ہم نے تہیہ کرلیا کہ تنقید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے کہ یہ وہ اسم اعظم (الہ آبادی) ہے کہ جو ہمارے لئے آکسیجن کا کام کرتا ہے۔ پس جس روز دو چار تنقیدیں نہ ہو جائیں ہمیں چین نہیں آتا۔ لیکن ہمارے ساتھ دقت یہ ہے کہ ہم کسی بھی طرح نقاد نہیں لگتے، نہ ہمارے بال جھڑے ہیں، نہ بدقسمتی سے عینک لگی ہے اور نہ ہی ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ رعشہ تو بہر حال ہم خود پیدا کر سکتے ہیں کہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، کہ دائیں ہاتھ سے ہم دیگر کھیل کھیلتے ہیں۔ رعشہ تو دو چار روز کی مشق سے آجائے گا لیکن ان کم بخت بالوں کا کیا کیا جائے؟ ایک یار پچپن (۵۵) سے اس کا حل پوچھا جو خود تو نقاد نہیں تاہم نقادی کے گر سکھاتے ہیں، بولے کہ بال گرانے اور سفید کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہر شب سونے سے قبل اپنے سر پر خالص دیسی نمک ملا کرو، اس کے ساتھ ہی انہوں نے دیسی نمک کی پہچان، فوائد اور استعمال پر ایک بلیغ تقریر بھی فرمائی اور نصیحت کرتے ہوئے کہا'' بہتر ہے سودا سلف لاتے ہوئے نمک کا ڈھیلہ یا پیکٹ سر پر اٹھا لیا کرو، انشااللہ افاقہ ہوگا''۔

اس روز سے ایک طویل عرصہ تک نمک ڈھونے کی مشق بہم پہنچائی لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی بلکہ بعض دفعہ تو اس ''شوق گیسوئے سفیداں'' کے چکر میں باورچی خانے کے لئے اضافی نمک بھی ڈھویا لیکن بدبختی نے ساتھ نہ چھوڑا۔نمک ڈھوتے گئے اور ہر صبح آئینہ دیکھتے گئے کہ سفید بال اب نکلے کہ تب اور'' آئینہ دیکھا اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔''اب حلیۂ نقادگاں بنانے سے زیادہ ہم نے اپنی تنقید پر توجہ مرکوز کی ،خود کو یہ سوچ کر ڈھارس بندھائی کہ ضروری نہیں ہر شخص شکل سے وہی نظر آئے جو اس کا پیشہ ہے۔(اس کے لئے ہمارے پاس بے شمار مثالیں ہیں لیکن بوجہ خوفِ خلق نہیں پیش کر رہے)۔بہرکیف! حلیہ پر خاک ڈالی اور تنقید کے عزم بالجزم کو از سرِ نو تازیانۂ شوق وشمار کنندہ ٔ شخصیات وفنون ہائے لطیفہ...... اوہ! معاف کیجئے گا تنقید لکھتے اور کرتے ہوئے ہماری زبان گاڑھی ہو کر فارسیا گئی ہے۔ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ تنقید کے عزم کو تھپتھپایا اور تنقید جاری رکھی۔اب یہ ہے کہ ادھر ہم گھر سے نکلے تو تنقید میں شروعات گلی محلے میں صفائی نہیں تو وزیر صحت وتندرستی کا بینہ پر تنقید سے کی۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدہام دیکھا تو وزیر ٹرانسپورٹ وسپلائیز برائے حکومت پر تنقید۔ پائپ لائین سے پانی رستا دیکھا تو وزیر محکمہ سپلائی آباں پر تنقید حتیٰ کہ جب تنقید کے لئے کوئی وزیر باتدبیر باقی نہ بچا تو سب وزیروں کے وزیر یعنی اعلیٰ وزیر کو یہ کہہ کر ہدفِ تنقید بنایا کہ اونگھ رہا ہے اور جھٹ سے یہ محاورہ جڑ دیا کہ ''جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجا رہا تھا''۔حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ نیرو کے پاس بانسری تو اپنی تھی ہمارے پاس وہ بھی نہیں ہے۔پس اے عزیزو! اسی طرح قدم قدم پر تنقیدیں بپا ہونے لگیں۔حتیٰ کہ ایک روز ہم نے ایک باپردہ خاتون کو روک کر یہ تنقید کر ڈالی'' کہ اے گل بدنِ شہر خوش ادا! باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن اس دور میں جب ہر طرف ملبوسات اور بدن ہائے نازک کی نمود ونمائش جائز وناجائز دعوتِ مژگانِ ہر خاص وعام حصولِ سند وقبولیت

پذیر ہے، آپ کا خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے کا یہ ڈریس اَپ چہ معنی دارد؟''۔

پس اس روز تنقید پر سے ہمارا دل کھٹا ہوا کہ اس خاتونِ ضخیم و معرکتہ الآرا نے شانِ بے نیازی سے چلمن ہٹائی اور بڑے کرخت لہجے میں گویا ہوئیں:

کیا کہا؟ خاتون ہوگا تیرا باپ، یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہمیں بھاگنے کی مہلت بھی نہ دی یعنی ان کا ہاتھ اور ہمارا گریبان۔ خاتون، جو دراصل خاتون نہیں تھیں بلکہ مِن وعَن زرداری کے زمانہ عہد شباب و کباب ہائے سندھ ولندن و پیرلیس طرز کی دو عدد پھڑکاؤ مونچھیں، بلکہ گلدستہ ہائے مونچھ رکھتی تھیں، کڑک کر بولا... اے تو کیا بولا! خاتون الرشید... میری وائف کو تو کیسے جانتا؟ پس صاحبو اور بادشا ہو! ہم سڑک کے دوسرے کنارے پڑے تھے اور وہ خاتون، جو دراصل خاتون نہیں تھیں، چلمن گرائے خراماں خراماں دوسری سمت رواں تھیں۔ ایک ضعیف الاعمر ٹائپ کے نوجوان نے از راہ رشک و ہمدردی ہمیں قریب کے شفا خانے تک پہنچایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خاتون، جو دراصل خاتون نہیں تھیں، کی بیگم کا نام خاتون تھا اور خود ان کا رشید۔ اور صاحب الرشید در پردہ ہائے برقعۂ سیاہ و چلمنِ تابدار، افیون کی امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ پس اس خاتون الرشید کے چکر میں کئی روز تک ہدایات ونسخہ ہائے دوائے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ مالش بھی کرواتے رہے۔ ہم نے ان خاتون، جو دراصل خاتون نہیں تھیں، کے طرزِ عملِ غیر صالح سے نصیحت باندھی اور تہیہ کرلیا کہ تنقید کریں گے۔ گو کہ اس میں، تنقید میں فائدے بہت تھے۔ ایک تو لوگ بلا وجہ خائف رہتے تھے۔ جاہل اس لئے بات نہیں کرتے تھے کہ میاں بڑا عالم ہے، بچ کے رہو۔ اور عالم یہ سمجھتے تھے کہ نقاد ہے نہ جانے کب اور کہاں ـــــ۔ خیر نقاد ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنی بات پر چاہے وہ بجا ہو یا بے جا اڑے رہ سکتے ہیں۔ اڑے رہنے کا یہ فائدہ ہے کہ کوئی بھی طوفانِ باطل آپ کو ہلا نہیں سکتا۔ بہر کیف!

تنقید سے توبہ کی اور لسانیات پر توجہ مرکوز کی ۔ بلا شبہ تنقید کے بعد لسانیات میں کافی اسکوپ ہے۔ اس میں بھی آپ آئے، روز نئے نئے گل بوٹے کھلا سکتے ہیں اور ایک زبان کا رشتہ دوسری زبان سے جوڑ کر اپنے آپ کو لسانی تحقیق کا جدِ امجدِ حیدر آبادی کہلا سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے نام کے ساتھ ماہر لسانیات ومطالعات ولحیات الاموات، الشرح بالقبور النشور لکھوا کر لسانیات پر لیکچر دینے کی ریہرسل شروع کر دی۔ ریہرسل کے لئے ہم نے میر انیسؔ کی طرح قدِ آدم آئینہ اپنی خواب گاہ ہائے خرگوش میں نصب کروایا اور لیکچر کی پریکٹس بالفعل شروع کر دی۔ اب ہم اردو کا رشتہ قدیم سنسکرت اور آریائی زبانوں سے جوڑ رہے ہیں اور جونہی یہ جوڑ جڑ جائے، قارئین کرام آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ کیونکہ ہم نے سنسکرت کو قومی سطح پر قومیانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے اس لئے اردوئے کربلائے معلّٰی کے ساتھ اس کی رشتہ داری انشاءاللہ سودمند ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ اس کے بعد ہمیں شری دیوی پدما، مسز پدما بھوشن لعل، یا گیان پیٹھ سنگھ رخِ زیبا جیسا کوئی اعزاز مل جائے گا۔ اب حکومت کو ہمیں باضابطہ طور ماہر لسانیات کے طور قبولنا چاہیے ورنہ اس کے اثرات شیئر مارکیٹ پر ہرگز اچھے نہ ہوں گے۔

فی زمانہ لسانیات میں کیریئر بنانے کا موقع با ایں طور پر تابناک ہے کہ کلاسیکل زبانوں سے خاص وعام کی واقفیت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ سنسکرت، فارسی اور عربی کی مشکل تعبیرات کو اردو بنا کر رعب قائم کیا جا سکتا ہے۔ شرق وغرب میں ہمیں اگر کوئی خوف ہے تو بس ملا حضرات کا جو ہماری ذولسانی تک بندیوں کی پول کھول سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک مضمون شمالی ہند کی مختلف بولیوں کے مابین ربط ڈھونڈنے کے لئے سپردِ قرطاس کر لیا ہے اور خود کو ماہر ''بولیات'' باور کروایا ہے تاہم نہ جانے کیوں بچوں کو سپارہ پڑھانے کے لئے آنے والے مولوی صاحب ہمیں دیکھتے ہی خ خ خ اور کھی کھی کھی قسم کی بے ہنگم ہنسی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولوی

صاحب ہماری اس قدر گہری علمی اصطلاح کے تانے بانے مسالک البول اور بول و براز سے جوڑتے ہیں۔ قارئین! ہمارا رعب آپ پر پڑے نہ پڑے لیکن مولویوں سے احتیاط لازم ہے۔

☆......خالد کرار

اب کے ہم خواب بھی نہ دیکھیں کیا؟

اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔یعنی ہم نے پھر ایک خواب دیکھا اور وہ سچ ثابت ہوا۔ گو کہ خواب دیکھنے کی ہمیں قبلہ پیر و مرشد کی جانب سے سخت ممانعت تھی لیکن حیف کہ ہم باوجود کوشش اسے (خواب کو) آنے سے نہیں روک پائے۔ ہمارے پیر و مرشد حضرت علامہ ابوالہول متقی کراماتی مضافاتی واشرف المخلوقاتی نے ہمارا ہاتھ، داہنا دیکھ کر فرمادیا تھا کہ تم خواب مت دیکھنا کہ اس سے نتائج بد کا اندیشہ ہے۔ہم ذرا پریشان ہوئے کہ بقول مرزا نوشہ اب ہم خواب میں بھی بوسہ لینے سے رہے،اورعرض کیا کہ اے حضرت! اس میں (خواب نہ دیکھنے میں) کیا مصلحت ہے، بارے تفصیلی بیان ہو جاوے۔ اس پر قبلہ پیر و مرشد کامل و عاقل و بالغ نے پہلے تو اس گستاخانہ رویئے پر سرزنش کی اور بعد از سرزنش فرمایا کہ دیکھو تمہارا مشتری کا ستارہ زہرہ کے زیر اثر ہے،اور وہ مریخ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے،مریخ کا سایہ میونسپلٹی کے زیر قبضہ ہے۔ دریں اثنا عطارد ان سب پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے، جب تک یہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہے گا اس کا اثر تمہارے روزمرہ پر رہے گا۔بطور خاص تمہاری خوابی دنیا متزلزل رہے گی۔ لہٰذا تمہارے لئے مشورہ بلکہ حکم مرشدِ مرادات یہ ہے کہ تم تاحکم ثانی خوابوں سے بچے رہو، یعنی انہیں خوابوں کو دیکھنے سے گریز کرو۔ بصورت دیگر تمہیں خواب بلیک اینڈ وائٹ نظر آئیں گے اور تاثیر وتعبیر دونوں میں بد ہوں گے۔ یہ کہہ کہ ہمارے قبلہ پیر و مرشد نے اس زور سے ہمارا ہاتھ جھٹکا کہ ہمیں اپنے کاندھے

کی ہڈی کھسکنے کی آواز صاف سنائی دی۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ آہ نکلی لیکن مرشدِ کامل کے کان پر جوں تک نہ رینگی (جوں کا نہ رینگنا بھی ایک کرامت شمار کی جائے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ موصوف کو پانی سے کس قدر پرہیز ہے)۔ پیرومرشد بدستور چلم کے کش لگاتے رہے۔ ایک خادم جو اس دوران چلم میں جانے کیا ڈالے جارہا تھا جس کے زیر اثر ان کا جلال دیدنی تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ممکنہ طور پر یہ کوئی ایسا لوبان ہے جس سے قوم وملت کا غم جاتا رہے، واللہ اعلم بالصواب۔ ہم نے ہڈی کھسکنے کی آواز کو اپنے مرشد کامل و عاقل و بالغ کی کرامت سمجھا اور ایسا کوئی خیال بداپنے دل میں نہ آنے دیا کہ یہ موصوف کی جسمانی طاقت کا کمال ہے کہ جو چھتر کے پیٹے میں ہونے کے باوجود ہمارے ایسے جوان العمر ٹائپ کو اتنی آسانی سے جھٹک دیا۔ دریں اثنا کش لگاتے اور شامی کباب کھاتے رہے۔ یکا یک انہوں نے تالی بجائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خادم دست بستہ حاضر ہوا، موصوف نے ان کے، خادم کے کان میں کچھ فرمایا جس کے اثر سے خادم کی آنکھیں سرخ اور سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ماجرا کیا ہے کہ خادمِ خاص کا ہاتھ ہمارے کالر پر تھا جس کے نتیجے میں ہم دروازے کے باہر۔ پس اس روز سے ہم نے خواب دیکھنا ترک کر دیا۔ ویسے بھی حضرت پیرومرشد صاحب کو خواب دیکھنے، کتابیں پڑھنے اور کھوج پر کچھ کرنے والوں کی حالت زار دیکھ کر سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ کہتے ہیں کہ موصوف علم حاصل کرنے کے لئے چین جانے کی تاکید کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ وہاں جا کر پڑھنے مت بیٹھ جانا۔ جو کچھ ہم نے سمجھا یا بجھایا ہے، وہی اصل ہے، باقی سب نقل۔

پس اے عزیزو! حضرت کی مشتری زہرہ عطارد اور مریخ گتھی ہمارے پلے نہ پڑنی تھی نہ پڑی۔ لیکن ہم نے خواب نہ دیکھنے کا عزم بالجزم کر لیا اور پختہ نیت باندھ لی کہ حضرت کے حکم سے ایک انچ ادھر نہ ادھر کھسکیں گے۔ اس کے لئے خواب نہ

دیکھنے کے لئے، ہم نے زبردست مشق بہم پہنچائی اور دنوں بلکہ ہفتوں تک نیند کی شری دیوی کا منہ نہیں دیکھا۔ یہ ہمارے عزم وہمت کا ہی کمال تھا کہ جوں ہی ہماری پلکیں بھاری ہونے لگتیں ہم جھٹ سے ایک زوردار طمانچہ اپنے گال پہ جڑ دیتے بلکہ بعض دفعہ تو ہم نے گاندھی جی کا مقولہ سچ ثابت کرنے کے لئے بعد از طمانچہ فی الفور خود کو دوسرا گال بھی پیش کر دیا اور ایسا کر کے ہم اپنا سامنہ لے کے رہ گئے کہ آخر ہاتھ اپنا تھا، گال اپنا، نیند اپنی تھی، خواب اپنے۔ چند روز تک تو یہ معمول رہا تاہم بعد ازاں یہ دقت آئی کہ اپنے ہی گال پر طمانچے کی طاقت نہ رہی۔ ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ بھی جاتا رہا حتیٰ کہ ہمیں بھی حضرت کی طرح اس طمانچہ کے لئے، ایک عدد خادم خاص رکھنا پڑا۔ پس جونہی ہماری پلکیں بوجھل ہونے لگتیں، خادم طمانچہ زوردار انداز میں ایک دائیں اور دوسرا بائیں گال پر جڑ دیتے۔ اس سے کچھ روز تو افاقہ رہا حتیٰ کہ پہلے ہفتے کی تنخواہ لینے کے بعد خادم طمانچہ بھی تائب ہو گئے اور ہمیں ایک ہونہار طمانچہ بردار سے محروم ہونا پڑا۔ بعد از تحقیق ان کے متعلق معلوم ہوا کہ موصوف ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھے اور انہیں پارٹیاں بدلنے کی خاص مہارت ہے۔ پس اے بادشاہو! ہم نے خود اپنی سی کوششیں جاری رکھیں لیکن حیف کہ ہم ناکام ہوئے اور نیند نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ نیند کی شری دیوی تشریف لائیں تو ہم نے دست بستہ دیوی جی کو پرنام کیا اور عرض کیا کہ دیکھئے محترمہ آپ تشریف لائیں، دیدہ و دل فرش راہ لیکن معاف کیجئے ہم پہلے بتائے دیتے ہیں کہ ہم ہرگز ہرگز کوئی خواب نہ دیکھیں گے۔ پہلے پہل تو یہ تدبیر کارگر رہی بعد ازاں گاہ بہ گاہ خواب آنے لگے۔ ایک دن ہم نے، خود ہم نے خواب میں دیکھا کہ ہم خود ہم، اپنے ایک ہمسائے کے ہاں دعوت میں شریک ہیں۔ کچھ روز بعد معلوم پڑا اہاں دعوت ہی تھی۔ یعنی ہمسائے کی دختر نیک اختر ازخود والدین کا بوجھ کم کرتے ہوئے ایک چھابڑی والے سے بلاتکلف منکوحہ ہو گئیں

اور بعد ازاں شوہر نامدار سمیت والدین کی خیر و عافیت دریافت کرنے پہنچیں۔ اس موقع پر بڑی پُر لطف ضیافت ہوئی۔ ہم نے تو نہیں کھائی تاہم جنہوں نے کھائی، انہیں دوبارہ کھانے کی للک ہے۔ اللہ اللہ! اسے کہتے ہیں جدت۔ ایک اور خواب ہم نے دیکھا یعنی ہمارے یار طرح دار و ناہنجار حضرت اسکندر یار زعفرانی کی ترقی ہوئی ہے۔ جاگتے ہی نہار منہ ان کے گھر پہنچے کہ مبارک باد پیش کریں اور ان سے چائے پانی کا سابقہ حساب بھی چکتا کریں لیکن معلوم ہوا کہ زعفرانی کو تو مسلسل غیر حاضریوں پر معطل کر دیا گیا ہے۔ اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹے لیکن ایسے کچھ واقعات کے مشتہر ہونے سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے پاک وصاف کردار پہ حاسدوں نے خوب خوب کیچڑ اچھالا۔ کم بخت ان دنوں بارشیں بھی بہت ہو رہی تھیں اس لئے جس کے ہاتھ میں جتنا کیچڑ آیا، اس نے ہماری ذات پر دے مارا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہمارا کردار آئینہ کی طرح ہے جس کی قلعی کھل چکی ہے۔ عزیزو! خواب تو آخر خواب ہیں۔ یہ ''خواب مرتے نہیں'' کے مصداق جونہی موقع ملے جھٹ سے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور حیرت انگیز طور پر پیر و مرشد کی پیش گوئی کے عین مطابق بلیک اینڈ وائٹ اور تاثیر و تعبیر میں بد ثابت ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ہم نے ایک خواب دیکھا کہ ہمیں جاپان کا وزیر اعظم بنا دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان میں زبردست زلزلہ آیا۔ ہمارے ان دوستوں نے جنہیں ہم اپنا یہ خواب سنا چکے تھے ہمیں خوب لعن طعن کی کہ بھئی تمہارے باعث یہ سب تباہی ہوئی ہے۔ ہم خواب دیکھتے رہے اور دوستوں کو سناتے رہے۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہمیں منحوس خوابی قرار دے کر ہمارا ناطقہ بند کر دیا جو ہنوز بند ہے۔ دیکھئے کب کھلتا ہے۔

اب ہم نے عہد کر لیا ہے کہ خواب دیکھیں تو کسی کو سنائیں گے نہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ کل ہم نے، خود ہم نے، خواب دیکھا کہ ہم، خود ہم، خواب دیکھ رہے

ہیں۔آگے کا احوال ہماری ایک پرانی نظم کے ایک بند میں ملاحظہ فرمائیں:

''کوئی ایسے عالم میں
میری بند پلکوں پر
اپنے ہاتھ رکھتا ہے
اک شناسا خوشبو سے
اک کھنک کے جادو سے''

۔۔۔۔۔۔قارئین! یہ بات ہم نے آپ کو اپنا سمجھ کر بتائی ہے۔ للہ۔۔اسے کسی سے کہیے گا نہیں کہ بات نکلتے نکلتے نکل جاتی ہے اور ہماری بیگم تک جا پہنچی تو خواہ مخواہ ہمیں غصہ آئے گا۔ ویسے ہم ڈرتے ورتے کسی سے نہیں لیکن احتیاط لازم ہے۔

☆......خالد کرّار

غزل بہانہ کروں

آہا عزیزو! ایک روز ہم غزل گنگنا رہے تھے اور اس کے معنی پر غور کر رہے تھے۔ غزل کے معنی تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق باتیں کرنا اور غزل کہنے (فی زمانہ گھڑنے) والے کو شاعر کہتے ہیں۔ اللہ اللہ! کیا معنی ہوئے ہیں غزل کے۔ یعنی عورتوں کے متعلق باتیں کئے جاؤ اور دھڑلے سے کئے جاؤ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اللہ معاف کرے! ہمارے پیر و مرشد کو معلوم نہ ہونے پائے۔ خدا جانے اس صدمے کا ان پر کیا اثر ہو؟ یعنی حد ہے بھئی! یہ شاعر لوگ اتنے کایاں ہیں کہ بہو بیٹیوں کی باتیں برسر عام کرتے پھریں اور کوئی خبر تک نہ لے۔ میاں قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں سب۔ اللہ معاف کرے۔ استغفر اللہ! ٹھیک ہی کہا تھا افلاطون نے کہ اس کی مثالی ریاست میں شاعروں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے ہم افلاطون کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ افلاطون بہو بیٹیوں کی عزت کرنا جانتا تھا اور شاعروں کے اس وطیرے سے بھی غالباً آگاہ تھا۔ شاعر بھی کیا ہوئے ہیں اور ہیں۔ یعنی ایک جانِ ناتواں اور اس قدر بکھیڑے۔ پہلے تو ایک خیالی دنیا آباد کرنی، اُس میں چرند پرند، انسان، حیوان، نباتات و جمادات پیدا کرنے اور دودھ اور شہد کی نہریں بہائیں، گل و بلبل کے نغمے، آبشاروں کا ترنم اور پھولوں کا تبسم۔ پھر ایک رقیبِ روسیاہ کو دعوت دینی کہ میاں تم بھی آؤ۔ اس قدر خوبصورت جگہ اتنی محنت سے بنا کر بجائے اس کے کہ اس میں ہنسی خوشی رہے شاعر ایک عدد پری زاد کو باغ میں بٹھا کر اس کی پرستش اور رقیب

سے حسد شروع کر دیتا ہے اور پھر اس کے ہجر و فراق میں وہ نغمے الاپتا ہے کہ الاماں!۔ بھئی! بڑے دل گردے کا کام ہے، ہم تو باز آئے۔

اب دیکھئے ایک شاعر ہوئے ہیں، حق مغفرت کرے۔ انہوں نے تو علی الاعلان کہہ دیا کہ کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے ۔۔۔ غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے۔ تو یہ ہے بھئی! تو گویا غزل کی آڑ میں آپ گیت بھی گاتے پھرتے ہیں۔ یہ تو دوہرا جرم ہے۔ مثالی ریاست میں گویوں کا کیا کام؟ مزید برآں ہمارے بزرگوں کا بھی یہی حکم ہے کہ موسیقی سے پرہیز کرو۔ ہاں نور جہاں، کندن لال سہگل اور بیگم اختر اور عزیز میاں کو گاہ بہ گاہ سننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خاص کر عزیز میاں قوال کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ انہیں نہار منہ سننے سے دماغ کی گرمی جاتی رہتی ہے اور قلب رواں رہتا ہے۔

شاعر بھی کیا ہوئے ہیں اور اور کیا کہہ گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم انگشت بہ دنداں رہ جاتے ہیں اور بعد میں انگشتِ شہادت دیکھتے ہیں جس پر ہمارے ہی دانتوں کے نشان ہوتے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ اس قدر لاغر جسم، ڈھانچہ نما وجود اور شاعر کا یہ حوصلہ۔ ایک شاعر تو بہت پہلے کہہ گئے تھے کہ میاں شیخ دیکھو ہماری تر دامنی پر مت جاؤ، ہم اگر دامن نچوڑ دیں تو فرشتے آ آ کر وضو کریں۔ گویا یہ ایک طرح سے چیلنج تھا فرشتوں کے لئے، چاہیے تو یہ تھا کہ فرشتوں کی سلامتی کونسل اس حوالے سے کوئی اقدام کرتی اور شاعر اور شاعروں کے ہوش ٹھکانے لائے جاتے لیکن ہنوز ایسا نہیں ہوا۔ بھئی یہ بھی کوئی بات ہے کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ اوّل تو اس نوری مخلوق کو وضو کی ضرورت اور فرصت ہی کیا ہے۔ دوم اگر ضرورت پڑ بھی جائے تو شاعر کا دامن نچڑوانے کی کیا تک ہے۔ کیا حوضِ کوثر کم ہے؟؟ فرشتوں کی اس حرکت یعنی شعرا اور بطور خاص شاعر مذکورہ کے خلاف کارروائی نہ کرنے سے ہمیں زبردست

مایوسی ہوئی۔تب سے ہم سوچ رہے ہیں کہ ہونہ ہوفرشتے شعرا سے خائف رہتے ہوں گےجبھی تو کسی فرشتے نے کسی شاعر کی آج تک خبر نہ لی۔ایک باراس یقین سے حوصلہ پا کر ہم پورادن دامن نچوڑتے رہےاور افق کی طرف دیکھتے رہے کہ اب کوئی فرشتہ آیا کہ تب۔لیکن پورا دن دامن نچوڑنے کے بعد ہمارا یقین کہ فرشتے شعرا سے خائف رہتے ہیں، یقینِ کامل میں تبدیل ہوگیا۔اس روز ہمیں بے انتہا خوشی ہوئی کہ چلوکوئی تو ہےجس سے فرشتوں جیسی مخلوق بھی خائف ہے۔آنجہانی کرشن چندر سے روایت ہے کہ شاعر سے پولیس اور چور دونوں خائف رہتے ہیں۔حالانکہ یہ دونوں اپنی صفات کے اعتبار سے کسی دوسرے سے بالکل نہیں ڈرتے لیکن شاعرنظر آجائے تو چور سامان چھوڑ کر اور حوالدار لٹھ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ایک بار ہم اپنے ایک دوست سے ملاقات کی غرض سے پولیس تھانہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اندرزبردست سراسیمگی ہے۔ بعدازتحقیق معلوم ہوا کہ ہمیں پھاٹک سے اندرآتے دیکھ لیا گیا ہےاور دیکھنے والوں میں ہم سے خار کھانے والے بھی شامل تھے۔یقیناً انہوں نے تھانیدار سے ہماری چغلی کھائی ہوگی کہ ہم شاعر ہیں۔حالانکہ ہم تو کسی پایہ کے شاعر بھی نہیں۔اس روز ہم نے نہایت اطمینان سے پورے پولیس تھانہ کی چہل قدمی کی اور بڑی افسردہ دلی سے گھر لوٹ آئے۔

جیسا کہ ہم نےعرض گزاری کہ عام آدمی اگرکوئی بڑادعویٰ کرےتو لوگ اس پر ہنستے ہیں۔مثلاً ہمارے ہمارے استاد اگر یہ کہیں کہ رات بھر جاگ کرانہوں نے آسمان کے تارے گنےاورکل ستاسی کروڑ بانوے ہزارنوسوستر ہوئے ہیں۔تو لوگ ان پر ہنسیں گےاور اگرکسی سیاسی جماعت کا کوئی کارکن یہ کہے کہ وہ عنقریب وزیراعظم بننے والا ہےتو لوگ اور بھی ہنسیں گے کہ بھیڑ ہانک رہا ہے۔لیکن شاعر اگرکوئی ایسا دعویٰ کرےتو اسے تعلّی کہہ کر دادوتحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اور خوب

خوب تالیاں پٹتی ہیں۔ مثلاً کوئی شاعر کہہ گئے ہیں کہ بھئی ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پر طنز نہ کر۔۔۔ ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں۔ بھلا ان تاجوں کا کیا جو عجائب گھروں میں پڑے پڑے خراب ہو رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ٹوپیاں مانگ مانگ کر اور سی سی کر گزارہ کر رہے ہیں۔ یعنی صبح ہوئی اور بقول مرزا نوشہ گھر سے کان قلم پر رکھ کر نکلنے سے قبل جمال وجلال کی اماں سے کہا' نیک بخت! ذرا جانا تو مکرّر راز شادمیاں کے گھر سے ایک ٹوپی اُدھار لے آنا، آج مشاعرہ پڑھنا ہے۔ اب اسے عجائب خانے میں رکھی ٹوپیوں کی بڑ کی جگہ تعلّی کہیں گے۔ چونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاعر بڑے کایاں ہوتے ہیں، انہوں نے بڑ کو صفت میں شامل کر کے اس کا نام تعلیٰ ڈال دیا تا کہ کوئی شریف زادہ ان کی طرف آنکھ میلی کر کے نہ دیکھ سکے۔

شاعروں کے نام اور تخلص بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ شاعر دنیا کی یہ واحد مخلوق ہے جس کے نام و تخلص شخصیت سے بالکل میل نہیں کھاتے جیسے شاکرؔ بخیلی، بینؔ کریلہ پوری، مشربؔ طاغوتی، دردؔ خوش آبادی، غمؔ شہر یاری، شیخوؔ شیخ چلی وغیرہ جیسے بیمار تخلص مستعمل ہیں۔ خود ہمارا بھی ارادہ ہے کہ انشاء اللہ بڑے ہو کر غزل گھڑنے کی مشق بہم پہنچائیں گے اور جب اس ہنر میں خوب مشاق ہو جائیں گے تو اپنا ایک منفرد نام و تخلص، مشاقؔ آدم بیزاری رکھ کر شعر کہیں گے کیونکہ فی زمانہ شعر کہنا چنداں مشکل نہیں۔ بس آپ اردو کا کوئی پرانا اخبار اٹھا لیجے اور اس کے مضامین کو کاٹ کر غزل کے پیرایہ میں لکھتے جائیے۔ آپ اس کے لئے نیا اخبار بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن سرقہ کے الزام کا خطرہ ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اخبار پرانا ہو اور اس میں کہیں نہ کہیں کسی مضمون میں فارسی کا استعمال بھی ہوا ہو۔ اگر ایران سے فارسی اخبارات کی ایک کھیپ منگوالی جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اس سے لوگوں، خاص کر شعرا اور نقادوں پر رعب بنا رہے گا کہ فارسی پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو

اپنے نام کے ساتھ جدید، مابعد جدید، انتہائی جدید، اور پس مابعد جدید یا اسی طرح کی تراکیب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ کا رعب دگنا ہو جائے گا اور انشا اللہ چاروں طرف آپ کا طوطی بولنے لگے گا اور جب خوب بول جائے تو آپ اسے چپ بھی کرا سکتے ہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ قاری لاکھ سر مارے آپ کے اشعار سے معنی برآمد نہ ہو سکیں۔ شعر جس قدر مشکل ہو اور معنی جس قدر کم ہوں، شاعر اس قدر کامیاب اور عمدہ تصور کیا جائے گا۔ اس کے لئے فقط ایک شعر کی مثال کافی ہے جو خود ہماری عمدہ شعر گوئی کا نمونہ بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے انشا اللہ شعری افاقہ ہوگا۔

تشکیک و لایعنیتِ بیش وکم حیات ہے
حیات ہے، بساط ہے، مَری میں بھی سوات ہے

☆......مشتاق احمد کینی

مجبوری

کیا کوئی مجبوری تھی کہ کائنات وجود میں لائی گئی؟ کائنات کی زمین پر تمام مخلوق بالعموم اور انسان بالخصوص ''مجبوری'' کے ہی سبب جی رہا ہے۔ اگر ہم اپنے سماج پر نظر ڈالے بغیر بھی دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ سماج کا ہر ایک طبقہ ''مجبوری'' کی زد میں ہے۔ نوزائیدہ بچے سے لے کر بزرگ شخص تک کہ جس کا ایک پاؤں قبر میں ہے ''مجبور'' ہے۔ بچہ مجبوری کے سبب گلا پھاڑ کر رو رہا ہے۔ اُس کی مجبوری اس وقت بھوک ہے۔ اسے دودھ چاہئے۔ ماں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی خاطر وہ زور زور سے روتا ہے۔ ابھی یہ بچہ چند ہی لمحہ پہلے دنیا میں آیا اور سب سے پہلے اس کا واسطہ مجبوری سے پڑا۔ انساں چونکہ عقل اور اس کے استعمال کے ہنر سے واقف ہے، اس لئے اپنی ذہانت سے اس مجبوری کو اس طرح استعمال کر رہا ہے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ آج کل مجبوری میں رشوت لینا اور دینا جائز ہو گیا ہے۔ دودھ میں پانی کے علاوہ کھاد وغیرہ بھی مجبوری ہی میں ملائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی مریض کو غیر معیاری دوا مجبوری میں تجویز کرتے ہیں کیونکہ دوا بنانے والے بھی مجبوری کے ہی سبب نقلی دوا بناتے ہیں۔ علاج کے نام پر خزانہ عامرہ سے ہزاروں لاکھوں روپے مجبوری کے ہی نام پر واگزار کروائے جاتے ہیں۔ سرکاری کھاتوں میں واگزار شدہ روپیوں کا اندراج اس طریقہ سے کیا جاتا ہے کہ اندراج کرنے والے کی مجبوری کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ اندراج شدہ دستاویزات میں ڈاکٹر صاحب کی وہ

سند بھی ہوتی ہے جس میں بیماری اور علاج کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ہی سماج کا ایک جز ہیں، اس لئے وہ بھی مجبوری کا سہارا لے کر سند تحریر کر دیتے ہیں یعنی دواؤں کا برا اثر زائل کرنے کی خاطر تسلیم شدہ اداروں کی دوا لینے کی تلقین کرنے سے ڈاکٹر صاحب نہیں چوکتے۔ اس ادا میں بھی مجبوری ہے۔

دکاندار ''ویٹ'' کے سبب اشیائے ضروریہ کی مصنوعی قلت بھی مجبوری میں ہی کر رہے ہیں۔ حکومت ''ویٹ'' بھی مجبوری میں ہی لے کر آئی۔ انتظامیہ کے سارے شعبوں میں ڈائیریکٹر سے لے کر چپراسی تک سب مجبور ہیں۔ اشیائے ضروریہ کی قلت تو عام بات ہے۔ کم وزن کی چیزیں دینا بھی اب عام ہو گیا۔ وہ بھی مجبوری کی وجہ سے، طرہ یہ کہ یہ کام اکثر ہمارے یہاں حاجی صاحباں کے دست مبارک سے مجبوری میں انجام دیا جاتا۔ یہ کام محکمہ امور صارفین کی عین ناک نیچے ہی کیا جاتا ہے لیکن محکمہ ہے کہ مجبوری کی وجہ سے یہ نوٹس لینے سے قاصر ہے۔ منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کرنے کے خلاف قانون تو وضع ہیں مگر وہ بھی مجبوری کے سبب بس کتابوں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں، کیونکہ قانون حل تلاش نہیں کر سکتا اس لئے وہ صرف ان ہی لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے جو احمق ہیں، ناعاقبت اندیش ہیں نہ کہ انہیں جو احتیاط اور ہوشیاری سے چوری کرتے ہیں یا جو مجبوری کو کمال ہنر سے استعمال کریں۔ قانون نافذ کرنے والا عملہ بشر ہونے کے سبب مجبوری کے دائرے سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ انصاف کے محافظ بھی اس مچی ہوئی بھگدڑ میں قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ پوری قوت کے ساتھ دوڑے چلے جاتے ہیں۔ حکومت بھی مجبور ہو کر تعلیم عام کرو، کے پروگرام کو عملانے کی دوڑ دھوپ کر رہی ہے، لاکھوں کروڑوں روپے تعلیم پر خرچ کئے جا رہے ہیں۔ پر حاصل مجبوری اور کوئی بھی سرکاری عہدہ دار اس قابل نہیں کہ وہ صرف شدہ رقم سے حاصل نتائج کی نشاندہی کر سکے۔ کیونکہ رقم مجبوری کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے

اور محاسبہ کرنے والے بھی مجبوری میں ''سب ٹھیک ہے'' کی سند اجرا کر دیتے ہیں۔ نجی تعلیمی اداروں کی بھر مار برساتی مینڈکوں کی کسی پیداوار برساتی مینڈکوں کی کسی پیداوار ہر گلی پر کوچے میں نجی کیوں؟ محکمہ تعلیم مجبوری کے سبب اس بے لگام عمل کو قابو کرنے سے لاچار ہے۔ ایک واضح قانون کے ہوتے ہوئے بھی محکمہ تعلیم سکول سے سکول کی دوری کے قانون کو نافذ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ محکمے اور اس میں کام کرنے والوں کو بھی زندہ رہنا ہے۔ مجبور ڈائریکٹر صاحب ''مجبوری'' میں سرکاری سکولوں کی ترقیاں، کارکردگی، نئے سکولوں کی عمارتیں، تقرریاں، تبدیلیاں اور تعلیم سے جڑے لاتعداد مسائل وغیرہ وغیرہ کے ساتھ نجی سکولوں کی معاینہ کاری، اُن کو Recognize کرنا، ان کا درجہ بڑھانا، ان کے آمدن اور خرچ کا حساب کتاب دیکھنا، ان کے نظام کا طریقہ کار دیکھنا وغیرہ اپنے سر لئے ہوئے ہیں۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، پھر بھی ڈٹے ہیں۔ ایک چھوٹی سی جاں اور کتنے کام۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نجی سکولوں کے لئے ایک الگ ڈائریکٹر ہوتا تا کہ ''مجبوری'' کا اثر کچھ کم ہوتا۔ لیکن مجبور افسر کیسے چاہیں گے کہ مجبوری کا اثر کم ہو۔ اس کی شدت اور جدت کی کمی ہو کیونکہ وہ مجبور ہیں۔ یہ محکمہ آمد و رفت (Traffic) کو متحرک کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ (Belted) محکمہ اب تک غیر متحرک تھا؟ اسی لئے شاید محکمے کے اہلکار کسی کسی چوراہے پر اپنا منہ چھپائے رہتے نظر آتے ہیں، منہ چھپائے رکھنا مجبوری ہے۔ یہ اہلکار TATA گاڑیوں کے پچھلے بمپر پر ڈنڈا مارتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ بمپر پر ڈنڈا مار کر ڈرائیور کا مجبوری کی طرف دھیان مبذول کیا جاتا ہے اور ڈرائیور گاڑی کو (Neutral) کر کے Accelerator دبا کر اہلکار پر باور کرتا ہے کہ اس کو اس کی مجبوری کا احساس ہے۔ مجبوری کے اس لین دین میں ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔

خدائے برتر نے انسانوں کو نعمتوں سے نوازا ہے۔ لیکن انساں نے نعمت غیر

متر قبہ یعنی سب سے اعلیٰ اور برتر نعمت کو ''مجبوری'' کے نام سے وجود میں لایا۔ اس کا سہارا لے کر بڑے سے بڑا کام انجام دیا یا دلوایا جا سکتا ہے۔ قاضی بہ رشوت راضی۔ مجبوری کا سہارا لے کر آٹو میں لاؤڈ سپیکر لگا کر گردوں کے علاج کے لئے روپے جمع کئے جاتے ہیں اور شام کو ان روپیوں کا مجبوری میں بٹوارہ کیا جاتا ہے۔

☆......مشتاق احمد کینیؔ

ٹینشن

سزا خطاؤں کی ہوتی ہے نا کہ خامیوں کی۔ٹینشن یا ذہنی تناؤ بھی ایسی ہی ایک خامی ہے جو کسی بھی سزا سے مبرا ہے۔حضرت انساں نے اکثر اپنی راحت کو ملحوظ نظر رکھ کر وقت کے ساتھ نئی نئی ایجادات وجود میں لائیں۔عصر حاضر میں کسی بھی خطا کو ٹینشن کا لبادہ اوڑھا کر خامی کی شکل دی جانے لگی ہے۔اپنی من مانی کرنے کی آزادی میں کسی بھی رکاوٹ کو ٹینشن ہونے کا ڈر دکھا کر دور کرنے کا رواج ہو چلا ہے۔اپنے آپ میں مصنوعی اداسی لایئے اور پھر دیکھئے والدین آپ کی خاطر کس طرح کرتے ہیں۔قریبی رشتہ دار اور ملنے والے بھی آپ کی دل جوئی کرنے میں لگ جائیں گے۔کوئی آپ کی خاطر داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔کیونکہ آپ ٹینشن میں ہونے کی بات آشکار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔آپ کے اقربا اس وہم میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات کی گئی تو آپ ٹینشن میں ہونے کے سبب کوئی انتہائی قدم اٹھائیں گے۔اپنی خاطر تواضع کروانے کی اس سے بڑی اور کوئی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی مگر آپ لوگوں پر باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ آپ ٹینشن میں ہیں۔اپنے آپ کو ٹینشن میں ظاہر کرنے کے طریقہ ہائے لاتعداد ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ ڈاکٹر صاحبان لگ بھگ ہر دوسرے مریض کو ٹینشن نہ لینے کی صلاح دیتے ہیں۔کیا یہ ایک مسلمہ حقیقت نہیں ہے کہ ہر کسی ذی حس انسان پر کچھ نہ کچھ ذہنی دباؤ یا تناؤ تو ہوگا ہی تو کیا یہ ڈاکٹر صاحبان

کی ٹینشن نہ لینے کی صلاح غیر معقول نہیں ہے۔ یہ ٹینشن آخر ہے کیا؟ کہیں یہ ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کا نام تو نہیں یا پھر اپنے آپ کو عالم کہلوانے کا ذریعہ تو نہیں اور دورِ حاضر میں ٹینشن کا دور دورہ ہر سو، ہر عمل اور ہر شخص کی زندگی پر حادی ہے۔ نوزائید بچے سے لے کر اس شخص تک جس کی زندگی کی الٹی گنتی بس ختم ہونے والی ہی ہے۔ بچہ اپنے ٹینشن میں ہونے کا اعلان گلا پھاڑ کر رونے سے کرتا ہے۔ قریب المرگ انساں کو ٹینشن نہ لینے کی صلاح دے کر اُس کے جذبات کو دبایا ہی نہیں بلکہ مسلا جاتا ہے لیکن ٹینشن بدستور اُس شخص کے ذہن پر حاوی رہتا ہے۔ ٹینشن اُس کے دماغ پر چند ایک کام ادھورے رہنے کی وجہ سے ہے یا پھر جائیداد کے بٹوارے کو لے کر یا پھر اور کئی مسئلے ہوں گے جن کا نپٹارا ہونا باقی ہو۔ ایک ظاہری بات ہے، اس شخص کا ذہنی تناؤ میں ہونا واجب ہے کیونکہ وہ دماغ رکھتا ہے لیکن اس کو ٹینشن نہ لینے کی صبر آزما صلاح دی جاتی ہے۔

کسی بھی دفتر میں جایئے اور ٹینشن کی حکمرانی کا مشاہدہ کر لیجئے۔ یومیہ اُجرت پر کام کرنے والے سے لے کر بڑے افسر تک سب ٹینشن کے زیر اثر ہیں یا پھر اثر میں ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ سائل کی آمد سے دفتر میں اداسی کسی حد تک دور ہو جاتی ہے اور جب سائل کا ہاتھ جیب کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے تو دفتر والوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، چابک دستی سے کام ہونے لگتا ہے اور کچھ دیر کے لئے ٹینشن دفتر کے دروازہ پر رہتا ہے اور سائل کے دفتر سے نکلتے ہی وہ پھر دفتر کے اندر اپنی حکمرانی قائم کر لیتا ہے۔ ٹریفک عملہ سڑک پر کھڑے کھڑے منہ چھپائے اپنے ٹینشن میں ہونے کا نزلہ اکثر نوعمر لڑکوں کی بائیک پر اتارتے ہیں۔ ٹرک اور میٹاڈور والے پہلے ہی سے عملے کے ٹینشن میں ہونے سے باخبر ہوتے ہیں۔ ٹینشن انجینئروں اور ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ افسروں اور

منسٹروں کو بھی ہوتا ہے اور اس کا اظہار وہ الگ الگ ڈھنگ اور موقع ومحل دیکھ کر کرتے ہیں۔ڈاکٹر مریض کو پرائیویٹ اسپتالوں میں جراحی کرنے کے اصرار سے اپنے ٹینشن میں ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ انجینئر ٹھیکیدار سے مخصوص کمیشن کے علاوہ اور بھی کچھ حاصل کرنے کے استفسار سے اپنے ٹینشن میں ہونے کا اظہار کرتا ہے۔اعلیٰ افسر، اعلیٰ عہدوں پر فائز، بلاوجہ ٹینشن میں ہونے کا عندیہ دے کر ماتحت اور سائلوں سے اپنے لئے راحت اور آرام کا ساماں بٹانے میں کامیابی حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔منسٹر عوام کو ٹینشن کی ہوا دکھا کر ان کی ہمدردی اور ووٹ حاصل کرنے کی امید سے اپنے ٹینشن کو زبردست اور خطرناک دشمن کی صورت میں پیش کرنے سے نہیں چوکتے۔

دلہا بھی ٹینشن میں ہے اور دلہن بھی۔ دلہا بارات دلہن کے گھر جلد از جلد پہنچانے کے لئے ٹینشن میں ہے اور دلہن رخصتی ہونے کی وجہ سے ٹینشن میں ہے۔ باراتی تو دیر سے کھانا ملنے کی وجہ سے ٹینشن میں ہیں۔ٹینشن آشپاز کو بھی ہے اور مہمان کو بھی، قصاب بھی ٹینشن میں ہے اور صاحب خانہ بھی، رشتہ دار بھی ٹینشن میں ہیں اور دوست احباب بھی۔شادی کی تقریب نہ ہوئی بلکہ ٹینشن کا کنوکیشن ہوا۔تقریب کے دن کی آمد قریب ہوتے ہی ٹینشن اپنا تام جھام لے کر خانہ مخصوص کے افراد پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا ٹینشن لئے مست ہے۔مہندی رات سے ایک دن پہلے ہی ٹینشن اپنی گرفت مضبوط کرنے کے سامان جوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ شروعات تو رات بھر گانے بجانے سے ہوتی ہے۔ رات بھر چائے بنانے پر مامور لڑکیاں اور عورتیں تو ٹینشن سے چھپا چھپی کھیلنے میں ہی اپنی خیر سمجھتی ہیں۔کیونکہ اس وقت کی ذراسی چوک اگلے دو دنوں کو خراب کر سکتی ہے۔مہندی رات میں ٹینشن اپنا گھیرا کسنا شروع کر دیتا ہے۔جس کی وجہ سے کچھ ناعاقبت اندیش رشتہ دار دعوت سے

محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صبر اور استقلال کی پرکھ تو مسند نشینی کے دن، بارات کی روانگی یا دلہن کی رخصتی تک ہوتی ہے کیونکہ ٹیلنٹ کو احسن طریقہ سے بروئے کار لانا اسی وقت مقصود ہوتا ہے۔

ہم نے ٹینشن کے روبرو ہونے کی حماقت کی اور ہمیں پریشانی کے سوکچھ ہاتھ نہ آیا۔ میاں ٹینشن تو حاکم مطلق بن بیٹھے ہیں اور اونچے اونچے ایوانوں میں اپنالوہا منوا چکے ہیں۔ غریب امیر، خاکی ناری، کالے گورے، مرد عورت جب چاہیں اپنے زیر اثر لے سکتے ہیں۔ ہم نے ٹھان لی کہ ذرا ہم بھی جناب ٹینشن کو تھوڑی سی ٹینشن دیں اور لطف اندوز ہو جائیں۔ ہم نے محترمہ ٹینشن سے کہا کہ ابد تک قائم ودائم رہنے والی شئے کی کوئی خصوصیت تو تم میں نظر نہیں آتی ہے تم پھر اتنا کیوں اتراتے ہو، ہمارا تیر نشانے پر جالگا۔ ٹینشن کو ٹینشن ہونے لگی اور وہ ٹینشن کے عالم میں ہم سے التجا کرنے لگی کہ اس بات کو عام نہ کیا جائے۔ بہت ہی منت سماجت، خوش آمدی کرنے کے بعد انکساری سے کہا کہ یہ بات عام ہونے سے اس کی ساکھ کو زک پہنچنے کا احتمال ہے۔ جناب ٹینشن نے بھی حضرت انساں کی ہی طرح ٹینشن کو مراعت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ میری کہی ہوئی بات سے ٹینشن ہونے کی صورت حال کو وہ میرے تنقیدی طریقہ کار کو مثبت انداز میں پیش کرنے کے لئے استعمال میں لانے لگا۔ ٹینشن کو ٹینشن میں دیکھ کر ہمیں بھی ٹینشن ہونے لگا کیوں کہ ہم نے اس نامعقول ٹینشن کو منہ لگایا۔ کیونکہ اب ٹینشن اس کی اصلیت عام نہ کرنے کی خاطر ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہم کسی سے بھی آپ کی اصلیت نہیں کہیں گے اور تاحیات اس کو اپنے سینے میں دفن کر کے رکھیں گے۔ آپ اطمینان رکھیئے، مگر وہ کہاں ماننے والے ہیں۔ جناب ٹینشن نے اپنا ٹینشن میں ہونا اس طرح پیش کیا کہ اب میں ان کے ہاتھ پیر جوڑنے لگا کہ بس مجھے معاف کرو، میں تمہاری

اصلیت کسی پر بھی ظاہر نہیں کروں گا۔ میں ٹینشن کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں شاطرانہ چمک محسوس کرر رہا ہوں۔حد یہ کہ وہ گنگنا رہے تھی اجی ہم سے بچ کے کہاں جایئے گا۔جہاں جائے گا ہمیں پایئے گا۔

☆......مشتاق احمد کینی

عدالت کا دروازہ

واہ! کیا زمانہ تھا جب فریادی بادشاہ کے محل کی گھنٹی بجاتا اور بادشاہ بنفس نفیس چل کر فریادی کے پاس آتا اور اس کے مسئلے کا تدارک آن کی آن میں کرتا۔ یہ کون سی بات ہوئی کہ آپ نے کہی اور بات سنی گئی۔ مزہ تو تب ہے جب آپ کے دانت، آپ کی زبان کی حرکت سے تنگ آ کر اس کو آنکھیں دکھائیں اور تب بھی آپ کی بات سنی نہ جائے۔ اگلے وقتوں کی تو بات ہی اور تھی۔ بادشاہ بھی فرصت میں تھے اور فریادی بھی۔ آج کل نہ فریادی کو فرصت ہے اور نہ ہی فریاد سننے والے کو نہ دربار ہی ہے اور نا ہی گھنٹی۔ ہاں ایک ہتھوڑا ہے، جو صرف فلموں کے عدالتی سین میں لوگوں کو ربطہ وضبط قائم رکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا حصول انصاف کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھا جا رہا ہے روایتی اور دقیانوسی طور طریقوں کو بھی پس پشت ڈالا جانا وقت کے ساتھ ہم قدم ہونے کا ایک اہم جواز بنتا جا رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اب عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا غیر ممکن سی بات ہوگئی ہے کیونکہ دروازہ لوہے کا بنا ہوا ہے اور طرہ یہ کہ کھٹکھٹانے کی بات تو دور، ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا جائے گا۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا بھی تو آواز اندر جائے گی ہی نہیں۔ عدالت کے دروازہ کو شکایت ہے کہ پہلے اس کو عزت احترام اور امید کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عدالت کے احاطے کے اندر اور باہر اس نے سینکڑوں معاملے اور مسئلے الجھتے اور سلجھتے دیکھے ہیں۔ لوگوں کی کثیر تعداد کو

معاملہ عدالت میں ہار جانے کے بعد بھی عدالت کے دروازے سے امید کی ایک کرن نظر آتی ہے، جو حوصلہ دے کر پھر سے کارروائی کرنے کی ہمت بخشتی ہے۔ اگر کسی کے حق میں فیصلہ صادر ہوا تو دروازہ کے قریب آ کر اپنی خوشی کا اظہار کئے بغیر اس کا قدم باہر رکھنا ایک غیر معمولی بات ہوتی۔ شاید ہی کوئی انسان ہو جس کا واسطہ عدالت کے دروازہ سے نہ پڑا ہو، خواہ زمین کے کاغذات بنوانے ہوں، نوکری کے لئے عرضی دینی ہو، بچے کی تاریخ پیدائیش کا مسئلہ ہو، کسی کی موت کی سند حاصل کرنا ہو، بجلی کا ٹینشن ہو یا پانی کا، آپ کو عدالت کے دروازہ کے پاس آنا ہی آنا ہے۔ اندر آتے لوگوں کے تذبذب اور انتشار سے بھرے چہرے اور باہر جاتے ہوئے لوگوں کے قدرے کم پریشان چہروں کی کیفیت کا اندازہ صرف عدالت کا دروازہ ہی لگا سکتا ہے۔ عدالت کے دروازہ کو ایک زمانے میں جنت کے دروازہ سے تعبیر کیا جاتا تھا کیونکہ سادہ لوح انسان کے خیال میں عدالت انصاف کا گھر تھا اور وہاں کسی پر بھی ظلم نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ عدالت کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ مانا جاتا تھا۔ شاید اب بھی یہ بات انسان کے دل اور ذہن کے لاشعور میں بسی ہے کہ وہاں کسی پر بھی ظلم ہونے نہیں دیا جاتا۔ وہ عدالت کے آہنی دروازہ کو ناانصافی یا ظلم ہونے پر کھٹکھٹانے آتے ہیں اور باشعور اس کھٹکھٹانے کا پھل پاتا ہے۔

عصر حاضر میں اگر آپ کو کسی بھی دفتر میں کوئی کام کروانا مطلوب ہو تو آپ کے لئے یہ بہتر ہے کہ آپ پہلے عدالت کے راستے کو اچھی طرح دیکھ بھال لیں کیونکہ آپ کا کام یا آپ کے حقوق کا تحفظ دفتر میں ہونا ناممکن ہے۔ جب تک نہ آپ عدالت سے ایک حکم نامہ لائیں کہ آپ کا کام کیا جائے! آپ کو بجلی کا کنکشن چاہئے آپ کو مکان بنوانا ہو، آپ کے موبائیل کی بل کی ادائیگی کا معاملہ ہو، آپ کے بچے کا سکول میں داخلہ کروانا ہو یہاں تک کہ سبزی بیچنے والے کو بھی عدالتی احکام درکار ہیں

کہ وہ آپ کو سبزی بیچے۔ آخر اس عدالتی حکم نامہ کی ضرورت کیوں آن پڑتی ہے..؟ شاید اس لئے کہ افسر نا قابل ہیں اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کی واقفیت نہیں رکھتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہوئے سائل پر اپنا دبدبا قائم رکھتے ہوئے کام سے جی چرا لیتے ہیں۔ بسا اوقات افسر اپنے اختیارات کو تجاوز کر کے احکام صادر کرتے ہیں، ان احکام کو کالعدم کرانے کے لئے بھی عدالتی حکم نامہ درکار ہوتا ہے۔ ایک اور خاص وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جہاں سادہ طبیعت انساں کا واسطہ کسی دفتر سے پڑتا ہے اور وہ سادہ پن کی وجہ سے کام کرنے کیلئے رشوت کی رقم نہیں دیتا تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آپ نے کام نپٹارے کیلئے رشوت نہیں دی اور آپ کو رشوت کی رقم سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کر کے متعلقہ افسر کو آپ کا کام کرنے کے لئے عدالت سے حکم نامہ لانا پڑتا ہے۔ اگر کسی لڑائی جھگڑے میں آپ کی پٹائی ہوئی اور آپ مضروب ہو گئے تو آپ کو حصول انصاف کے لئے ایک بہت بڑے مسئلے سے نبرد آزما ہونا ہوگا کہ آپ کی رپورٹ کس تھانے میں درج ہو۔ آپ کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا جائے گا کہ جائے وقوع ان کے حد اختیار سے باہر ہے۔ اگر آپ پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ فریاد کس تھانے میں درج ہو سکتی ہے، آپ یہ دیکھ کر سے ششدر رہ جائیں گے کہ تھانے میں تعینات عملے کے پاس آپ کے سوال کا جواب دینے کے لئے وقت ہی نہیں ہے اور آپ کو عدالت کا راستہ ڈھونڈنا پڑے گا، عدالت ہی طے کرے گی کہ آپ کا محلّہ کس تھانے کے حد اختیار میں آتا ہے اور آپ کو اپنی فریاد درج کروانے کے لئے بھی ایک حکم نامہ لانا پڑے گا تا کہ آپ کی فریاد درج ہو۔ مجال ہے کہ کسی عدالتی سمن یا وارنٹ کی عمل آوری اضافی عدالتی حکم نامہ کے بغیر ہو۔

تاریخ پر تاریخ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آبادی کا تناسب بڑھنے سے عدالتوں کا کام بھی کافی حد تک بڑھ گیا ہے۔ بوجھ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ہزاروں

فائلیں لا پتہ کے کھاتے میں ہیں۔ بہت سارے مقدمے ایسے بھی ہیں جن میں مدعی اور مدعلیہ کی تین پیڑھیاں قبروں میں مدفون ہیں۔شاید ہمارے پیروں اور بزرگوں کی دعا سے ہی عدالتوں میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور یہ ادارہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ عدالت کا دروازہ لوگوں کی کثیر تعداد کی آواجاہی سے ناخوش نہیں بلکہ ان لوگوں کے عدالت میں آنے پر نالاں ہے جن کا کام افسروں کے حد اختیار میں ہوتے ہوئے بھی عدالت سے حکم نامہ لانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا روپیہ پیسہ بھی جاتا ہے، ذہنی تناؤ الگ۔ عدالت کا دروازہ عدلیہ سے ملتمس ہے کہ ان افسروں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرئے جو بنا کسی جواز کے عوام کو عدالت کا رخ کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنے اختیار میں کام کا نپٹارا ہوتے ہوئے بھی نہ کرنے والے افسروں کے خلاف جرمانے کی ایسی سزا ہونی چاہئے کہ افسر کسی بھی سائل کو عدالت کا رخ کروانے سے پہلے دس بار سوچنے پر مجبور ہو......اس کے لئے شاید کسی حکم نامہ کی ضرورت نہیں......!

☆......شاہنواز ٹینگ

وادی

ابن بطوطہ اور رابنسن کروسو نے فیصلہ کیا کہ وہ سمندروں اور صحراؤں کی خاک چھاننے کی بجائے اب اپنی توجہ پہاڑوں کے سلسلوں کی طرف مبذول کریں گے۔ان سلسلوں میں کیا عجب کہ ایسی مخلوق ملے جولِلّی پت کے Opposite دراز قد ہو یا پھر انسانوں کے بھیس میں حیوان اور چرندوں کے بھیس میں درندے رہتے ہوں۔ وہ اسی خیال میں آگے بڑھتے رہے۔ایک تنگ سی وادی کے دہانے پر وہ رک گئے۔اپنے اپنے Tiffin کھولے اور کھانا کھایا۔دہانے پر ہی موجود ایک چھلکتے چشمہ سے انہوں نے پانی پیا اور اللہ کا شکرادا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ چلتے چلتے اچانک وہ مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔منظر ہی دلکش تھا۔ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں ان کے سامنے ایک شاداب،معطر،منور اور سرسبز وادی تھی۔وادی کا حسن دیکھ کر انہیں لگا کہ شاید جنت کا کوئی ٹکڑا زمین پر اتر آیا ہے۔بل کھاتی ندیاں،سکوت پر فدا ہونے والی خاموش جھیلیں، جھلملاتے اور رم جھم کرتے چشمے، جنت کے پیڑ،طوبیٰ جیسے دیودار صنوبر، کائیل اور دیگر اقسام کے درخت۔جنت کے طور پوشہ نول، کوئل، ہدہد، بلبل، کستور وغیرہ کی وجدانی چہک سے راگ ملہار اور دیپک راگ کے ترانے بکھیرتے ہوئے سیب، آڑو، گلاس، ناشپاتی، ناکھ اور دیگر رس بھرے پھلوں سے اٹے درخت۔

قدرت کی فیاضی اور فضل سے مالا مال اس سنہری وادی کو دیکھ کر ابن بطوطہ اور رابنسن کروسو دونوں اچنبے میں پڑ گئے۔یہ وادی ابن بطوطہ کے شنگریلا اور رابنسن

کروسو کے للّی پت سے زیادہ پُر اسرار تھی۔ وادی کی فضاؤں میں چاروں طرف مینار اورشوالوں سے مقدس اسم خاص، بانسری، شنکھ اور گھنٹی کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ یہ روحانی فضا دیکھ کر دونوں ٹراولر مخمور ہو گئے۔ اچانک ان کا سامنا اس بستی کے پہلے باشندہ سے ہوا۔ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اچھے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ بار بار وہ مقدس نام لے رہا تھا اور نام لے کر عقیدت سے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی کے بائیں طرف عین دل کے مقام پر رکھتا تھا۔ اس نے انتہائی ادب سے ان دونوں کو سلام کیا اور ان کا حال چال پوچھنے لگا۔ وہ اخلاقیات کا سر بسر ایک پیکر جاودانی نظر آ رہا تھا۔ اس کی اخلاقیات سے دونوں ٹراولر متاثر ہوئے اور اسے اپنا گائیڈ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں خوش تھے کہ روحانیت سے لبریز اس بستی میں انہیں ایک خدا ترس بزرگ ملا جو اَب ان کا رہبر یعنی گائیڈ ہونے جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنا ایک بیگ اس بزرگ کے حوالہ کیا اور ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ انہوں نے بزرگ سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا کہ اس کا نام کرامت بابا پیر عرف دوستہ مومہ بازی گر ہے۔ وہ دونوں اس نام کو سمجھ نہیں سکے۔ لیکن اعتماد کامل میں بس آگے بڑھتے ہی گئے۔ ایک موڑ مڑتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ جیسے کرامت بابا پیر عرف دوستہ ممہ بازی گر ان کے پیچھے نہیں آ رہا ہے! ابھی وہ چونکنے والے ہی تھے کہ ایک اور باریش بزرگ سامنے آ گئے۔ اس نے دونوں کے ساتھ مصافحہ کیا۔ بغل گیر ہو گیا۔ دونوں ٹراولرز نے اس بزرگ سے کرامت بابا پیر عرف دوستہ ممہ بازی گر کے بارے میں پوچھا تو بزرگ نے جواب دیا کہ اس خوبصورت وادی میں لگ بھگ 99 فیصد لوگ ہر صورت، ہر رنگ، ہر جسامت میں کرامت بابا پیر عرف دوستہ ممہ بازی گر ہی ہیں؟ کیا سیاسی لوگ تو کیا مذہبی ریاکار، کیا خاتون لاپرواہ تو کیا مستور بے حجاب، کیا ساسو جان تو کیا سر جی، کیا سسر جی تو کیا ہم زلف، کیا بھابھی تو کیا بھیاجی، کیا عالم صاحب تو کیا واعظ بے عمل، کیا ناصح تو کیا زاہد

خشک، کیا سرخ رنگ والے دل گیر کے جھنڈے تو کیا تاروں والے بے تار کے رنگے سیار! اس وادی کے لوگ عورتوں کے مطیع ہو چکے ہیں اور ان سے احکامات وصول کرتے ہیں۔

یہاں کی خلقت کیا عالم کیا جاہل، کیا سیاست کار تو کیا کاشت کار، کیا عورت تو کیا مرد، سب ماضی میں رہتے ہیں؟ ماضی کو ہی اوڑھنا اور ماضی کو ہی بچھونا بنا رکھا ہے اور ماضی پر ہی گفت وشنید کرتے رہتے ہیں۔ حال کا مذاق اُڑاتے اور مستقبل کا کوئی ادراک نہیں بلکہ ہر شیطانی خصلت، تکبر، خیانت، بحث وتکرار، بخیلی، بے شرمی، بے غیرتی، رشوت خوری، دھوکہ دہی، چارسوبیسی، چغل خوری، عیب جوئی، غیبت، کاہلی، حرص ولالچ، مکر وفریب، حیلہ بہانہ، بہتان، تہمت وغیرہ کا ہونا حد سے ایڈوانس ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔

یہاں عالمانِ بے عمل، سیاسی آوارہ گردوں اور Women Folk Dominating نے وقت کو پلٹ کر رکھ دیا ہے اور پیٹھ پیچھے غیبت نے وقت کے دھارے کو بھی پشت کی طرف موڑ دیا ہے۔ کسی کو کسی بات پر استقامت نہیں۔ نابرابری نے پوری خلقت کو بے حال کر دیا ہے۔ لیکن مجال ہے کہ کوئی مائی کا لال شور مچائے۔

بزرگ نے کہا کہ اس خوبصورت وادی کے لوگ مفت خوری، ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے عادی ہیں۔ مسلسل بے غیرتی نے ان سے عقل وخرد چھین لی ہے۔ اس بستی کی بیشتر آبادی کو موبائل فون نے بے کار کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی زرعی صنعتی، تجارتی حتیٰ کہ گھریلو کام کاج کرنے کیلئے دوسرے علاقوں سے ہنرمند آتے ہیں۔ انہی لوگوں کے بنائے کپڑے پہنتے، پیدا کی ہوئی اشیائے خورد ونوش استعمال کرتے حتیٰ کہ سوئی سے لے کر دوائی کی ٹکیہ تک کے لئے ان پر منحصر ہیں۔ ہر کسی کی تقریر سننے جاتے ہیں۔! رحمان کے ساتھ بھی ہیں، ابلیس کے ساتھ بھی! اور پھر نہ ہی ابلیس کے

ساتھ ہیں اور نہ ہی رحمان کے ساتھ!

ابن بطوطہ اور رابنسن کرسو یہ حال سن کر گھبرا گئے اور پوچھنے لگے کہ پھر یہ لوگ کس کے ساتھ ہیں؟ بزرگ نے جواب دیا کہ یہ لوگ انفرادی فائدہ کے ساتھ ہیں۔ چاہے گائے سے پورا ہو یا خنزیر سے، مدعا نکل آئے بس۔ گزشتہ چھ سو برسوں سے اسی حال میں ہیں۔ اب ظلمات کو ہی نور، گناہ کو ثواب، حرام کو ہی حلال اور ناجائز کو جائز سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی زمانہ الٹی چال چل رہا ہے۔ اس بستی میں علم وعرفان کی جگہ شکم پروری نے لے لی ہے۔ بازاروں میں کتابوں کی دکانیں نہ ہونے کے برابر ہیں جبکہ قصاب، شیر گجری، ماہی فروش، فاسٹ فوڈ کی دکانیں جابجا بھی نظر آ رہی ہیں۔ اس بستی کے لوگ مذہب سننے اور کہنے کی حد تک بہت پسند کرتے ہیں۔ لیکن مذہبی ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کو بے وقوفی سمجھتے ہیں۔

ہر بات پر جھگڑا اور بحث مول لیتے ہیں۔ بحث وتکرار ان کے خون کا ایک جز بن گیا ہے۔ جبکہ حلیمی، بُردباری اور صبر و برداشت سے اس بستی کے لوگ کب کا ہاتھ دھو چکے ہیں۔ رشوت اور سفارشی کلچر نے پورے سماج کو اخلاقی طور پر دیوالیہ اور سوشل سسٹم کو فیل کر کے رکھ دیا ہے۔ راشی ڈھٹائی سے حرام کی کمائی کی نمائش کر کے پورے سماج کیلئے خود کو رول ماڈل بناتے ہیں اور سماج بھی انہیں خوشی خوشی رول ماڈل تسلیم کر کے دوسروں کے لئے بھی راہیں کھول دیتا ہے۔ حضرت علامہ کا ایک شعر ایک بار اس بستی میں گونجا تھا۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

یہ طے ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شکم کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ شکم کرب و بلا میں مبتلا کرتا ہے۔ اور اس وقت یہ پوری وادی کرب و بلا میں مبتلا ہے۔

لیکن شکم پروری کی وجہ سے یہ لوگ سمجھ نہیں پاتے کہ اللہ کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا ہے!

یہ سن کر رابنسن کر وسو اور ابن بطوطہ اپنا بچا کچھا سامان وہیں چھوڑ کر اسی دہانے کی طرف واپس بھاگے جہاں سے وہ وادی میں داخل ہو گئے تھے۔ پیچھے سے بزرگ آواز دے رہا تھا۔ ارے بھائیو! کہاں جا رہے ہو اپنا کچھا اور موزہ بھی تو پھینکتے جاؤ۔۔۔۔

☆......شاہنواز ٹینگ

بیروکریٹ

اس سرزمین رنگ وبو کو تباہی کی دہلیز پر پہنچانے میں سیاست دان کے بعد بیروکریٹ کا نمبر ہے۔ یہ کورپشن، بے راہ روی اور سازشوں کا Automated اور Digital سپائیڈر مین ہے۔ یہاں کے عوام کو درپیش بڑے بڑے مسئلوں میں بیروکریٹ کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ اس کے ذمہ سماجیات ومعاشیات کے مختلف شعبوں میں منصوبہ بندی کرنا، کابینہ سے approval لینا اور پھر عرق ریز ہوکر ان کو روبہ عمل لانا ہے۔ بقول اقبالؔ

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادھے، بھولے بھالے ہیں

لیکن بیروکریٹ کے منصب پر بیٹھ کر یہ اپنی ذات اور احباب واقارب کی خوش حالی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ یہ اپنے ٹیبل پر موجود فائل کو شاہین کی نظر سے نہیں بلکہ کرگس کی نظر سے دیکھتا اور یقینی بناتا ہے کہ ہر فائل کو ذاتی مفاد میں Manipulate کیسے کیا جائے۔ اس چکر میں فائل کو نوٹا نوٹی کے بھنوروں میں غرق کر دیتا ہے کہ جس میں سے اگر فائل واپس ابھر آئی تو بھی برس دو برس تو لگ ہی جاتے ہیں۔ File کو OK کرنے میں ہزاروں پہاڑ جیسے جواز موجود ہیں لیکن اُن کی طرف بیروکریٹ کی کم ہی نظر پڑتی ہے اور وہ کوئی بہانہ بنا کر فائل کو فری سٹائیل سرکس کے Ring کے حوالہ کرتا ہے۔ سائل بے چارہ فائل کا پیچھا کرتے

کرتے Palpitation، Blood Pressure اور نہ جانے کن بیماریوں کا شکار ہو کر تھک ہار کر فائل کا Persue کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر بیروکریٹ کا سیکشنل افسر سائل کو دلاسا دیتا ہے، ہوٹل میں سائل کے پیسوں سے منگائی گئی چائے کی چسکیاں اور کباب تناول کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے، خلوصِ دل سے، تہہِ دل سے، نیک نیتی سے سائل کو صاحب کے گھر میں ملنے کی صلاح دیتا ہے۔ پھر ڈبوں میں نہ جانے کیا کیا لے کر سائل، صاحب کے گھر میں اس کے ساتھ ملاقات کرتا ہے۔ دوسری صبح صاحب پہلے سائل کی File منگواتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے تب تک فائل گم نہ ہوئی ہو تو فائل صاحب کے سامنے پیش کر کے اس پر صاحب اپنے نازک ہاتھوں سے OK کے دو لفظ لکھ کر سائل کی دنیا اور اپنی عاقبت اجاڑ دیتا ہے۔ دفتر میں فائل کا ملنا اور پھر وقت پر اس کا Disposal ہونا اب بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اصل Disposal تو سیکشنل افسر کے ذمہ ہے اور صاحب تک پہنچتے پہنچتے یہ مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ بیروکریٹ کو فائل وزیر سے بھی OK کرانی ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ وزیر کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ سنا ہے کہ ایک وزیر ایسے ہی کسی بیروکریٹ کی پھینکی ہوئی دھول کا شکار ہو گیا۔ اور اس فائل پر اپنے دستخط ثبت کئے جس کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ بیروکریٹ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کا کارندہ کم اور تاج برطانیہ کی انڈین سول سروس کا حاکم زیادہ لگتا ہے۔ بہترین کپڑے زیب تن کرتا، بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتا، انٹرنیٹ کے پر طرح طرح کے نظارہ دیکھتا ہے۔ لیکن جس کام کے لئے مقرر کیا گیا تھا، وہ کام ہر گز نہیں کرتا ہے۔ دفتر میں بیٹھ کر گھریلو Business کرتا ہے۔ گاڑی بچوں کو سکول، بیگم صاحبہ کو مائکے لانے لے جانے کیلئے استعمال کرتا ہے اور سرکاری مقاصد کے لئے مہیا کئے گئے Mobile پر دوستوں سے Chat کرتا ہے۔

بیروکریٹ بھی قوم کے غم میں بیرونی ملک کے دورے کرتا ہے۔ Study ٹور پر جاتا اور ٹریننگ کرتا ہے۔ واپس جب آتا ہے تو اپنے اقارب کے لئے تحفہ تحائف لاتا اور دماغ کو پوری طرح Wash کر کے آتا ہے۔ آج تک جتنے بھی دورے بیروکریٹوں نے کئے ان کا استفادہ کسی شعبہ میں ہوا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے اس کا کوئی بھی Information قوم کو نہیں دیا گیا۔ اگر فائل چوہا ہے تو بیروکریٹ بلی ہے اور یہ فائل کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ جس فائل کو ٹالنا ہو اس پر Please discuss لکھ کر معاملہ ٹرخا دیتا ہے اور جس فائل کو زندہ دفن کرنے کا ارادہ ہو اسے کمیٹی کے حوالہ کرتا ہے۔ یہ مہاشے نفسیاتی شطرنج کھیلنے کا قدرتی ماہر ہوتا ہے۔ وزیر اور سائل دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اس کی پرانی عادت ہے۔ بیروکریٹ کے شوق میں شراب، شباب، کباب، رباب، حجاب وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس شوق کو پورا کرنے کیلئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا اور چالیں چلتا ہے۔

بیروکریٹ کا ایک اور کام اپنے محکمہ کے منتری کو خوش رکھنا، اس کی پبلسٹی کرنا اور اس کی تقریر لکھنا بھی ہے۔ وزیر جب اچانک خوش رہنے لگتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ یا الٰہی میں تو جنم جنم کا دکھیا راہوں، پاپی پیٹ کے واسطے وزیر بنا ہوں، میں کبھی خوش ہی نہیں رہا کرتا تھا یہ اچانک میں خوش کیوں رہنے لگا ہوں؟ لیکن اس بیچارے کو معلوم ہی نہیں کہ یہ سب کارستانی بیروکریٹ کی ہے اور وزیر کو خوش رکھنے کے ہزاروں طریقے جانتا ہے۔ وزیر جب کسی اجتماع میں بیروکریٹ کی تقریر رک رک کر پڑھنے لگتا ہے تو وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے کہ بارخدایا! میں نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہیں ہے جو میرے بیروکریٹ نے لکھا ہے نہ بولنا ہی تھا اور نہ کرنا ہی ہے۔ تعجب کے عالم میں جب وہ سامعین کی تالیوں کی آواز سنتا ہے تو خوش ہو کر

بیوروکریٹ کی لکھی تقریر پڑھنا جاری رکھتا ہے۔

کچھ بیوروکریٹ زاہدِ خشک ہوتے ہیں۔ وہ شراب و کباب و شباب سے دور رہتے ہیں البتہ انہیں لکشمی سے محبت ہوتی ہے۔ وہ ریاست کیلئے پلاننگ کرتے کرتے بھاری مقدار میں لکشمی جمع کرتا ہے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اچانک Shopping Plaza کھڑا کرتا ہے۔ اپنے قرابت داروں کو چور دروازہ KAS کے راج محل میں داخل کرتا ہے اور اس کے لئے پھدک پھدک کر قرابت دار کو چلنے کی ہدایت کرتا ہے اور ایک دن اس کا نابکار قرابت دار پھدکتے پھدکتے IAS کے ہستناپور میں داخل ہو کر اپنے پیش رو محسن کے نقش قدم پر چل کر اپنا نام روشن کرتا ہے اور وطن عزیز کو اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ ریٹائرڈ بیوروکریٹ کسی بڑی سیاسی جماعت میں شامل ہو کر محاسبہ سے صاف بچ نکلتا ہے۔ یہ رشوت کے پیسے کو ہاتھ لگانا پاپ سمجھتا ہے۔ لہٰذا روپے پیسے کمرے میں بچھے مصلے کے نیچے رکھتا ہے پھر PA پلاسٹک کے دستانے پہن کر وہ روپے بیوروکریٹ کی جیب میں رکھتا ہے۔ جسے گھر پہنچ کر بیوروکریٹ کی بیگم صاحبہ بھی پلاسٹک کے دستانے پہن کر باہر نکالتی ہے۔ کیونکہ PA صاحب کی طرح وہ بھی حرام کی کمائی کو ہاتھ لگانا مہاپاپ سمجھتی ہے۔ اس کے بعد کچھ روپے نذر و نیاز میں استعمال ہوتے ہیں، کچھ اپنے نام بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دیتی ہے۔

یوں تینوں رند کے رند بھی رہتے ہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہیں جاتی۔ بیوروکریٹ دل میں تو دوسرے بیوروکریٹ کا دشمن نمبر one ہوتا ہے۔ لیکن باہر سے دوستی اور وفا کی قسمیں کھاتا ہے۔ اندر ہی اندر دوسرے بیوروکریٹ کی ٹانگیں کھینچنے میں مشغول رہتا ہے لیکن ظاہر میں اس کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ بیوروکریٹ عید پر عیدگاہ یا مسجد میں کم لیکن وزیر یا ساتھی بیوروکریٹ کے گھر میں زیادہ نظر آتا ہے۔ بیوروکریٹ

کے اس مکر جال یعنی Web کو کاٹنے کی شیر شاہ سوری نے یہ تدبیر کی تھی کہ ان کو پرائیویٹ پارٹیوں میں ملنے اور آپسی رشتے کرنے سے منع کیا تھا۔

لیکن آج کا شیر شاہ سوری بادشاہت کے رموز سے ناواقف ہے۔ کیونکہ بادشاہت کے حصول کے لئے اسے کسی کورکھشیتر، کالنگا، پانی پت کے میدان میں اترنا ہی نہیں پڑتا۔ اسے یہ بادشاہت جدید دور کے مغل اعظم اکبر نے بطور جاگیر عطا کی ہے۔ ووٹر بے چارہ آج کے بادشاہ بیروکریٹ کے Web میں قید ہے جسے کاٹنے کے لئے شمشیرِ سلیمانی کی ضرورت ہے مگر افسوس کہ وہ اب ناپید ہے۔

☆......شاہنواز ٹینگ

موسم

وادی زلزلہ کے لحاظ سے Red Zone میں واقع ہے اور کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہنگامی حالات کے دوران عوام کو کیا کرنا چاہئے اس کی جانکاری دینے کے لئے ایک سیمینار منعقد ہوا اور کچھ تقریریں جھاڑی گئیں اور بس ختم فسانہ ہو گیا۔

اب کون سمجھائے کہ نہ صرف ارضیاتی بلکہ جذباتی سیاسی اور اخلاقی زلزلوں کے لحاظ سے بھی یہ خطہ Red Zone ہی میں واقع ہے۔ جب سے مہاراجہ ہری سنگھ راج سنگھاسن چھوڑ کر گئے تب سے ہر دو تین مہینوں میں اس خطہ میں ایک نیا سیاسی زلزلہ آتا ہے۔ حیرت کی بات البتہ یہ ہے کہ اس کے ملبہ تلے صرف عوام دبتے ہیں۔ جاپان زلزلوں کی سرزمین ہے اور سال بھر زلزلے آتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ اب ان کے عادی ہو گئے ہیں اور Adaptibility کے اصول کے تحت مکانوں کی تعمیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ زلزلہ آئیں بھی تو ان کا کچھ نہ بگڑے۔ شاید اپنے یہاں کے سیاست داں بھی جاپان کے عوام کی طرح زلزلہ Proof ہو کر اب زلزلوں سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ ہاں تھوڑا سا گرد وغبار ان پر ضرور گرتا ہے۔ لیکن کپڑے جھاڑ کر وہ پھر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقتدار و شہرت کے ایک نئے Life Cycle کا لطف اٹھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ زلزلوں کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ جب ایک سیاست گر کے مفاد کی پلیٹ اور دوسرے سیاست گر کے مفاد کی پلیٹ سے ٹکراتی ہے تو

سیاسی زلزلہ آجاتا ہے اور اس کی لہریں چہار اطراف پھیل کر پوری سیاست گاہ کو GroundZero بناتی ہیں۔ انہی زلزلوں سے اخلاقی، معاشی اور سماجی زلزلہ آتے ہیں اور اس وقت یہ خطہ ہر طرح کے زلزلوں کی لپیٹ میں ہے۔ یہاں سمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن ہم اخلاقی زلزلوں کو بالکل بھلا بیٹھے ہیں اور ان کا ملبہ اٹھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ معاشی لحاظ سے سیاست گر مضبوط عمارت اور تگڑے بینک بیلنس کا مالک ہے، لہٰذا اس پر معاشی زلزلوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن عوام بیچارے معاشی زلزلہ کے ملبہ تلے دبے ہوئے ہیں اور کچھ اطلاعات کے مطابق اب ایک طبقہ ایسا بھی ابھر آیا ہے جو گداگری پر گزر اوقات کر لیتا ہے۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سیاست گر ووٹ کا گداگر ہے اور عوام سے ووٹ اولی کی خیرات مانگتا رہتا ہے۔ عوام بڑی کشادہ دلی سے ہر دو چیزوں سے گداگر کا کشکول لبالب بھر دیتے ہیں اور بدلہ میں سیاست گر عوام کو معاشی گداگری میں لگا دیتا ہے۔ سیم وزر کے جملہ حقوق اس کے کنبہ کے نام مخصوص ہیں اور عوام کے معاشی کشکول میں صرف وعدوں کے کھوٹے سکے ڈالے جاتے ہیں۔ ان سکوں کی بازار میں البتہ کوئی وقعت نہیں ہے اور دکاندار انہیں شاہ دقیانوس کے سکے قرار دے کر عوضانہ میں کچھ بھی مال دینے کو تیار نہیں۔

سیاست گری نے اس خطہ میں ایک اور طبقہ کو جنم دیا ہے جو پیشہ ور سامعین کا طبقہ ہے۔ اس طبقہ کا پیشہ تقریر باز سیاست گر کی تقریر سننا اور پھر زور زور سے تالی بجانا ہے۔ اس طبقہ کے بارے میں سنا ہے کہ گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ ٹھیکہ دار مقرر ہیں۔ سیاست گر کے پیٹ میں جب بھی تقریر کرنے کا مروڑ اٹھے، تالیوں سے استقبال کرانے کا نشہ ہو جائے یا پھر گرد و نواح کی حمایتی کھوپڑیوں کی تعداد کا مظاہرہ دکھانے کا شوق ہو جائے تو وہ بہ حساب تین صد روپیہ اصل زر کے حساب سے ٹھیکہ دار کو

Payment کرتا ہے۔ٹھیکہ دار اپنا کمیشن کاٹ کے کھوپڑیوں کو بحساب دوصد روپے فی کھوپڑیPayment کرتا ہےاور پھر کھوپڑیوں کوٹن کے حساب سے ٹرک لاری میں ٹھونس کر جلسہ گاہ کی طرف ہانکتا ہے۔جلسہ گاہ پہنچ کر''کھوپڑی'' آنکھ بند کئے سیاست گر کی نئی لن ترانی غور سے سننے کا ناٹک رچا کر اونگھ کی وادی کی یاترا پر نکل پڑتی ہے۔سیاست گر یہ جانتے ہوئے کہ''کھوپڑی''اس کی پرستار نہیں بلکہ پاپی پیٹ سے مجبور ہو کر لن ترانی سننے کا ڈھونگ رچانے آئی ہے،سیاست گر اس المناک حقیقت سے بے بہرہ اپنی روایتی تقریر جاری رکھتا ہے۔ یہ تقریر بھی Original نہیں بلکہ Ghost Writer کی لکھی ہوئی ہے۔سیاست دان بیچارہ تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے Script کی Reading شروع کرتا ہے۔ ہر دس منٹ کے بعد Writer نے تالیاں بجانے کی گنجائش رکھی ہے۔بیچاری''کھوپڑی'' کی اونگھ اس وقت ٹوٹ جاتی ہے جب جلسہ گاہ میں موجود ٹھیکہ دار کے ایجنٹ اسے کہنی سے ٹھونکا مار کر اشارہ کرتے ہیں کہ جمورے تالی بجانے کا موقع ہے،بجا تالی۔''کھوپڑی'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے زور زور سے تالی بجاتی اور پھر اونگھ کی دنیا میں واپس لڑھک جاتی ہے۔سیاست گر تب تک اپنی انگلی سکرپٹ کی سطر پر رکھتا ہے جب تک کہ تالیوں کا Break پورا نہیں ہوتا۔تالی بجنے کے بعد آگے Reading شروع کرتا ہے۔''کھوپڑی'' کو پھر ٹھونکہ لگا کر جگایا جاتا ہے کہ پھر تالی بجانے کا وقت آگیا ہے۔پھر تالی بجتی ہے اور پھر سیاست گر آگے سبق Read کرتا ہے۔یہاں تک کہ سیاست گر Script کا آخری لفظ ادا کرتا ہے اس دوران کیمرے کھچا کھچ تصویریں کھینچتے ہیں۔کسی خوش قسمت سیاست گر کو Live Coverage بھی ملتی ہے۔اس کے ساتھ ہی تین گھنٹہ کے Show کا The End ہو جاتا ہے۔اس بیچ ایک تازہ سیاست گر کا عوام سے تعارف کرایا جاتا ہے جو کسی دوسری سیاسی چراگاہ سے پیٹ بھر کے نئی چراہ گاہ میں چرائی کیلئے آتا ہے۔''

کھوپڑی'' کواس نئی آمد پر بھی تالی بجانے کو کہا جاتا ہے۔ پاپی پیٹ سے مجبور وہ تالی تو بجاتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کس خوشی میں تالی بجائی تھی۔ سیاست گرنے بھی تین گھنٹے کی تقریر کرڈالی لیکن وہ بھی نہیں جانتا ہے کہ Topic کیا تھا۔

سنا ہے کہ ایک بار امریکی فوجی جنرل کوریا میں کوریائی فوجیوں سے خطاب کر رہے تھے۔ انگریزی تقریر کا کوریائی ترجمہ کرنے کے لئے ایک مترجم بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ جنرل صاحب کہتے جاتے اور مترجم کوریائی زبان میں ترجمہ کرکے جنرل صاحب کی بات کو آگے گوش گزار کراتے ہیں۔ دورانِ تقریر جنرل صاحب نے تین منٹ Duration کا ایک لطیفہ سنایا کوریائی مترجم نے صرف پانچ سیکنڈ کی Duration میں اس کا ترجمہ فوجیوں کو سنایا۔ فوجی پیٹ پکڑ کر قہقہے لگانے لگے۔ ہاہا۔۔۔ ہاہاا۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔ جنرل صاحب کوریائی زبان کی وسعت پر ششدر ہوکر رہ گئے کہ تین منٹ کے مکالمہ کا صرف پانچ سیکنڈ میں ترجمہ ہو جاتا ہے۔ جب اس نے مترجم سے اس بارے میں وضاحت طلب کی تو مترجم نے جواب دیا کہ صاحب میں نے انہیں لطفیہ نہیں سنایا بلکہ حکم دیا کہ جنرل صاحب نے ایک اچھا لطیفہ سنایا ہے آپ فوراً پیٹ پکڑ کر زور زور سے قہقہے لگایئے۔

اس بستی میں سب کچھ Formality نبھانے کے لئے ہے۔ رسمِ دنیا اور دستورِ زمانہ ادا کرنے کیلئے ہے Solid کچھ بھی نہیں ہے بلکہ اگر یوں کہیں کہ یہاں کھوکھلا بھی Hollow ہی ہے تو بے جا نہ ہوگا اور جو بستی محض رسمی ہو، اس میں سیاسی اخلاقی اور سماجی زلزلہ نہ آئے اور غصہ کے آتش فشاں نہ پھٹ پڑیں تو زلزلہ علم کے ماہرین کو یقیناً حیرت ہی ہوگی۔

☆......ڈاکٹر گلزار احمد وانی

غُبّارے

دیکھا جائے تو ہر چیز غُبارے کی مانند نظر آتی ہے۔ آپ حیرت میں پڑ کر یہ نہ پوچھیں گے کہ کیسے اور کیوں کر۔ غباروں کو دھاگوں کے ساتھ باندھ کر اُڑانا تو بلاشبہ بازیچۂ اطفال ہے، مگر اگر ہم ذرا باریکی کے ساتھ اس بات پر غور کریں گے تو ہمیں صرف بچے ہی اس شغل میں مشغول نظر نہیں آئیں گے بلکہ بڑے بھی اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ بیچارے بچے، اُنہیں تو اسکول کے ہوم ورک سے شاید ہی فرصت میسّر آتی ہے۔ اب آپ یہ اعتراض کریں گے کہ ہم نے بچوں کو کھیت کھلیانوں میں، سڑکوں یا بیچ آنگن میں غبارے اُڑاتے دیکھا ہے، مگر بڑے تو کہیں بھی اس کھیل میں منہمک نظر نہیں آتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی بغور دیکھا ہوگا جب بچے رنگین غباروں میں ہوا بھرتے ہیں تو کبھی کبھار جب ہوا زیادہ بھر دی جاتی ہے تو غبارہ پھٹ جاتا ہے کیونکہ غبارے کے اندر اتنی ہوا سنبھالنے کی طاقت نہیں ہوتی ہے لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ بڑے جب غباروں میں ہوا بھرتے ہیں تو وہ پھٹتے نہیں ہیں، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آپ دفتروں، دکانوں اور سیاسی ایوانوں میں تو جال پھیلائے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ بھلے ہی یہ رشوت کے ہوں یا ناجائز منافع خوری کے، یا پھر اقتدار کی ہوس، وہ تسلی اور اطمینان محسوس نہیں کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیٹ کے غُبارے مزید پھیلتے جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آپ کو نہ جانے کتنے فرشتہ صورت اور روزہ ونماز کے پابند لوگ بھی پیٹ پھُلائے ہوئے نظر

آ ئیں گے۔ عام لوگ اُن کے غباروں میں زیادہ ہوا بھر دیتے ہیں۔ غالبًا آپ نے بھی کبھی کبھار کسی دفتر کا چکر ضرور کاٹا ہوگا اور جا کر یہ بھی بغور مُشاہدہ کیا ہوگا کہ کلرک صاحبان کس طرح اپنے اپنے رنگین غباروں کو اُڑاتے ہوئے اس مشغلہ میں مصروف ہوتے ہیں۔

اپنی صحت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے طرح طرح کی چیزوں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ صحت کے ساتھ ساتھ شکل وصورت اور ہیئت وساخت خوب سے خوب تر نظر آ سکے اور اس کے لئے مکھن، پنیر، مچھلیاں، پھل، پستے، کباب اور برگر غرض ہر الم غلم پر اپنا ہاتھ صاف کرتے ہیں، کیونکہ اس کا خرچہ زیادہ تر اسامیوں پر ہی آتا ہے جو اپنے کام کروانے کے لیے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ پیٹ جب پھول جاتے ہیں تو عام ٹرانسپورٹ گاڑیوں کی سیٹوں پر بیٹھنے کے قابل نہیں رہتے پھر ہفتے، مہینے یا سال میں کئی مہنگی گاڑیاں بھی اُن کے ہاں نظر آتی ہیں۔ عام لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ غُبارے باز لوگ ہیں انہوں نے ضرور غباروں کے ساتھ کھیلا ہوگا۔

بچے تو جبھی اس کھیل سے لُطف اُٹھا سکتے ہیں جب انہیں پیسوں کی دستیابی ہو، مگر بڑے تو بھرے بازاروں میں، ہوٹلوں میں، دکانوں کے اندر، دفتروں میں اور بس اسٹینڈوں پر اپنے غُبارے پتنگوں کی مانند اڑاتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار تو کیا ہر پل اور ہر لمحہ اس کھیل سے محظوظ ہوتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں وہ اتنے ماہر ہو چکے ہیں کہ اُن کا غبارہ کبھی پھٹتا نہیں بلکہ ہر دم پھیلتا نظر آتا ہے۔ جیسے باؔنی کا یہ شعر ؎

سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں

اس طرح کا سانس وہ بھی لیتے ہیں، جس سے نہ صرف ان کا پیٹ بلکہ ان کا

سینہ، اُن کی آنکھیں اور اُن کا قلب حرص کی ہوا سے پھول چُکا ہوتا ہے۔ جب ہم اور آپ بچوں کو غباروں کے سنگ کھیلتے دیکھ لیتے ہیں تو نظارہ بہت خوب لگتا ہے اور ہر شخص کو یہ دیکھ کر اپنا بچپن یاد آنے لگتا ہے اور بچپن سب کو عزیز ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں جب سارے اثاثے دوسرے کے نام ہو جاتے ہیں تو یہی ایک سرمایہ باقی بچتا ہے۔ جب بچے غباروں کے کھیل میں مصروف ہوکر ہوم ورک کرنا بھول جاتے ہیں تو والدین غبارہ پھوڑ کر ان کے ہاتھ میں کتاب تھما دیتے ہیں۔

لیکن ہمارے ان دفتری غبارے بازوں میں ہوا بھر کر اُنہیں پھُلانے سے فرصت تو ملے۔ اب ان کا غبارے پھوڑے بھی تو کون؟ بچوں کا غبارہ پھوڑنا یوں تو آسان ہے مگر دفتری بابوؤں کے غبارے تک ہاتھ کیسے پہنچے کیوں کہ ہر کرسی پر غبارے باز ہی بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔

☆......ڈاکٹر گلزار احمد وانی

نیند

نیند اللہ کی ودیعت کی ہوئی نعمتوں میں سے ایک ہے جو آدمی کو دو عالم کی فکر سے یکسر بے گانہ کر دیتی ہے۔ مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ دن بھر کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں یہ نعمت زیادہ تر ان کے حصے میں آتی ہے۔ جو لوگ آسودہ حال ہیں وہ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ وہ نیند کی گولیاں کھا کر بھی اس نعمت کو نہیں پا سکتے ہیں۔ امرا اور وسا اپنے نرم نرم بستروں اور فرش وفروش پر صرف لیٹ سکتے ہیں مگر ان کی آنکھیں نیند سے تہی ہوتی ہیں۔

نیند کی بھی ہنسی کی طرح کئی اقسام ہیں۔ ایک قسم یہ کہ کچھ لوگ بھری بزم میں بھی خراٹے زور زور سے لیتے ہیں اور بنا پرواہ کئے جی بھر کر سوتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اکثر کچھ نیند میں محو آرام ہوتے ہیں مگر اپنی آنکھیں اور اپنا منہ کھلے رکھتے ہیں اور اکثر ان کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ جاگے ہوئے ہیں کیونکہ انہیں مچھروں کی بھنبھناہٹ کی دھن سننے کا ذوق ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ نیند کی آغوش میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ایک آنکھ یا دونوں آنکھوں کو کھلا رکھتے ہوئے یہ تاثر دلاتے ہیں کہ ہم تو جاگے ہوئے ہیں اور اس طرح سے یہ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اچھی نیند سے بچوں کی صحت اچھی رہتی ہے۔ اسی لئے مائیں بچوں کو اچھی اچھی لوریاں سنا کر ان کی بلائیں لیتی ہیں اور ان کی ضد کے آگے بھیگی بلی

بنتی ہیں۔ پھر بھی اکثر بچے سونے سے انکار کرتے ہیں۔ اب جسے سکون میسر ہوا سے یہ نعمت عظمیٰ بھی عطا ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ نیند ہر غم سے آدمی کو نجات دیتی ہے۔ آج کل آدمی کو فکر کھائے رہتی ہے لہٰذا تمام افکار سے نجات کا بس ایک واحد ذریعہ نیند ہی ہے کیونکہ جس کی تیغ اس کی دیگ کے مصداق یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ اصل میں آسودہ حال وہی شخص ہے جسے یہ دولت لازوال حاصل ہو۔

آج کل اکثر لوگ نیند نہ آنے کی شکایت کرتے رہتے ہیں اور سکون کے ذرائع کی قلت بھی بتاتے ہیں۔ دراصل نیند کی یہ نعمت ان کے حصے میں زیادہ آتی ہے جو جسمانی طور زیادہ محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ جو لوگ بنا جسمانی محنت کئے پیسے بٹورتے ہیں ان کے لئے نیند کی گولیاں کھانا بیکار ہوتا ہے۔

نیند وہ اچھی ہے جو مناسب مقدار میں ہو۔ زیادہ دیر تک سونا انسان کو لاغر اور سست بنا دیتا ہے اور مضر صحت بھی ہے۔ کبھی کبھار لوگ کسی کی زیادہ نیند سے گھبراتے بھی ہیں۔ گھر کے افراد یہ سوچ کے اسے نہیں جگاتے ہیں کہ رات بھر درد سے کراہتے گزاری ہے اور اسے جگانا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ بعد میں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے موت نے ابدی نیند سلا دیا ہے۔

نیند بھی کیا عجیب شے ہے جو تھکے ہوئے مزدوروں کی تھکان کو رات میں بھگا دیتی ہے اور صبح دم تازہ دم ہو کر مزدور پھر سے کام کے لئے جیسے نئی ہمت لے کر نکلتے ہیں۔ یہی حال اطفال کا بھی ہے کہ بڑے لوگ ان کی نیند کی چاہ کرتے ہیں تاکہ ان کی شرارتوں سے بچ جائیں۔

اب آپ پوچھیں گے کہ ایک انسان کو نیند کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ اپنی جماعت کے کمرے میں ایک استاد کے لیکچر سے بوریت سی محسوس کرے تو اونگھ سے اس کا سفر شروع ہوجاتا ہے پھر کہیں یہ گہری نیند میں تبدیل ہو

کر خواب تک آ کر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ نیند کی پریاں جب آدمی کو سلا دیتی ہیں تو آدمی کو بدمست کر کے دو عالم سے اسے بیگانہ کر دیتی ہیں۔ آپ نے بہت بار مشاہدہ کیا ہوگا نیند جب مساجد و خانقاہوں میں سامعین کی آنکھوں کو سہلاتی ہے اور پھر ان کی قوتِ سماعت سے بھی انہیں بے بہرہ بنا دیتی ہے۔ یہ نیند بھی کیا عجیب شے ہے کہ جس میں اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کی فکر بھی نہیں رہتی ہے۔

☆......ڈاکٹر گلزار احمد وانی

پگڈنڈیوں کی سیر

شہری لوگوں کو شاید ہی پگڈنڈی کے بارے میں جانکاری ہو۔ پگڈنڈی اور گاؤں میں سے جب بھی کسی ایک کا نام لیا جاتا ہے تو دوسرے کا خیال خود بہ خود ذہن کے کینوس پر منقش ہو جاتا ہے۔ پگڈنڈی گنجان گاؤں کی آبادی سے پرے، کھیت کھلیانوں کی طرف خوبصورت نظاروں کے درمیاں سے گزرتی ہوئی ایک تنگ راہ ہوتی ہے جس پر بہ مشکل ایک آدمی بیک وقت چہل قدمی کر سکتا ہے اور دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اگر چہ پگڈنڈی بظاہر تنگ راستہ ہے مگر اس پر گاؤں کی جانب بڑھتی ہوئیں راہیں آپ کو لالہ زاروں میں خوش آمدید کہہ دیتی ہیں۔

پگڈنڈی پر گاہے گاہے ان لوگوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جن کی تصویر پہروں آپ کے ذہن و دل کے پردے پر موجود رہتی ہے۔ پگڈنڈیوں کی طرف جب سفر کیا جاتا ہے اس میں کئی جگہوں پر پیڑ پودوں کی چھاؤں اور سرسوں کے پھولوں کے نظارے دیکھے جا سکتے ہیں جس سے دل کے اندر خوشیوں کے فوارے پھوٹ بہتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں جو لہلہاتی فصلوں کے نظارے ہیں وہ فرحت و انبساط سے لبریز ہیں۔

یہ نظارہ بھی کم دیدنی نہیں ہوتا ہے جب آپ دیکھیں کہ گاؤں کی شوخ حسینائیں اپنے سر پر زعفرانی ٹوکریاں لئے توازن کے ساتھ ان پگڈنڈیوں پر سے بل کھاتی ہوئیں خراماں خراماں گنگناتی ہوئیں چلتی ہیں۔

دیکھا جائے تو پگڈنڈیاں بھلا کسی کا کیا بگاڑسکتی ہیں۔ یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ کس رفتار سے ان پر سے گزریں گے۔ پگڈنڈیوں پر اُگی ہوی سبز مخملی گھاس صبح کی سیر کا بھرپور لطف دیتی ہے۔اس وقت کا سماں خوب صورت معلوم ہوتا ہے اور وہ نرم ریشم سا سبزہ ذہن و دل کے چمن کو شاداب کر دیتا ہے۔

پگڈنڈی کے پیچ وخم سے سفر آساں نہیں رہتا اور زندگی میں کڑکتی دھوپ سے زندگی کا سفر مشکل ہوتا ہے۔ پگڈنڈی وہ تنگ راستہ ہے جو انسان کو زندگی کی راہوں پر چلنا سکھاتا ہے۔زندگی کے سفر کے خاتمے کا کسی کو علم نہیں۔ پگڈنڈی تھوڑے سفر کے بعد آپ کو بڑی راہ سے ملوا کر خود بری الذمہ ہو جاتی ہے۔

عموماً آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے راستے شہر کو جاتے ہیں، پگڈنڈی بیچاری ایسے خواب دیکھ نہیں سکتی ہے۔ بڑے راستے گاڑیوں کے دھوئیں سے کالے کلوٹے بن جاتے ہیں اور پگڈنڈی اس کے مقابلے میں سرسبز وشاداب رہتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ دولفظوں کا مرکب ہے "پگ" اور "ڈنڈی"۔راستے کی ڈنڈی میں اگر توازن نہ ہو تو آپ دائیں بائیں کھیت میں گر جائیں گے پھر سنبھلنا مشکل ہوگا،اس لئے اسے پگڈنڈی کہا جائے گا۔جیسے ترازو کی ڈنڈی کسی ایک طرف سے جھکنے سے دوسرا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔

پگڈنڈیوں پر سیر وتفریح کرنا کئی نظاروں کو دیکھنے کے مساوی ہے جیسے اگر آپ بوقت شام پگڈنڈی کے راہرو بنیں گے تو دائیں بائیں جگنوؤں کے ضیائی قافلوں سے ضرور ملاقی ہوں گے جن کی دودھیائی روشنی میں سارے کھیت نہلائے ہیں اور ساری دھرتی چاندنی کا گھیلا بدن محسوس ہوتی ہے اور گا ہے وہ مینڈکوں کی قطار اندر قطار آوازیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔یہ گاؤں کی پگڈنڈیاں بھی من کو سوطرح سے للچاتی اور لبھاتی ہیں۔

اگر آپ حقیقت میں دنیا کو بٹا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، تو دور سے ان پگڈنڈیوں کا نظارہ کر کے دیکھ لیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بل کھاتی ہوئیں اور سانپ کی طرح رینگتی ہوئیں یہ مختلف النوع پگڈنڈیاں ہاتھ کی ریکھاؤں کی طرح نظر آئیں گی جو زمین کو تکونوں، تثلیث، اور مستطیل میں بانٹے ہوئیں دکھائی دیں گی اور یہ لکیریں اپنے اپنے حصوں میں گیہوں، سرسوں، مکئی اور دالوں کی نت نئی فصلوں سے لہلہاتی اور ناچتی ہوئیں نظر آئیں گی۔

وہ نظارہ قابل دید اور قابل داد ہوتا ہے جب پگڈنڈیوں کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے اور کسان لوگ ان پر مسند نشین ہو کر اپنی ٹانگیں پانی میں ڈبوئے ہوئے ملیں گے اور مزدور لوگ بڑے ہی انداز شاہانہ میں چائے کی چسکیاں لیتے زندگی کی نیرنگیوں میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔

پگڈنڈیاں فرحت و انبساط ہی نہیں بخشتی ہیں بلکہ کبھی کبھار جھگڑوں کا موجب بھی بنتی ہیں۔ جب ایک کسان دوسرے پر الزام لگا کر جھگڑنے لگے کہ اس خودغرض نے میری پگڈنڈی کو ناجائز طریقے سے اکھاڑ کر اپنی زمین میں ملا دیا ہے۔ پگڈنڈیاں زمیں کی سرحدی لائنیں ہیں، ان کے ساتھ چھیڑ خوانی کرنا پانی پت کی جنگ کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔